

مٹی کی مونالیزا

اے حمید

TICKETS

NEW DRAMA BILLS

ترتیب

یروشلم، یروشلم،

واہگہ بارڈر پر میں بھارتی کسٹم چوکی کے برآمدے میں کھڑا تھا۔

میرے سامنے آدھیڑ عمر کے ایک سردار صاحب عینک چڑھائے، میز پر بہت سے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے اور پاکستان سے بھارت جانے والوں کے ویزے درج کر رہے تھے۔ میرے پاس صرف ایک مختصر سا سوٹ کیس تھا جسے میں نے دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ برآمدے کے اندر اور باہر وہی چہرے، وہی صورتیں منڈلا رہی تھیں، جنھیں میں نے پاکستان کی کسٹم چوکی پر دیکھا تھا۔ سردار صاحب جس شخص کو آواز دیتے وہ فوراً سامنے آ کر یوں سہما سہما سا اور بدحواس ہو کر کھڑا ہو جاتا گویا وہ عرصۂ محشر میں ہو اور اس کا حساب کتاب لیا جا رہا ہو۔ پاکستانی مجاہدوں نے بھارتی سرحد میں داخل ہوتے ہی کیلوں کی ایک دکان پر حملہ کر دیا تھا اور دھڑا دھڑ کیلوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ پھل والا لالہ بڑی گرمجوشی سے کیلے تقسیم کر رہا تھا۔

"کھاؤ ماراج! ایک آنے میں --- پیسے ہندوستانی دیں یا پاکستانی۔"

لوگ اُسے ہندوستانی کرنسی بھی دے رہے تھے اور پاکستانی بھی --- ایک بیگم صاحبہ نے اپنے آدھی درجن بچوں کو دو درجن کیلے لے دیئے اور پہلا کیلا خود چھیل کر دیکھتے دیکھتے نگل گئیں۔ میرے قریب ہی بنچ پر دو برقعہ پوش عورتیں مع اپنے اہل و عیال کے بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت میرے ایک کلاس فیلو کی بیوی تھی اور دوسری ایک گوالیاری بیرے کی۔ میرے کلاس فیلو نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ یا شاید پہچان لیا اور مجھے بلاتے ہوئے ندامت محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے کہ عیال داری میں پھنس کر اس کی حالت پہلے سے خراب ہو گئی تھی۔ گوالیاری بیرے کی بیوی کا رنگ گہرا سانولا تھا اور جالی دار سیاہ نقاب میں سے موٹی موٹی شربتی آنکھیں، صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی گندے عطار کی پرانی بوتل میں شربت صندل جھانک رہا تھا۔ اُنگلیاں بھدی تھیں اور نیلی رگیں جا بجا اُبھری ہوئی تھیں۔ پان چباتے ہوئے وہ بار بار تھرک رہی تھی اور میں ہر بار اُس کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے دیکھ رہا تھا۔ مجھے بے اختیار انتظار حسین

کے محاورے یاد آ گئے اور ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مرا ہوا بوڑھا محاورہ جامن کے درخت پر اُلٹا لٹک رہا ہے۔ جامن کی اس گٹھلی کا خاوند ساتھ ہی سامان پر بیٹھا پان کی پیک سے فرش پر گوالیاری آرٹ میں گل کاریاں کر رہا تھا۔ اتنے میں سردار صاحب نے آواز دی۔ گوالیاری فوراً اُٹھ کر میز کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا ناؤں ہے جی تمھارا؟"

"جی سرافت علی والد ہاسم علی"

"کہاں جاناں ہے؟"

"جی گوالیر۔"

"ساتھ کون کون ہے؟"

"جی بال بچے ہیں۔"

"کہاں ہیں۔؟"

"ساتھ ہی ہیں۔"

سردار صاحب جھلا کر بولے

"اوئے میں پوچھتا ہوں، کتھے ہیں؟"

گوالیاری گھبرا گیا۔ اُس نے فوراً اپنی پرانی شربتی آنکھوں والی بیوی اور کالے کلوٹے معصوم صورت بچوں کو پیش کر دیا۔ سردار صاحب نے عینک کے پیچھے سے پوری آنکھیں کھول کر بال بچوں کو دیکھا اور گوالیاری محاورے سے اُس کا نام پوچھا۔

"جی سریفن بی بی۔"

درخت پر سے دو تین موٹے موٹے جامن دھپ سے زمین پر گر پڑے۔ سردار صاحب نے کوئی جامن نہ اُٹھایا اور لکھتے چلے گئے۔ پھر بولے۔

"پتہ لکھواؤ جی۔"

گوالیاری بیرا فوراً بولا۔

"پاس کبیر خاں پٹے باز، بالاجی کا لکڑخانہ، انگلس صاحب کی گوٹھ خاص سہر---"

"بس کرو بھاجی! کاغذ مک گیا ہے۔"

گوالیاری اپنے لال لال دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ سردار صاحب بھی ہنس پڑے----

انھیں ہنستا دیکھ کر پاس کھڑے سب لوگ ہنسنے لگے۔ کیونکہ سب لوگ سردار صاحب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یقین ہے اگر اس وقت سردار صاحب رونا شروع کر دیتے تو ہر آدمی ان کے ساتھ رونے لگتا۔ میں بھی سردار صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ کیونکہ ابھی میرا ویزا بھی جمع ہونا تھا۔ بیگم صاحبہ برابر ہری چھیل کے کیلے کھائے جا رہی تھیں۔ چنانچہ جب انھیں آواز پڑی تو انھوں نے سب سے پہلے منہ میں ٹھنسا ہوا کیلا نگلا اور پھر اپنا نام بتایا۔ اب میرے کلاس فیلو کو پکارا گیا۔ وہ جلدی سے چار چھوٹی چھوٹی بچیوں کو لے کر سامنے حاضر ہو گیا۔ اب میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کا رنگ کالا پڑ گیا تھا اور چہرے کی کرخت لکیروں میں درشتگی پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی ہم دونوں امرت سر کے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ان دنوں اس کا رنگ گلاب کے پھول کی طرف شگفتہ ہوتا تھا اور گالوں پر ایک لکیر بھی نہ تھی۔ ایک بھی بیٹی نہ تھی۔ وہ بڑا شرارتی اور بے فکرا تھا اور ہر اُستاد کو تنگ کیا کرتا تھا اور جب ہنستا تو گالوں پر سُرخی چمکنے لگتی تھی۔ مگر اب یہ سُرخی اُڑ چکی تھی، رنگ کالا پڑ گیا تھا، آنکھوں تلے حلقے نمودار ہو گئے تھے، چہرے پر گزرے ہوئے غموں کی پژمردگی اور آنے والی مصیبتوں کی سراسیمگی لئے وہ اپنی چار عدد بچیوں کو لئے واہگہ کسٹم چوکی پر سردار صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر جب وہ سامان چیک کروانے چلا تو میں نے دیکھا، پانچواں بچہ اس کی بیوی کے پیٹ میں تھا۔

چیکنگ کا مرحلہ سب سے بڑھ کر صبر آزما ثابت ہوا۔ ایک ایک شے کو ٹھونک بجا کر، چیر پھاڑ کر دیکھا گیا۔ ایک ہندوستانی پنواڑی نے بہت سے پراٹھے باندھ رکھے تھے۔ کسٹم والوں کو شک ہوا۔ انھوں نے ایک پراٹھا پھاڑ ڈالا اور جب اُس میں سے سونے کی ڈلیاں برآمد ہوئیں تو مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ اگر ذرے کا جگر چیریں تو لہو خورشید کا کیسے ٹپک سکتا ہے۔ گوالیار، میرٹھ، دلی اور اسی قسم کے دوسرے شہروں کے رہنے والوں نے چاروں طرف میلے کچیلے گندے بستروں چیتھڑا نما لحافوں، گھسے پٹے صندوقوں، کنستروں، پوٹلیوں اور بڑے بڑے گٹھڑوں کے وہ انبار لگا رکھے تھے کہ کسٹم والوں کو نانی یاد آ رہی تھی۔ رَس پر وہ کچھ اس بے دردی سے ہندوستانی زبان میں ملٹی پھیر رہے تھے کہ اس کی زد سے بچ نکلنا محال تھا۔ یہاں بھی میں نے گوالیار کی بامحاورہ خاتون کو دیکھا کہ جالی دار نقاب میں سے لوگوں کو ٹکر ٹکر تک رہی ہے اور اس کا خاوند میز پر بستر بچھائے پرانے کھیس اور میل

بھری دریاں اور پھولے ہوئے سرہانے چیک کروا رہا تھا۔ کچھ لاہوری شلوار پوش پمپ شو پہنے اور سونے کے بٹن لگائے ذرا فکر مند سے کھڑے تھے۔ اب اُن کی باری تھی۔ کسٹم والوں نے ان کی ایک ایک چیز کو بار بار چیک کیا۔ یہاں تک کہ جوتوں کی ایڑیاں تک کھول دی گئیں۔ یہاں وہ سارا وقت خرگوش کی طرح سہمے رہے، لیکن جونہی کسٹم سے رہائی ملی اور امرتسر کی بس میں سوار ہوئے تو بات بات پر قہقہے اور ایکدوسرے سے فحش مذاق شروع ہو گیا۔ گوالیاری بیرا بھی لہک لہک کر اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا!

"اجی وُن کی طاخت تھی کہ قرآن سریف کو ہاتھ لگاتے --- وہ تو ہم نے کہا کہ چلو اب کسٹم والوں سے کاہے کا دنگا کریں---"

اس کی سانولی بیوی بھی میرے آگے عورتوں والی سیٹ پر بیٹھی برقعے کے اندر گلاب جامن کھا رہی تھی۔ کسٹم پر ان سب لوگوں کی گگھی بندھی ہوئی تھی اور ہر شخص خوفزدہ تھا کہ کہیں ذرا سی بے احتیاطی اور غلطی پر انہیں بارڈر پر ہی نہ روک دیا جائے اور اتنی دیر کی بک بک اور دفتروں کے باہر کے دھکے اور اندر کی رشوتیں کہیں اکارت ہی نہ جائیں۔ لیکن بس میں آکر ہر آدمی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا۔ ہر شخص چہک رہا تھا، گنگنا رہا تھا، خواہ مخواہ باتیں کئے جا رہا تھا اور سکھ مزدوروں سے پیسے پیسے پر جھگڑ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سکھ ڈرائیور آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کنڈکٹر سے سواریوں کی تعداد پوچھی اور موٹر سٹارٹ کر دی۔ بس امرت سر جانے والی سڑک پر روانہ ہو گئی، درخت کھیت اور بجلی کے کھمبے پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ میں آٹھ سال بعد اپنے وطن جا رہا تھا۔ آٹھ سال پہلے آگ، خون اور دھواں اُگلتی ایک بڑی ہی ویران شام کو اس خیال کے ساتھ والدہ اور چھوٹی بہنوں کو لے کر گھر سے نکلا تھا کہ گڑبڑ ختم ہو جائے گی تو لاہور سے واپس آجاؤں گا۔ لیکن جو کچھ تھا ختم ہو گیا، گڑبڑ ختم نہ ہوئی۔ اب اتنی مدت بعد ان گلی کوچوں میں جاتے ہوئے دل میں عجیب قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ اپنا محلہ، اپنی گلی، اپنا بازار اور اپنا مکان کیسے دیکھ سکوں گا، کیسے آنکھیں چار ہوں گی دل پر کیا نہیں گزرے گی؟

اٹاری گزر گیا۔ اس کے بعد گورو سر ستلانی اور پھر خاصہ آ گیا۔ سڑک پر دو رویہ شیشم کے گنجان درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں گزر رہے تھے۔ دور سے مسجدوں کے کھنڈر اور مندروں اور گوردواروں کے چمکتے کلس نظر آ جاتے۔ اب امرتسر کے

کارخانوں کی چمنیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ امرتسر آ رہا تھا۔ امرتسر آ گیا تھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر بس کی کھڑکی سے لگا دیا۔ اُجڑے ہوئے وطن کے گلی کوچوں کی خوشبو اُڑنے لگی تھی۔

کبھی کبھی میں لاہور سے پٹھان کوٹ میل پر امرتسر جایا کرتا تھا۔ یہ گاڑی رات کو دس بجے چھوٹا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے جب خاصہ کا سٹیشن آتا تو دور سے کارخانوں کی روشنیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ اس کے بعد گاڑی بڑی تیزی سے ان کارخانوں کے قریب سے گزرنے لگتی۔ یہاں کہیں سے لوہا کوٹنے کی دھمک سنائی دیتی تو کہیں گڑگڑ کرتی کرین اُوپر اُٹھ رہی ہوتی اور کہیں ویلڈنگ کرنے والی تیز نیلی روشنی بار بار بھڑک رہی ہوتی۔ پھر لائن کی دائیں جانب اسلام آباد کے مکانوں کی روشنیاں روشندانوں اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھتیں اور گاڑی مختلف پٹڑیوں پر سے بے ہنگم شور کے ساتھ پھسلتی امرتسر کے اونچی لمبی چھت والے کشادہ سٹیشن میں آن داخل ہوتی۔ میں بڑی بے فکری سے ڈبے میں سے باہر نکلتا اور گیٹ پر بسنتی ٹکٹ دکھلا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ ریل کے سیڑھیوں والے پل پر سے گزرتے ہوئے میں پٹھان کوٹ میل کو دیکھتا جس کا انجن بڑے زور شور سے بھاپ کے بادل چھوڑ رہا ہوتا۔ ہال بازار میں گرمیوں کی رات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی اور اکا دکا لوگ آ جا رہے ہوتے۔ میں اپنی دھن میں مست قدم قدم چلتا ہال بازار میں سے گزر کر اپنے محلے اور پھر اپنی گلی میں آ جاتا۔ سردیوں میں گلی خاموش ہوتی اور گرمیوں میں کہیں کہیں محلے دار کمیٹی کے لیمپوں کی روشنی میں چارپائیوں پر بیٹھے تاش وغیرہ کھیل رہے ہوتے۔ اپنے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے میں ایک مکان کی کھڑکی ضرور دیکھ لیا کرتا۔ اس کھڑکی پر چق گری ہوتی۔ مجھے ہمیشہ یوں لگتا جیسے انور کھڑکی میں کھڑی، چق کی تیلیوں کو انگلیوں سے اپنی طرف کھینچے گلی میں جھانک رہی ہے۔

آٹھ سال بعد جب میں اس گلی میں سے گزر رہا تھا تو اپنے مکان کے پاس پہنچ کر میری نظریں خود بخود اُس کھڑکی کی جانب اُٹھ گئیں۔ مگر آج اُس کھڑکی کا سر ننگا تھا۔ اُس پر کسی چق کا سایہ نہ تھا۔ وہاں کوئی انور، عطیہ اور رضیہ نہ تھی۔ کبھی اُس کھڑکی پر مجھے ایک ایسی کنواری لڑکی کا گمان ہوا کرتا تھا جس نے لک چھپ کر اپنی منگنی کی خبر سن لی ہو اور اب شرم سے نظریں نیچی کئے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو۔ لیکن آج اس کھڑکی کا منہ اُس بد

نصیب بیوہ کی مانند کھلے کا کھلا تھا، جس کے جوان بیٹے کی لاش لوگ قبرستان میں دفن کرنے لے گئے ہوں۔

لیکن ایک زمانہ تھا جب امرتسر کے قبرستان بھی خوبصورت تھے اور گزرنے والوں کو زندگی کا پیام دیا کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس کھڑکی پر بانس کی تیلیوں والی ایک چق پڑی رہتی تھی اور اس کے عقب میں کھڑی چھریرے اور گندمی بدن کی ایک کشمیری لڑکی اپنی کالی کالی شرمیلی آنکھوں سے مجھے اسکول جاتے اور سکول سے واپس آتے دیکھا کرتی تھی۔ جس کے داہنے گال پر ایک سیاہ تل تھا اور جس کے سونے کی تاروں ایسے سنہرے اور لمبے بال اس کی نازک کمر پر کھلے رہتے تھے اور جو سردیوں میں فاختئی رنگ کی گرم فرد اوڑھا کرتی تھی اور گرمیوں میں بسنتی، قرمزی اور نیلے پھولوں والی وائیل کی قمیض پہنا کرتی تھی۔ اس لڑکی کا نام انور تھا۔ مجھے انور سے بڑی محبت تھی۔ میں راتوں کو کمپنی باغ کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر انور کی یاد میں رویا کرتا تھا۔ آٹھ سال بعد میں نے انہی درختوں کے نیچے جا کر اُن آنسوؤں کو تلاش کیا۔ لیکن وہاں سوائے جھڑے ہوئے زرد پتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے یاد ہے۔ ایک بار انور ہفتہ بھر کے لئے اپنی ماسی کے ہاں بٹالہ گئی تھی۔ میں اداس رہنے لگا۔ انور کی جدائی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ تیسرے روز میں بھی ریل گاڑی میں بیٹھ کر بٹالے پہنچ گیا۔ بھلے سموں کی بات ہے ان دنوں دلوں میں چور نہیں ہوتے تھے اور لوگ ایک دوسرے پر بہت کم شک کیا کرتے تھے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر ہو گی۔ سٹیشن سے سیدھا انور کی ماسی کے ہاں پہنچا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں دروازے کے ساتھ لگ کر کتنی ہی دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ دل میں یہ امید لئے کہ شاید انور نیچے آ نئے۔ کافی دیر بعد انور اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ نیچے آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی اور انگلی گال پر رکھ کر بولی:

"ہاؤ ہائے ---- تم کہاں؟"

وہ مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئی۔ اس کی ماسی نے مجھے انڈوں کا حلوہ اور پراٹھے کھلائے۔ جب ہم دونوں وہاں اکیلے رہ گئے تو اُس نے میری ٹھوڑی کو اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا:

"رے چارلی! تم اکیلے کیسے آ گئے؟"

انور مجھے چارلی کہا کرتی تھی۔ اس لئے کہ ان دنوں چارلی کی فلمیں بہت چلا کرتی تھیں

اور میں اُسے چارلی کی نقلیں کر کے بہت ہنسایا کرتا تھا۔ گرمیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی صبحوں کو ہم لوگ پو پھٹے کمپنی باغ کی سیر کو جایا کرتے۔ انور، انور کی امی، رضیہ، رضیہ کی امی صفیہ، سعیدہ، محمودہ، میری بہنیں، امی اور میں اور سعیدہ کا بڑا بھائی اسلم لالہ اور ہمارا کتا موتی --- یہ لوگ ہمارے ہمسائے بھی تھے اور دور کے رشتہ دار بھی۔ آپس میں بڑا بھائی چارہ اور میل برتاؤ تھا۔ ایک طرح سے مرن جیون اکٹھا تھا۔ بیاہ شادیوں پر یہی لڑکیاں سنہری سنہری گوٹ لگے کپڑے پہنے ڈھولک پر گیت گایا کرتی تھیں اور عید شب برات پر انہی کی چہل پہل ہوا کرتی۔ کمپنی باغ کی سیر ایک عجیب و غریب یادگار ہے۔ انور کی امی رات کو ہی نل کے نیچے خالی بالٹی رکھ چھوڑتی۔ صبح چار بجے جب نل میں پانی آتا تو اُس کی دھار خالی بالٹی میں گرتی، جس کے شور سے وہ جاگ پڑتی۔ سب سے پہلے ہمیں وہ جگاتی۔ ہم موتی کو ساتھ لے کر گلی میں آ جاتے۔ بھورے بھورے بالوں والا موتی گلی میں اچھل کود مچانے لگتا۔ اس کے بعد صفیہ، رضیہ، سعیدہ اور اسلم لالے کو بھی اُٹھایا جاتا، اور تھوڑی دیر بعد یہ قافلہ موتی اور اسلم لالہ کی سرکردگی میں کمپنی باغ کی طرف روانہ ہو جاتا۔ آسمان پر تارے پچھلے پہر کے دم توڑتے سایوں میں جھلملا رہے ہوتے، صبح کی تازہ اور خواہ مخواہ سلا دینے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی۔ مشرق کی طرف تحصیل پورہ کی آبادی کے اُوپر صبح کاذب کی کافوری جھلکیاں نمودار ہونے لگتیں۔ جب ہم شریف پورہ والا پھاٹک عبور کر کے کمپنی باغ کی حدود میں داخل ہوتے تو لیموں اور کھٹے کی ٹھنڈی اور ترش خوشبو ہمارا خیر مقدم کرتی۔ بارہ دری والے تالاب کے پاس بائیں ہاتھ کو گھاس کا ایک میدان ہوتا تھا، جہاں بڑ کا ایک گنجان درخت جٹا دھاری سادھو کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوتا۔ یہ درخت ہماری منزل ہوتا تھا۔ عورتیں برقعے اُتار کر بنچ پر ڈھیر کر دیتیں اور جوتے پھینک گھاس پر ننگے پاؤں بھاگنا شروع کر دیتیں۔ میں فوراً بوڑھے درخت کی داڑھی پکڑ کر اُوپر چڑھ جاتا اور ٹارزن کی طرح جھولتا ہوا ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتا۔ کبھی میں کسی جھکی ہوئی شاخ کو غوطہ لگا کر پکڑتا اور اس کے سہارے لٹک کر زمین پر آ جاتا۔ میں یہ سب کچھ انور پر اپنی بہادری کا سکہ جمانے کے لئے کرتا۔ لیکن مجھے یاد ہے انور نے کبھی ان باتوں کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھاس پر شلوار کے پائنچے اُٹھائے بھاگ دوڑ میں مشغول رہتی۔ قریب ہی آم کے درختوں کے جھرمٹ میں ایک نہر بہا کرتی تھی۔ اس کے

جھکے ہوئے ڈھلوانی کناروں پر ہری ہری لمبی گھاس ہمیشہ لہلہایا کرتی۔ ساون کی اندھیری راتوں میں آم کے جھنڈوں میں کوئلیں کوکتیں اور گھاس میں جگنو چمکتے پھرا کرتے۔ کھیل کود سے تھک کر ہم لوگ اس نہر پر آ کر خوب نہاتے، نہر کا پانی بڑا ٹھنڈا اور رسیلا ہوتا۔ ہم لوگ اس میں کناروں پر سے کود کود کر چھلانگیں لگاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار میں نے نہر میں چھلانگ لگائی تو غلطی سے انور کے اوپر جا گرا انور بالکل برہنہ تھی اور اس نے محض ململ کا ایک باریک دوپٹہ جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ گیلے دوپٹے میں سے اُس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیوں کا ابھار کانپ رہا تھا، لرز رہا تھا اور جب میں اس پر گرا، مجھے ادھ پکی خوبانیوں کی گرم گرم لہک محسوس ہوئی۔ ندی کے چاروں طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا اور ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک دم پرے ہٹ گیا۔ انور نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ چھاتیوں پر کھینچ لئے اور نیم سبز خوبانیاں پتوں کے جُھرمٹ میں چھپ گئیں، انور کا چہرہ سرخ ہو گیا اور میرا دل سر سے لے کر پاؤں تک دھڑکنے لگا۔ انور نے شرما کر مجھے دیکھا، ذرا سا مسکرائی اور پانی میں ڈبکی لگا کر غائب ہو گئی اور میں پیاسے ہونٹوں پر خشک ریت کی دھول اڑاتا وہیں کھڑا رہا اور میرا دل دھڑکتا رہا، دھڑکتا رہا--- میں آج بھی اپنے بدن پر انور کے جسم کی وہ ٹھنڈی ٹھنڈی پاکیزہ گرمائش اور رسدار نیم گرم خوشبو اُسی طرح محسوس کرتا ہوں۔ اور نیم سبز کانپتی، لرزتی، تھرتھراتی خوبانیوں کو پتوں کے سائے میں چُھپتا دیکھتا ہوں اور آم کے درختوں میں دل جلی کوئلیں کوکنے لگتی ہیں اور ہوا تیز ہو جاتی ہے اور پکے ہوئے آموں پر سے میٹھا، رس بھرا شیرہ ندی کے پانی میں ٹپکنے لگتا ہے اور میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور دھڑکتا رہتا ہے، دھڑکتا رہتا ہے۔-------

کبھی ہم لوگ ندی کی دوسری جانب ناخوں کے باغ میں دھاوا بول دیتے۔ رضیہ، صفیہ، انور، سعیدہ، محمودہ اور میں ناخ کے درختوں میں گھس جاتے اور کچی پکی ناخیں توڑ توڑ کر جھولیاں بھر لیتے اور بھاگ کر نہر میں کود جاتے۔ پھر ہم ناخوں کو نہر کے پانی میں دھو کر خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ اسی ندی کے آس پاس جھاڑیوں میں جنگلی گلاب بہت اگا ہوا تھا۔ واپسی پر ہم گلاب کے بڑے بڑے گلدستے بنا کر ساتھ لاتے۔ انہی جھاڑیوں میں کہیں کہیں سفید رنگ کا ایک پھول اگا کرتا تھا۔ یہ پھول موتیے سے بڑا ہوتا تھا اور پتیاں ایک دوسری پر جھکی ہوتی تھیں۔ اس کی خوشبو سے سارا باغ مہکا ہوتا۔ لیکن یہ پھول بڑی

مشکل سے ملا کرتا تھا اور لوگ کئی کئی گھنٹے اس کی تلاش میں ضائع کر دیتے تھے۔ اس پھول کی خوشبو بڑی میٹھی اور خواب انگیز ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے صندل کی ٹہنی پر سے ٹپکتی ہوئی شبنم مولسری کے پھولوں پر گر رہی ہو۔ آج کمپنی باغ میں اس پھول کی مہک کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ جہاں کل جھاڑیوں میں اس پھول کے شگوفے پھوٹا کرتے تھے آج وہاں پوری کچوریوں اور دہی بڑے والے جھوٹے دونے اور گندے چیتھڑے ملے۔ کل امرتسر، کسی شرمیلی آنکھوں والی کنواری لڑکی کے ہاتھ سے کڑھا ہوا سفید رومال تھا جس کے اوپر سبز پھولوں والی پیالیاں سجا کر کشمیری چاء پی جاتی تھی اور آج امرتسر سرخ شنیل کا ایک گندہ چیتھڑا ہے جیسے کسی لالائین نے اپنا پیٹ صاف کر کے کمپنی باغ کی جھاڑیوں میں پھینک دیا ہو۔ اس کے ہر پھول پر جمے ہوئے غلیظ خون کے دھبے ہیں اور گھاس کے ہر خطے میں گائے بھینسوں کے گوبر کے ڈھیر ہیں۔ جن محلوں میں کل اگر بتیوں کی خوشبوئیں اڑا کرتی تھیں۔ وہاں آج اوپلوں کے کڑوے دھوئیں میں دم گھٹتا ہے۔ جن مسجدوں میں کل صبح دم اذان کی دل نواز صدا گونجا کرتی تھی وہاں آج ہر شام چمگادڑیں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح چیختی پھرتی ہیں۔ کل جن مکانوں، جائدادوں اور حویلیوں کے لئے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ آج ان کے کھنڈروں میں کتے گندگی پھیلاتے پھرتے ہیں اور بلیوں نے بچے دے رکھے ہیں۔ جن کھڑکیوں پر لگی ہوئی چلمنوں کی ایک ہلکی سی لرزش پر جوان سینوں کے اندر دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ آج ان کھڑکیوں کی جلی ہوئی چوکھٹوں سے ہوا بھی اپنا دامن بچا کر گزرتی ہے۔ امرت سر! امرتسر!--- کل تیرے اندھیروں میں جگنو تارے بن کر ٹمٹماتے تھے۔ آج تیری روشنیاں گرہن کے داغ بن کر سلگ رہی ہیں۔ کل تیرے دودھیا بیناروں کو نیلا آسمان جھک کر چومتا تھا اور آج تیرے سائے بھی دھرتی پر ایک بوجھ ہیں۔ یروشلم! یروشلم! تیرے معبدوں کی تربتیں ویران ہو گئیں۔ تیری فصیلوں کے برج کھنڈر بن گئے۔ تیرے جالی دار جھروکوں کے سینے چھلنی ہو گئے اور تیرے بیت المقدس پر سے یسوع مسیح تجھے اکیلا چھوڑ کر پرواز کر گئے۔ ہم راوی کے کنارے بیٹھے تیری یاد میں آنسو بہا رہے ہیں۔ ہمارے ترکش شیشم کی ٹہنیوں پر ٹنگے ہیں اور ہمارے پاؤں سے خون بہہ رہا ہے۔---

شروع گرمیوں میں چیت کی صبحوں کو ندی کنارے والے آموں پر بور آ رہا ہوتا اور

چاروں طرف اس کی گھری گھری میٹھی خوشبو پھیلی ہوتی۔ ہمارا قافلہ ان خوشبو اڑاتے، مہکیلے راستوں پر سے گزرتا ہوا گھر کی راہ لیتا۔ راستے میں کہیں موتیا کھلا ہوتا اور کہیں رات کی رانی اپنی خوشبو کا رہا سہا خزانہ لٹا رہی ہوتی۔ انور، صفیہ اور محمودہ موتیے کے سفید پھول توڑ کر ان کے بُندے بنا کر کانوں میں پہن لیتیں اور میں گلاب کا گلدستہ ہاتھ میں پکڑے اسلم لالے کے ساتھ سب سے آگے آگے جا رہا ہوتا۔ گھر پہنچنے کے بعد میں صابن دانی اور تولیہ اٹھاتا اور سامنے والی مسجد میں نہانے کے لئے آجاتا۔ اگرچہ گھر پر نلکا موجود تھا مگر جو مزا کنوئیں کے پانی میں تھا وہ کمیٹی کے نل میں نہ تھا۔ مسجد میں ماسٹر حمید اور ماسٹر رفیق پہلے ہی سے ٹونٹیوں کے پاس بیٹھے مسواک کر رہے ہوتے۔ ماسٹر حمید رائل ٹاکیز میں آپریٹر تھا اور ماسٹر رفیق زیورات میں نگینوں کی جڑائی کا کام کرتا تھا۔ اُسے فلم میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ چونکہ گاتا بھی خوب تھا اس لئے ہم لوگ اُسے "ماسٹر سہگل" کہا کرتے تھے اور وہ اس لقب پر بہت خوش تھا۔ ماسٹر سہگل کا رنگ گہرا سانولا تھا اور وہ لکس اور پیرز صابن کو ملا کر نہایا کرتا تھا اور گھنٹہ گھنٹہ بھر نہاتا رہتا تھا۔ حسن بٹ ریلوے گارڈ ایک روز مسجد کے غسل خانے کے باہر کھڑے کھڑے تنگ آگیا۔ جب ماسٹر سہگل غسل خانے سے خوب نہا دھو کر باہر نکلا تو بٹ نے کہا:

"ماسٹر! اگر تم شملے میں اتنا پانی ضائع کرتے تو تم پر ٹیکس لگ جاتا۔"

ایک روز ماسٹر سہگل تولیہ صابن لئے مسجد میں داخل ہوا تو کیا دیکھتے ہیں کہ منہ سرخی پوڈر سے لال ہو رہا ہے۔ ہم نے پوچھا:

"ماسٹر! یہ کیا سوانگ ہے۔"

"کچھ نہیں ماشٹر، رات تھیٹر والے پکڑ کر لے گئے۔ کہنے لگے جوگی بابا کا پارٹ کر دو۔"

ماسٹر سہگل نے دو تین سال سے رنجیت مووی ٹون میں ایکٹر بننے کی درخواست دے رکھی تھی جس کے جواب کا وہ ہمیشہ منتظر رہتا تھا۔ ہم جب کبھی اُس سے پوچھتے:

"ماسٹر بمبئی سے کوئی جواب آیا؟"

تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا:

"بس ماسٹر آنے ہی والا ہے۔"

مئی جون کی تپتی ہوئی اُداس دوپہروں کو جب گلی چلچلاتی دھوپ میں ویران ہو جاتی ماسٹر سہگل اپنی دوکان کا ایک پٹ بند کئے لکڑی کے ڈیسک کے آگے بیٹھا لاخ میں جمی سونے کی انگوٹھی میں نگینے جڑتے اور اُسے چھیلتے ہوئے کبھی کبھی بڑی دردناک آواز میں گانے لگتا۔

نبی جی کرو شاد دکھیاریاں نوں
مصیبت زدہ غم دیاں ماریاں نوں

اُس کی دردانگیز آواز سیاہ ماتمی علم بن کر دوپہر کی تربت پر پھڑپھڑانے لگتی اور دل اداسیوں سے لبریز ہو جاتا۔ جیٹھ ہاڑ کی یہ آگ برساتی، دھول اُڑاتی، سسکارتی، ہونکتی، غمگین، دلگیر، چپ چاپ، اُجاڑ دوپہریں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تیز دھوپ میں گلی کا فرش ہانپنے لگتا اور سائے چھوٹے چھوٹے سائبانوں، مکانوں اور ڈیوڑھیوں کے چھجوں کے نیچے بھاگ کر سمٹ جاتے اور لوگ ٹھنڈے دیوان خانوں کی کھڑکیاں بند کر کے فرش پانی سے دھو کر سو جاتے۔ گلی سنسان ہو جاتی۔ کبھی کبھی کسی مکان کی تپتی ہوئی منڈیر پر بیٹھی کوئی چیل اپنی آواز سے فضا کو اور ویران بنا دیتی۔ اس وقت معلوم ہوتا گویا بد نصیب بیوہ اور آزردہ دل دوپہر کسی پر کٹی کبوتری کی طرح گلی میں دوکانوں کے سائبانوں اور مکانوں کی بند کھڑکیوں سے سر پٹختی، ٹکراتی، بین کرتی پھر رہی ہے۔ ایسے میں جب ماسٹر سہگل کی اُداس آواز بلند ہوتی تو دل سینے کے اندر سرد آہ بھرتا اور یہی جی چاہتا کہ اُٹھ کر بڑی نہر والی سڑک پر چل پڑیئے اور ٹاہلیوں کے درختوں کی خوشبو لیتے کسی ٹھنڈی چھاؤں میں پڑ کر سو رہے اور اس وقت اٹھئے جب گرمیوں کا ٹھنڈا ٹھنڈا سبز چاند ٹاہلی کی ٹہنیوں میں مسکرا رہا ہو اور باغوں میں چنبیلی اور موتیئے کے پھولوں پر بھونرے منڈلا رہے ہوں۔

ماسٹر سہگل محلے کی نعتیہ پارٹی کا اُستاد تھا۔ جس گھر، جس مسجد میں محفل میلاد منعقد ہوتی۔ یہ پارٹی وہاں ضرور موجود ہوتی مجھے وہ منظر اب بھی یاد ہے۔ درمیان میں خوبصورت جازم پر طشتریوں اور سینیوں میں پھل اور مٹھائیاں سجی ہوئی ہیں۔ اگربتیاں سلگ رہی ہیں۔ ایک آدمی بڑا سا پنکھا ہلا رہا ہے۔ دوسرا تھوڑی تھوڑی دیر بعد لوگوں پر گلاب دانیوں میں سے گلاب کا عرق چھڑک رہا ہے۔ لوگ آنکھیں بند کئے سر جھکائے بیٹھے ہیں اور آہستہ آہستہ آگے پیچھے ہل رہے ہیں۔ ماسٹر سہگل نے سر خوبصورت ریشمی رومال سے ڈھانپ رکھا

ہے۔ دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہیں۔ دوزانو ہو کر بیٹھا ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور بڑی رقت کے عالم میں جھوم جھوم کر نعت پڑھ رہا ہے۔ ایک روز ماشٹر نے اسی طرح کے ایک ختم شریف سے واپس دوکان پر آ کر مجھے ایک رقعہ دکھلایا۔ اسکول کی لکیر دار کاپی کے کاغذ پر زیڈ کی نب اور کاپی سیاہی سے بڑے بھونڈے خط میں لکھا تھا:

"بھائی جان رفیق!

سلام و دعا۔ آپ جب ہمارے گھر نعت پڑھ رہے تھے تو میں بھی چق کے پیچھے آپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں تو رو پڑی۔ کیا آپ مجھے یہ نعت نقل کر کے بھیج دیں گے اور طرز بھی اُس کی اچھی سی بنا دیں گے۔ آپ بہت اچھا گاتے ہیں اور ہاں جی --- کھٹی چیزیں نہ کھایا کریں۔"

فقط

نیچے نام نہیں لکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ماشٹر محلے کے ایک مشہور رفوگر کی چھوٹی لڑکی سے عشق لڑا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس لڑکی کی شادی ہو گئی اور ماشٹر سہگل اس حادثے کے بعد ایک عرصے تک اُس کی یاد میں ڈوب کر نعتیں پڑھتا رہا۔

ماشٹر حمید نیو تھیٹرز کی فلموں کا شیدائی تھا اور اُسے دیوداس کے سارے مکالمے اور گانے نوک برزبان تھے۔ وہ دیوداس کا آخری گیت بڑی سیدھی سادی خشک اور پھیکی مگر پُر سوز آواز میں گایا کرتا تھا۔ اس کی آواز پر مجھے یوں لگتا جیسے خشک سرکنڈوں میں آگ کا پہلا شعلہ سرسرا رہا ہو۔ ماشٹر، دیوداس کا وہ منظر بڑی رقت بھری آواز میں سنایا کرتا تھا۔ جب ریل گاڑی میں پہلی بار دیوداس خون تھوکتا ہے اور وہ خون دیکھ کر سہم کر نوکر سے کہتا ہے:

"دھرم داس! خون!"

آج ماشٹر حمید لاہور کی ایک گندی اور اندھیری گلی میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ماشٹر سہگل اس دنیا میں نہیں رہا۔ ماشٹر حمید وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو رہا ہے۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئی ہیں۔ پرانے واقف کاروں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ پانچ وقت کا نمازی ہے اور ہر وقت کا روگی ہے۔ بیمار ہے، پریشان ہے، مفلوک الحال ہے۔ جب کبھی مجھ سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے تو سلام کے بعد سر

جھکا کر گزر جاتا ہے۔ شائد کسی دن مجھے اپنا گریبان کھول کر چپکے سے سینہ دکھلائے اور کھانس کر کہے:

"دھرم داس! خون!"

کبھی کبھی شام کو ہم اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں جا کر چاء پیتے۔ اس ہوٹل کی میزیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور بنچوں میں کھٹملوں نے اپنی چھاؤنیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ اسی ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھ کر میں نے انور کو پہلا محبت بھرا خط لکھا اور جب انور ڈولی میں سوار ہو کر اپنے خاوند کے گھر جانے لگی اُس وقت بھی میں اسی ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ ہوٹل کا مالک رحمان لالہ اوپر جواء کرواتا تھا اور خود اس کی کمیشن پر گزارہ کرتا تھا۔ ہر جمعرات کو وہ ختم شریف کرواتا اور گڑگڑا کر خدا سے اپنے ہفتے بھر کے گناہوں کی معافی مانگتا۔ وہ موٹا، بھدا، اونچا لمبا، بد وضع، بے ڈول پرانا کشمیری تھا اور لوگوں کو میٹھی چاء پلاتا اور خود سبز چاء پیا کرتا تھا۔ بیساکھی کے میلے پر جب گول باغ میں تھیٹر والی کمپنیاں اپنے خیمے گاڑ کر کھیل تماشے شروع کر دیتیں تو رحمان لالہ دو روپے روز پر وہاں جلاد کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ اُس نے ایک دنبہ پال رکھا تھا، جس سے اُسے بڑا پیار تھا۔ ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ رحمان لالہ ڈنڈے سے دنبے کو تابڑ توڑ کوٹ رہا ہے کسی نے اُس کی وجہ پوچھی تو ہانپتے ہوئے بولا:

"بہن یاوا، دس روپے کا نوٹ کھا گیا ہے --- نکال باہر تیری ماں کو ---" اور پھر دھڑا دھڑ ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔

سردیوں کی دھندلی صبحوں کو منہ اندھیرے ہماری گلی میں ایک فقیر آیا کرتا تھا جو اکتارے پر بار بار یہ مصرعہ گایا کرتا۔

تینوں چھڈ کے کلی نوں ٹُر گیاں
جنہاں داماں کریں۔

اس کی آواز میں بڑا جادو تھا اور میں یہ مصرع سن کر ہمیشہ پژمردہ ہو جاتا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جن پر اتنا مان ہو، اتنا ناز ہو وہ اکیلا چھوڑ کر چل دیں۔ گرمیوں میں وہ بوڑھا درویش آیا کرتا جو صبح صبح گلی میں داخل ہوتا اور ہر مکان کی کھڑکی سے منہ لگا کر یہ شعر تھکی تھکی، کانپتی بوڑھی آواز میں گاتا۔

اُٹھ فریدا سُتیا تیری داڑھی آیا بُور
اگا نیڑے آ گیا تے پچھا رہ گیا دُور

سوچتا ہوں یہ لوگ اب کہاں ہوں گے؟ شاید مر گئے ہوں۔ شاید مار دیئے گئے ہوں۔ شاید زندہ ہوں اور کسی دور افتادہ تکیئے میں اور یا کسی مصری شاہ کے پل کے نیچے چیتھڑوں میں لپٹے، جسم پر بھوک کے گھاؤ اور بیماریوں کے داغ لئے موت کا انتظار کر رہے ہوں---- اگا نیڑے آ گیا تے پچھا رہ گیا دور،

کمپنی باغ والی عید گاہ میں جامن کے گنجان درختوں تلے ایک پرانا حوض تھا۔ اس کے گدلے پانی میں مٹیالی مٹیالی مچھلیاں اور جامن کے خاکستری پتے تیرا کرتے تھے۔ برسات کے دنوں میں کالے کالے موٹے جامن دھپ دھپ گیلی زمین پر گرا کرتے یہاں سے قریب ہی چھوٹی نہر کے کنارے کنارے دونوں جانب شہتوت کے بے شمار درخت ہوا کرتے تھے۔ آج یہاں شرنارتھیوں نے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی ایک پوری کالونی آباد کر رکھی ہے۔ اپریل کے دنوں میں جب بہار کا آغاز ہوتا چھابڑی والے یہاں سے شہتوت خرید کر اُسے نہر میں دھو کر چھابڑیوں میں کیلے کے ہرے ہرے پتے لگاتے۔ ان پر لال، ہرے بھرے، قرمزی اور سیاہ شہتوت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بناتے۔ ان پرُ سچے گلاب کے پھول سجاتے اور پھر شہر کی طرف چل پڑتے۔ گلیوں میں صبح صبح ان کی آمد، آمدِ بہار کی دلیل تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شہر سے باہر ناخ کے درخت سفید سفید شگوفوں سے بھر گئے ہیں اور نہر کنارے آم کے درختوں پر خوشبودار سنہرا بور آ گیا ہے اور آلوچے کی ٹہنیوں پر کاسنی کلیاں پھوٹ پڑی ہیں اور طوطوں نے امرود اور رس دار لوکاٹیں کترنا شروع کر دی ہیں۔ پھر میں بھی چھڑی ہاتھ میں لے، نیکر اور قمیص پہنے، سر اور پاؤں سے ننگا باغوں کی مڑگشت کرنے گھر سے نکل پڑتا اور سارا سارا دن کبھی اکیلا اور کبھی دوستوں کی ٹولی کے ساتھ امرود اور لوکاٹوں کے باغ میں آوارہ گردی کیا کرتا۔ کچے پکے امرود توڑ توڑ کر کھاتا، بلبلوں کے گھونسلے اجاڑتا، گری پڑی سنہری اور کتھئی رنگ کی لوکاٹیں اٹھا اٹھا کر جیبوں میں ڈالتا اور کھیتوں کھیت جانے والی کچی پگڈنڈیوں پر چھڑی ہوا میں لہراتا واپس گھر کی طرف چل پڑتا---- ایک جیب میں کچے امرود ہوتے، دوسری میں لوکاٹیں اور نیکر کی جیبیں شہتوت سے بھری ہوتیں اور ننگے پاؤں تلے پگڈنڈی کی مٹی ٹھنڈی ہوتی اور ہوا میں دھریک، نیم اور

لیموں کے پھولوں کی مہک اڑ رہی ہوتی اور رنگ برنگ تتلیاں ہوتیں اور آم کے بور پر منڈلانے والے سیاہ بھونرے ہوتے اور جب نہر آتی تو میں نیکر، قمیص اُتار کر ننگ دھڑنگ نہر میں چھلانگ لگا دیتا اور مزے لے لے کر نہاتا اور ڈبکیاں لگاتا۔

پھر ساون بھادوں کے کالے کالے، مٹیالے اور پانی سے لدے ہوئے مہیب بادل جھوم جھوم کر آتے اور کمپنی باغ، شریف پورہ اور تحصیل پورے پر گھٹا بن کر چھا جاتے اور دیکھتے دیکھتے بارش کی جھڑی لگ جاتی۔ تکیہ بودی سائیں میں بیری کے نیچے بیٹھ کر چوسر کھیلنے والے فوراً دریاں جھاڑتے ہوئے اُٹھتے اور کوٹھڑی کی طرف بھاگ جاتے۔ باغوں کی طرف سے کوئل کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ ہماری گلی کا فرش بھیگ جاتا اور فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی۔ سامنے والی مسجد کا پتھر کی سلوں والا فرش چمکنے لگتا۔ انور اپنی کھڑکی میں نمودار ہوتی۔ بانہیں اوپر اُٹھا کر بندھی ہوئی چق کھولتی، نیچے گلی میں جھانک کر ادھر ادھر دیکھتی اور واپس چلی جاتی میں سائیکل اُٹھاتا اور کمپنی باغ کی آوارہ گردی کرنے چل نکلتا۔ جب واپس آتا تو چھاجوں پانی برس رہا ہوتا۔ انور اپنے دیوان خانے میں چق کے ساتھ فاختائی فرد اوڑھے بیٹھی ہوتی۔ ذرا چق اٹھا کر مجھے دیکھتی اور مسکرا کر کہتی۔

"وے چارلی! تجھے بارش میں بھی چین نہیں۔"

جاڑوں میں مینہ برستا تو انور کی نانی دیوان خانے میں سری نگر والا سماوار سلگا دیتی۔ میں بھی گرم فرد اوڑھے وہاں آن بیٹھتا۔ میری بہنیں بھی وہاں آ جاتیں۔ انور اوپر سے کانگڑی میں کوئلے ڈال کر لے آتی اور ہم لوگ آگ تاپتے ہوئے پوہ ماگھ کی سرد بارش میں سبز چاء کا انتظار کیا کرتے۔ مینہ کی بوچھاڑ تیز ہوا کے ساتھ چق پر بھی پڑنے لگتی۔ انور جلدی سے زمین پر بچھی ہوئی دری کو اپنی طرف سمیٹ لیتی اور ذرا سا پیچھے کھسک جاتی۔ سردی اور بارش کے احساس سے اس کا رنگ سرخ ہو جاتا اور کشمیری سیب ایسے گالوں پر ملائم اور ریشمی بور سا اُڑنے لگتا۔ کئی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اُس ریشمی روئیں دار گالوں کو چوم لوں۔ اتنے میں بادل زور سے گرجتا اور سماوار میں چاء ابلنے لگتی۔ انور کی نانی باری باری چھوٹی چھوٹی پھول دار نیلی پیالیوں میں چائے انڈیلتی اور سماوار وسط میں رکھ کر بڑی موج میں آ کر کوئی پرانا کشمیری گیت سنانا شروع کر دیتی۔ وہ کشمیری بڑی روانی سے بول لیتی تھی اور لب و لہجہ اور سبھاؤ پورا پرانی کشمیری عورتوں ایسا تھا۔ مجھے وہ گیت یاد نہیں

رہے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بڑے یاس امیز اور غمناک ہوتے تھے اور میں انہیں بڑی توجہ سے سنا کرتا تھا۔ خیال ہی خیال میں، میں مہیب پہاڑوں کے ان خوفناک دشوار گزار جنگلوں میں پہنچ جاتا جہاں موسلادھار بارش ہو رہی ہوتی اور تمام پتھریلے راستے اور بانس کے جھنڈوں میں سے ہو کر گزرنے والی پگ ڈنڈیاں بارش کی دھند میں چھپ گئی ہوتیں۔ میں دیکھتا کہ ایک سانولی سی کالی کالی آنکھوں اور سرخ ساری والی لڑکی ماتھے پر بندیا لگائے، کانسی کی گاگر اُٹھائے ان راستوں پر چلی جا رہی ہے اور گرتی بارش میں اس کی ساری اس کے سانولے بدن سے چپک رہی ہے اور دھند نے اس کے ارد گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے بانس کی شاخیں ہوا اور تیز بارش میں جھک جھک کر اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کو چومنے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ ہراساں ہے، گھبرائی ہوئی سی ہے، کبھی ہاتھ سے ساری کا پلو سنبھالتی ہے اور کبھی اُسے چھوڑ کر آنکھوں پر آیا ہوا پانی پونچھتی ہے۔--- پھر ایک دم آنکھوں کے سامنے ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ پھیل جاتا۔ میں دیکھتا تند ہواؤں کے جھکڑوں اور زور دار بارش میں نیم اور دھریک کے درخت دہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ کھیت جوہڑ بن گئے ہیں اور ندی نالے دریا بن کر بہنے لگے ہیں۔ دیہات کے کچے کوٹھوں پر سے پانی چھوٹی چھوٹی آبشاریں بن کر نیچے گلی میں گر رہا ہے۔ گلی میں ایک بھینس کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہے ایک کالا لڑکا کمبل سر پر اوڑھے اُسے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک کسان کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ اُس نے سر پر بوریا رکھا ہوا ہے اور سینٹے سے بیلوں کو پیٹ رہا ہے۔ ہوا تیز ہو گئی ہے، سرد ہو گئی ہے اور اس سردی اور بارش میں بڑی نہر کو جانے والی، جنڈیالے کو جانے والی ایک پکی سڑک سامنے آ جاتی ہے۔ سڑک بارش میں دھندلی ہو رہی ہے۔ دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت ہوا اور بارش میں جھوم رہے ہیں اور مرجھائے ہوئے مٹیالے پتے بڑی تیزی سے گر رہے ہیں۔ سامنے پیپل کے درخت تلے نانک شاہی اینٹوں والی ایک پرانی حویلی کا بوسیدہ دروازہ ہے جس کا ایک پٹ بند ہے اور دوسرا غائب ہے۔ اندر صحن میں ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ ایک جگہ کھپریل کے چھپر کھٹ تلے دو تین بھینسیں بندھی ہیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بیل بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ پاس ہی ایک کسان آگ جلائے کھیس اوڑھے حقہ پی رہا ہے اور اوپر چوبارے میں بڑی سی رنگیل چارپائی پر چودھری جی کمبل میں لپٹے بیٹھے ہیں اور پٹواری سے نئی زمینوں میں پانی کی تقسیم پر بات چیت کر رہے ہیں۔

درمیان میں لوہے کی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں اور کھڑکی بند ہے اور ہوا اور بارش کی بوچھاڑ بند کھڑکی سے سر پٹخ رہی ہے اور کیکر کے کالے اور کانٹے دار ننگے درخت سردی، بارش اور پالے میں ٹھٹھر رہے ہیں۔---

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی اور میں تیزی سے گرم چاء کے دو تین گھونٹ چڑھا جاتا۔

انور کہتی:

""وے چارلی! زبان جل جائے گی۔"

نانی کہتی:

"وہ چاء ہی کیا جو زبان نہ جلائے---"

انور کی نانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ چائے ہی کیا جو زبان نہ جلائے اور وہ محبت ہی کیا جو دل نہ جلائے اور خون کے آنسو نہ رلائے اور دیس دیس کی اور در در کی خاک نہ چھنوائے---!

عید، شب برات پر محلے میں خوب رونق ہوتی۔ صبح سویرے ہی چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں نئے نئے گوٹہ لگے رنگدار ریشمی کپڑے پہن کر گلی میں نکل آتیں۔ فضل جمیور کا بیٹا جان اپنے مکان کے آگے تخت پوش بچھا کر اُس پر سفید کھیس ڈالتا اور تانبے کے خوانوں میں گلاب دانیاں، کھلونے، فالودے کے پیالے اور پھولوں کے گلدستے سجانے لگتا۔ عنایتا حلوائی اپنی دکان کو چھت سے لے کر فرش تک رنگ برنگی مٹھائیوں کے تھالوں سے آراستہ کر دیتا۔ کاکا عمدو کی دکان کی سج دھج تو سب سے نرالی ہوتی تھی۔ دو روز پہلے ہی دکان کے آگے بڑی سی قنات کی چھاؤں کر دی جاتی۔ عید کے روز باہر بڑے تخت پوش پر لکڑی کی تختیاں اوپر سائبان تک لگا دی جاتیں اور ان پر سفید چاندنی بچھ جاتی۔ یہ بالکل سیڑھیاں سی بن جاتیں۔ جن پر کہیں ورق لگے اراروٹ بہار دے رہے ہوتے تو کہیں قیمے کے نان، تافتانے اور شیرمال، نمکین قلچے اور کھانڈ قلچے سج رہے ہوتے اور کہیں روغنی روٹیاں اور باقر خانیاں بجلی کی روشنی میں دعوت نظارہ دے رہیں ہوتیں۔ کاکا عمدو--- بوسکی کا تہمد اور بوسکی کی سونے کے بٹنوں والی قمیض پہنے بڑی گرم جوشی کے عالم میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہا ہوتا۔ کبھی ملازموں کو ہدایت دیتا، کبھی گاہک سے بات کرتا اور کبھی بڑی نفاست سے

پان منہ میں ڈال کر سر پر ہاتھ ملتا اور کبھی بیش قیمت پیچوان کے کش لگاتا دکھائی دیتا۔ کاکا عمدو بڑا خرچیلا اور شوقین مزاج قاندرو تھا۔ ناٹا قد، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، تیکھے نقش، چوڑے شانے، بھرا بھرا جسم، گورا چٹا رنگ ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ بڑا خوش مزاج اور نمائش پسند تھا۔ جب ہنستا تو آنکھیں گالوں میں چھپ جاتیں اور سفید سفید ہموار دانت موتیے کی طرح چمکا کرتے۔ ہر کام میں سب سے آگے ہوتا۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کا عادی تھا۔ محلے میں سے احراری لیڈر گزرے یا کانگرسی، لیگی یا نیلی پوش، عمدو کاکا اپنی دوکان کے آگے کیلے کے پتوں اور جھنڈیوں سے سجا ہوا محرابی دروازہ ضرور لگائے گا اور اپنے کسی کاریگر کے ہاتھوں لیڈر کے گلے میں پھولوں اور نوٹوں کا ہار ضرور پہنائے گا۔ عالمگیر باجے والا خواہ کسی کی برات لے کر گزرے، عمدو کاکا کی دوکان کے آگے ضرور سلامی دیتا اور کاکا عمدو کا کاریگر فوراً پانچ دس کا نوٹ لے کر اُس کی طرف بڑھتا۔ ایک بار بازار میں سے سیف الدین کچلو کا جلوس گزرنا تھا۔ کاکا جی نے بڑا خوبصورت آرائشی دروازہ لگوایا اور اس کے عین بیچ میں رومال میں بندھے ہوئے گلاب کے پھولوں کی پوٹلی لٹکا دی۔ جب کچلو وہاں سے گزرنے لگا تو کاکا جی نے فوراً کاریگر کو اشارہ کیا، اس نے رسی کھینچ دی۔ پوٹلی کھل گئی اور گلاب کے سرخ سرخ پھول ڈاکٹر کچلو کے اوپر برسنے لگے۔ لوگوں نے جوش میں آ کر تالیاں پیٹیں اور "کچلو زندہ باد"، "کاکا عمدو زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ کاکا جی کی خوشی کا بھلا کوئی ٹھکانہ تھا۔ پھول کر کپا ہو رہے تھے۔ چہرہ لال سرخ ہو گیا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی سلامی لے رہے تھے۔--- آج اُن کے مکان پر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ لوگ اُن کے مکان کا ملبہ تک اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ دن کو وہاں ایک بھٹیارن دانے بھونتی ہے اور رات کو زرد آنکھوں والا اُلو اپنی منحوس آواز میں پچھلے پہر تک بولتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کچلو زندہ باد!--- عمدو کاکا زندہ باد!

عید کی صبح کو منہ اندھیرے میں اور میرا چھوٹا بھائی قبرستان ضرور جاتے۔ ہم دونوں گھی منڈی والے دروازے سے نکل کر قبرستان کو جانے والی سڑک پر آتے تو پل کے پاس ہمیں گلاب کے پھول بیچنے والے ملتے۔ انہوں نے بڑی بڑی چنگیروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ڈھیر لگا رکھے ہوتے اور دو پیسے کے کتنے سارے پھول دے دیتے۔ ہم ایک آنے کے پھول خرید کر رومال میں باندھ لیتے اور سردی میں گرم چادریں اوڑھے قبرستان کی راہ

لیتے۔ ٹھنڈ میں ہاتھ پیر ٹھٹھر رہے ہوتے اور منہ سے بات کرتے وقت بھاپ نکل رہی ہوتی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے صبح کے انتظار میں زرد ہو رہے ہوتے چھوٹی سی سڑک کی دونوں جانب ہمیں فقیر بیٹھے ہوئے ملتے۔ ان کے پیچھے اناروں اور امرودوں کے باغوں میں گھپ اندھیرا چھا رہا ہوتا۔ اب ادھر ادھر سے قرآن کریم کے تلاوت کرنے کی ہلکی ہلکی پر اسرار آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر موم بتیاں جلا رہے ہوتے اور پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ عورتیں اپنے بچوں، بھائیوں، خاوندوں اور رشتہ داروں کے مزاروں پر بیٹھی تلاوت کلام پاک سے ان کی روحوں کو ثواب پہنچا رہی ہوتیں۔ یہ خیال کہ ان لوگوں نے خوشی کے موقع پر بھی اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو نہیں بھلایا، دل کو بڑی تسکین دیتا اور انسانی بھلائی میں میرا یقین زیادہ محکم ہو جاتا۔ اسی قبرستان میں بسنتی پھولوں والا وہ درخت بھی تھا، جس کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر انور نے مجھے بمبئی جاتے ہوئے اپنا ایک کنگن یادگار کے طور پر دیا تھا اور کہا تھا:

"وہاں زیادہ دن نہ ٹھہرنا وے۔"

قبرستان سے واپس آتے تو دن نکل آیا ہوتا اور گلی میں بڑی رونق ہوتی۔ بچے نیلے پیلے غبارے ہاتھوں میں لئے بانس کے باجے بجا رہے ہوتے۔ جان کی دوکان پر بچوں کا ہجوم کھلونے خرید رہا ہوتا۔ گاماں ٹپ گر کے بھلے پکوڑیاں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہوتیں۔ عنایتی حلوائی اور کاکا عمدو کی دوکانیں دلہنوں کی طرح سجی ہوئی ہوتیں۔ اور لوگ بڑے شوق سے شیر مال اور اراروٹ اور مٹھائیاں خرید رہے ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری بچیاں بے احتیاطی سے چہروں پر سرخی پاوڈر تھوپے ریشمی رومالوں سے ڈھکی ہوئی سویوں کی تھالیاں لئے اپنے اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کے گھروں کو جا رہی ہوتیں۔ ہر شخص کے چہرے پر خوشی اور شادمانی کی چمک ہوتی اور بچے اپنی اپنی عیدیاں جیبوں میں ڈالے بنے ٹھنے گلی میں چکر لگا رہے ہوتے اور کبھی اس دوکان سے غبارے خریدتے اور کبھی وہاں بیٹھ کر کھیرے کھانے لگتے۔ یوں لگتا جیسے آج اس گلی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ ہر گھر میں سویاں ابل رہی ہوتیں ہر گھر میں دو دو تین تین سالن چولہوں پر چڑھے ہوتے۔ ہر گھر سے سویوں کے ورق لگے تھال باہر نکل رہے ہوتے۔ ہر مکان پر مسرتوں کا قافلہ خیمہ زن ہوتا اور فقیروں میں خیرات بانٹی جا رہی ہوتی۔

عید سے ایک دن پہلے کی رات میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ اُسے حرفے کی رات کہا جاتا۔ وہ رات ہم تقریباً جاگ کر گزارتے۔ محلے بھر میں سبزی فروش، منیاری والے، گوشت والے اور درزیوں اور حجاموں کی دوکانیں رات گئے تک کھلی رہتیں۔ درزیوں اور حجاموں کی دوکانوں میں تو میلہ لگا ہوتا۔ سبزی فروش چراغ ارائیں آلو اور مٹر تول تول کر دھڑا دھڑ بیچ رہا ہوتا۔ گوشت ایک سیر سے کم کسی کے گھر نہ جاتا۔ جیرے قصائی نے دوکان کے باہر بکرے اُلٹے لٹکائے ہوتے اور کاریگر اندر گوشت کاٹ رہے ہوتے اور قیمہ بنا رہے ہوتے۔ حسن منیاری والے کی دکان پر بچے بچیاں، نوکرانیاں اور نوکر جرابیں، رومال، ربن، کلپ، چوڑیاں، پراندے، سرخی پاؤڈر، کریمیں اور بنیانیں خرید رہے ہوتے۔ درزیوں کی دوکانوں کے دروازے بند ہوتے اندر بتیاں جل رہی ہوتیں اور مشینیں گزر گزر کی آوازوں کے ساتھ چل رہی ہوتیں۔ لوگ بار بار آ کر تقاضا کر رہے ہوتے اور ماسٹر صاحب ہر ایک کو یہی جواب دیتے۔

"بس جی عید کی نماز سے پہلے قمیضیں تیار لیں۔"

لیکن آج اس محلے میں عید کی نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔ آج اس گلی میں کوئی درزی حرفے کی رات کو مشین لے کر صبح ہونے تک نہیں بیٹھتا۔ آج اس گلی پر کسی ٹیلر ماسٹر کی بجھی ہوئی استری کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک کبھی نہ ختم ہونے والی گہری شدید اور انمٹ اداسی، بیوگی اور بے کسی کی راکھ اڑ رہی ہے۔ آج یہ کسی عید، کسی شب برات پر نہیں مسکراتی، کسی سے ہنس کر بات نہیں کرتی ---- اپنے فرش پر چلنے والوں کو ایک افسردہ بیگانگی سے دیکھتی ہے اور مکانوں کی تاریک ڈیوڑھی میں سر رکھ کر رات بھر آہیں بھرا کرتی ہے۔ اس کا منہ کھلا ہے، آنکھیں بے نور ہیں، چہرہ فق ہے، ہونٹ اندر کو بھنچ گئے ہیں اور چھاتی کا فرش چھلنی ہو رہا ہے اور اپنی گندی نالیوں کے بے جان بازو پھیلائے یہ اس پھول کی یاد دلا رہی ہے جو کسی جنازے میں سے سڑک پر گر پڑا ہو اور وہیں پڑے پڑے مرجھا کر سوکھ گیا ہو، جیسے لحد نے بھی اپنی آغوش میں پناہ نہ دی ہو، جیسے موت نے بھی اپنے دامن سے جھٹک دیا ہو --- کبھی اس کے ہاتھوں میں حنا کا رنگ تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر چلمنیں پڑی رہتی تھیں اور دروازوں کے پٹ نیم وا ہوتے تھے اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی ڈیوڑھیوں میں سے موتیے کی خوشبو اڑاتی، برقعوں میں لپٹی ہوئی جھکی جھکی شرمیلی

نگاہوں والی لڑکیاں گزرا کرتی تھیں۔ لیکن آج اس کے ہر مکان کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور پرنالے گر پڑے ہیں اور ممٹیاں ڈھے گئی ہیں اور ہر کھڑکی ننگی ہے، ہر دروازہ چوپٹ کھلا ہے اور ہر گھر دہلیز سے لے کر پچھلے کمرے تک عریاں دکھائی دیتا ہے۔ اس بے حیا طوائف کی طرح جو سب کے سامنے ننگی نہا رہی ہے اور ہر نلکے پر نیم عریاں عورتیں میلے کپڑے دھوتی ملتی ہیں اور ان کے بچے نالیوں پر گندگی سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی

یہ گیت مدت ہوئی میں نے امرتسر میں سنا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ دسمبر گزر رہا تھا، آسمان پر بھورے سرد بادل چھا رہے تھے۔ میں صبح کی سیر سے ٹھٹھرتا ہوا واپس آ رہا تھا میرے ہاتھ میں شبنم سے لدے ہوئے گلاب کے دو تین پھول تھے۔ بٹالہ جانے والی ریلوے لائن کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا نالہ آلوچے کے باغ کے ساتھ ساتھ کمپنی باغ کو جاتا تھا اس نالے کی ایک طرف چھوٹا سا صاف ستھرا گاؤں تھا۔ دس بیس چکنی مٹی سے لپے ہوئے کچے کوٹھے ہوتے تھے۔ سفید سفید دودھیا میناروں اور گنبد والی ایک مسجد بھی تھی جس کے صحن میں جامن کا پیڑ اگا ہوا تھا۔ میرا معمول تھا کہ واپسی پر اس گاؤں میں سے ضرور گزرتا۔ مجھے ان کوٹھوں کی سادگی اور مسجد کے میناروں کا اجلا پن بڑا پیارا لگتا تھا۔ اس دن جب میں یہاں سے گزرنے لگا تو مجھے کہیں قریب ہی سے لڑکیوں کے مل کر گانے کی آواز سنائی دی۔ میں وہاں رک گیا۔ ایک مکان کے آنگن میں پیپل کے درخت تلے کچھ دیہاتی لڑکیاں تالی بجاتی گا رہی تھیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی
(تجھے بابل کی گلیاں خواب ہو جائیں گی۔)

او دلہن!

وہاں کسی لڑکی کی شادی تھی، صبح کا سماں، سردی، ہوا، بھورے بھورے بادل، سفید سفید دیہاتی کوٹھے، کھلا آنگن، جھڑے ہوئے پتوں والا ٹنڈ منڈ پیپل کا درخت اور لڑکیوں کی دردناک آوازیں۔ میرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کی آنکھیں بھر آئیں اور میں نے ان کی

پلکیں چوم لیں اور دل پر ہاتھ رکھے نہر کی پٹڑی پٹڑی چل پڑا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بابل کی گلیاں واقعی ایک دن سپنا بن جائیں گی اور پھر کبھی ان کی زیارت نصیب نہ ہو گی تو میں بھاگ کر ان لڑکیوں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتا اور کہتا پیپل تلے جدائی کے گیت گانے والی بچیو! اپنے گھروں میں چھپ جاؤ۔ ایک دن یہ گلیاں ہی نہیں، تمہارے بابل بھی تمہیں سپنا ہو جائیں گے اور پھر کسی گھر کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر خوب روتا ساری عمر کے آنسو ایک ہی دن میں ختم کر دیتا۔ کیا خبر تھی وہ دن بھی آئیں گے جب غم کے پیالے میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپک سکے گا۔ تمام درخت اجنبی اور ساری گلیاں ویران ہو جائیں گی۔ کوئی ہمیں نہ پہچانے گا، کوئی بانہیں پھیلا کر ہمیں اپنی طرف نہ بلائے گا۔ میں ان گلیوں میں کبھی چاند کے ساتھ سوتا اور سورج کے ساتھ بیدار ہوتا تھا۔ مگر آج اس نگری پر چمکنے والے چاند نے مجھے بلایا اور نہ طلوع ہوتے ہوئے سورج نے آنکھ ملائی۔ جن پر بھروسہ تھا، مان تھا، وہ اکیلا چھوڑ کر چل دیئے۔ اک تارے والا فقیر سچا تھا وہ پیپل تلے گانے والی لڑکیاں بھی سچ کہتی تھیں جانے اب وہ کہاں ہوں گی۔ جانے اپنی سہیلی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے والیوں کو خود بھی دلہن بننا نصیب ہوا ہو گا یا نہیں۔ کیا خبر ان میں سے کتنی پاکستان پہنچ سکی ہوں گی اور کتنی ضلع جالندھر یا ضلع امرتسر میں نیم کے درخت تلے چارپائی پر بیٹھی روڑھ سنگھ یا کشمیرا سنگھ کے بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں گی۔

امرتسر! امرتسر! یہ تو نے ہم سے کس جنم کا بدلہ لیا رے؟

رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت جگانے والوں کی ٹولیاں آیا کرتیں۔ گلی کے موڑ پر نعت گانے کی آواز سنائی دیتی تو میں لحاف سے نکل کر کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا۔ باورچی خانے میں امی پراٹھے بنا رہی ہوتیں اور آپا چائے کا پانی گرم کر رہی ہوتی۔ امی مجھے دہی لانے کے لئے بھیج دیتیں۔ میں برتن ہاتھ میں لئے گلی میں نکل آتا اور ڈھول یا کنستر بجا بجا کر جگانے والوں کے قریب کھڑا ہو کر انہیں بڑے شوق سے دیکھا کرتا۔ یہ احساس کہ تمام گلی جاگ رہی ہے۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ پکایا جا رہا ہے میرے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دیتا اور میں خوشی خوشی حلوائی کی دوکان کی طرف چل پڑتا۔ کسی گھر سے لکڑیوں کے توڑنے، کہیں سے برتنوں کو دھونے اور کہیں سے دہی بلونے کی زندگی بخش آوازیں آ رہی ہوتیں۔ گاما ٹپ گر دوکان کا ایک پٹ کھولے حقے کے لئے آگ جلا رہا ہوتا۔ قاندرو کے تنور میں آگ کے شعلے

چھت کو چھو رہے ہوتے۔ انور کے مکان میں بھی اوپر والی منزل میں روشنی ہو رہی ہوتی۔ آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا ہوتا اور تاروں کی چمک دیک آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی ہوتی۔ کھتاں انور کے مکان کی ممٹی کے اوپر آ گئی ہوتیں۔ سحری کھا کر میں اور میرا چھوٹا بھائی ہم دونوں دیواروں پر لگے ہوئے فلمی اشتہار اتارنے نکل جاتے۔ ہم ان اشتہاروں کو بڑی جانفشانی سے دیواروں درختوں اور بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر اتارتے اور پھر گھر آ کر ان میں سے مس سلوچنا، مادھوری اور مس کجن کی تصویریں کاٹ کر الگ رکھ لیتے۔ جس روز اشتہاروں کا پروگرام نہ ہوتا تو ہم کمپنی باغ میں مٹر گشت کرنے آ جاتے۔ یہاں ہمیں ہمارے دوسرے ساتھی بھی مل جاتے اور ہم گراؤنڈ والے مشہور درخت پر جٹ برہمن کا کھیل کھیلتے۔ جب تھک جاتے تو حوض کے فوارے کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیتے اور پھر روزہ ٹوٹ جانے پر خدا سے معافیاں مانگنا شروع کر دیتے۔ لاوا ہمارا ایک یار ہوا کرتا تھا۔ وہ جلدی سے بول اٹھتا "بھول کر کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔" یہ لاوا بڑا شیطان کی ٹونٹی تھا۔ ایک روز میرے منہ میں پاسنگ شو کا سگریٹ رکھ کر سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا:

"میں نے مولوی سے پوچھ لیا ہے۔ سگریٹ پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا"

عید میلاد النبیؐ کے دن جو جلوس ہماری گلی سے نکلتا اس کا جھنڈا میرے سپرد ہوتا۔ میں صبح صبح ہی سرخ ہلال پرچم لے کر گلی کے وسط میں آن کھڑا ہوتا۔ دوسرے لڑکے ہمیشہ مجھے رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ہمارا جلوس محلے سے نکل کر انجمن پارک میں جا کر شہر کے دوسرے جلوسوں کے ساتھ مل جاتا اور پھر تمام جلوس ایک قافلے کی صورت میں سکتری باغ کی طرف روانہ ہو جاتے، جہاں شام کو دال اور نان بٹتے اور ایک زبردست جلسہ ہوتا تھا۔

ہمارے مکان میں آنگن والی دیوار پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور زمین پر دیوار کے ساتھ ساتھ نیاز بو، موتیا اور رتن جوت کے گملے بہار دیا کرتے۔ دادا جان ان پودوں کی بڑی خبر گیری کیا کرتے۔ وہ ان کے پاس دری کے ایک پرانے ٹکڑے پر مہاتما بدھ کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھے رہتے اور پھول پتوں کو چڑیوں کی نوک جھونک سے بچایا کرتے۔ کبھی موج میں آ کر سی حرفی ہدایت اللہ کے بیت گنگنانے لگتے۔ اتوار کو وہ ہمیں ساتھ لے کر ریلوے لائین کے پار بامبی پر سیر کو لے جاتے۔ خود ہنسلی دری بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہم

کھیتوں میں پتنگ اڑاتے اور ہرے ہرے، بسنتی اور سرخ پتے جمع کیا کرتے جو پتے درختوں پر سے ٹوٹ کر دادا جان کے پاس گرتے انھیں وہ بھی سنبھال کر رکھ لیتے اور جب ہم کھیل کود سے واپس آتے تو ہم تینوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیتے۔ وہ بڑے ہنس مکھ اور درویش منش تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی بات پر رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے۔ چائے کے بڑے رسیا تھے اور اسے بالکل بچوں ایسی شوق اور دلچسپی سے پیتے، خالی پیالی بڑے آرام سے زمین پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے سفید مونچھوں کو پونچھتے اور کہتے:

"واہ بھئی روح خوش کر دیا"

ایک رات سردیوں میں بارش ہوئی۔ میں کمرے میں لیمپ کی روشنی میں بیٹھا میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ بڑی سخت سردی تھی۔ دادا جان میرے قریب ہی چارپائی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بارش کا کپکپی طاری کر دینے والا پراسرار شور سنائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بارش ہلکی ہو گئی اور پھر بالکل بند ہو گئی۔ میں نے کتاب بند کی اور اٹھ کر باہر دالان میں آ گیا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ غسل خانے کے چھپر پر سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپا ٹپ گر رہا تھا۔ گلی کے پرنالے ابھی تک بہہ رہے تھے۔ آنگن کا فرش دُھل گیا تھا۔ سامنے انور کا مکان بارش کے بعد اندھیرے اور پالے میں ٹھٹھر رہا تھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں نے دیکھا۔ انور اپنی چارپائی پر لحاف میں گرم ہو کر سو رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر ہے۔ دوسرا گال کے نیچے ہے اور آنکھیں بند ہیں اور سوئے ہوئے گرم کنوارے بدن میں ہلکی ہلکی خوشبودار آنچ سی اٹھ رہی ہے۔ اتنے میں اندر سے دادا جان کے گانے کی آواز آئی۔

نکیاں نکیاں پون پھواراں
اِکناں دیاں نے موج بہاراں
جندے پل پل بھئی جاناں
بھئی جاناں ہو
ہری پور نور پور ٹھنڈیاں چھاواں
پل پل بھئی جاناں ہو

ہری پور نور پور ٹھنڈیاں چھاواں
پل پل بھئی جاناں ہو

سرد بادلوں میں لپٹی ہوئی مرطوب سیاہ رات، سناٹا، سائبانوں پر سے پانی کے قطروں کے گرنے کی ٹپاٹپ، سنسان گلی، خاموش اونگھتے مکانوں کے گرم کمرے اور ان کمروں میں دلہنوں کے دھڑکتے سانسوں کی مہک اور کمیٹی کے لیمپوں کی دھندلی روشنی میں چمکتا ہوا گلی کا فرش---- میرے دل کو جیسے کسی نے اپنی پرسکون گرم چھاتی سے لگا لیا اور میرے ہونٹ کسی دردانگیز خوشی اور ایک بے نام سے انجانے غم اور دور دراز کی اجنبی سوچوں کے زیرِ اثر کپکپانے لگے۔ وہ ہری پور، نور پور کہاں ہیں، جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہے اور جہاں آم کی ٹہنیوں پر وساکھ میں میٹھا رس ٹپکتا ہے اور کیسری رنگ کے پھولوں کے کھیت ہیں اور بانسوں کے جھنڈ اور گیندے اور چنبیلی کی شاخیں ہاتھ کے اشاروں سے اپنی طرف بلاتی ہیں۔ کیا پھر کبھی ان جنگلوں میں ہم صحرا نوردوں کا گذر نہ ہو گا، کیا پھر کبھی راتوں کو بارش نہ ہو گی؟ پھر کبھی درشن نہ ہوں گے----؟

آج اتنے سالوں کے بعد جب پرانی یادوں کے دھندلے سمندروں میں کھوئے ہوئے موتیوں کی تلاش میں نکلا ہوں تو میری آنکھیں بند ہیں اور ان پر جھکی ہوئی پلکیں چنار کی خشک پتیوں کی طرح کانپ رہی ہیں، جو خزاں کی بارش میں اپنی ڈالیوں سے لپٹ گئی ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی دکھی عورت گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں جا کر اپنے جہیز کا صندوق کھولے، اپنی شادی کا پرانا عروسی جوڑا نکال کر اسے حسرت ناک نگاہوں سے دیکھے اور پھر اس میں منہ چھپا کر جی بھر کر روئے---- کہاں چھپ گئے وہ حنا کی خوشبو میں بسے ہوئے، ریشم کی ڈوری میں پروئے ہوئے پھولوں کی سیج پر سوئے ہوئے چمکتے، دمکتے، روشن اور پر مسرت دن؟ جب خاوند کی باہیں گلے میں حائل ہوتی تھیں، ساس اٹھتے بیٹھتے بلائیں لیتی تھی اور نندیں آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں ------ وقت کی بھٹی نے ان گرمجوش دنوں کی ساری چمک، ساری آنچ اپنے اندر جذب کر لی ہے اور راکھ زندگی کے دامن میں پھینک دی ہے۔ اب وہ پہلی کوئی بات باقی نہیں اب ساس صبح شام پاؤں دبواتی ہے اور نندیں خوشامدیں کرواتی ہیں اور خاوند ذرا ذرا سی بات پر جھڑک دیتا ہے اور بچے روتے ہیں چلاتے ہیں اور اس کی بوٹیاں توڑتے ہیں۔

ہے بھگوان! ہے رب العالمین! ہے خدا!

کیا پھولوں کا منہ چوم کر گزرنے والے جھونکے اب کبھی اس گلی سے نہ گزریں گے؟

کیا ٹوٹ کر گرا ہوا پتا اب کبھی اپنی ڈالی پر واپس نہ جائے گا؟ کیا اب بے درد آندھیوں کے جھکڑ اسے تپتے ہوئے، اجڑے ہوئے، بنجر میدانوں میں اڑاتے پھریں گے اور پہاڑوں پر چپ چاپ گرنے والی برف! وادیوں میں اترتے سمے تیرے آنسو کیوں نکل آتے ہیں؟ کیا تجھے بنفشہ کے ان بسنتی شگوفوں کا خیال آجاتا ہے جنھیں تو گل مرگ کی ڈھلانوں پر دفن کر آئی ہے یا ان پردیسیوں کی یاد آجاتی ہے، جو تیری اندھیری گھاٹیوں میں لاپتہ ہو گئے؟ تو جب پہاڑوں کی بلندیوں پر گری تو برف کی پاکیزہ کلی تھی اور جب ہماری گلیوں میں آئی تو آنسوؤں کی جھڑی تھی تو پھول بن کر کوہساروں پر گرتی اور آنسو بن کر ہمارے آنگن میں ڈھلک آتی۔ کیا تجھے خبر تھی کہ ایک دن ہم اپنے گھروں کے صحن سونے کر جائیں گے، اپنی گلیوں سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر جائیں گے اور اپنے مکانوں کی سیڑھیوں، ڈیوڑھیوں، دروازوں اور کھڑکیوں سے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ تو نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ ہم ساری زندگی ایک ہی دن میں اپنے وطن کی گلیوں میں بسر کر دیتے۔ ہم ہر صبح کا استقبال دونوں بازو پھیلا کر کرتے اور ہر رات کو ایک لاکھ مرتبہ چوم کر رخصت کرتے۔ ہم گرمیوں کی اداس دوپہروں کو اپنے دل میں جگہ دیتے اور چاندنی راتوں کو اپنی آنکھوں میں بٹھلاتے، ہم غروب ہوتے وقت بھی سورج کا ساتھ نہ چھوڑتے اور اس کی سمٹتی ہوئی قرمزی کرنوں کی جھالر تھام کر مغرب کی لالہ زار وادیوں میں اتر جاتے اور صبح دم اس کی پہلی کرن کے ساتھ زرتار موتیوں کا ہار پہنے طلوع ہوتے اور شبنم کے آنسو بن کر پھول پھول پر، کلی کلی پر، کانٹے کانٹے پر گرتے۔ لیکن تو نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ بس روتی ہی رہی، گرتی ہی رہی۔ جب بھی ہمارے گھر آئی روتی ہوئی آئی اور آنسو پونچھتی واپس گئی۔ تجھے یاد ہے ایک دن میں غلطی سے کمپنی باغ والی نہر میں انور کے اوپر کود پڑا تھا۔ اگر مجھے اس ہمیشہ کی جدائی کی اس وقت خبر ہوتی تو میں نہر سے پھر کبھی باہر سر نہ نکالتا۔ نہر میں نہاتی ہوئی انور کے نیم عریاں ٹھنڈے اور گرم جسم پر گرنا جنت اور دوزخ میں بیک وقت چھلانگ لگانا تھا۔

میں اس پھول، خوشبو اور شبنم کی پھوار اڑاتے شعلوں کی چتا پر سے پھر کبھی نہ اٹھتا بلکہ ان خواب انگیز یادوں کے ساتھ ہی ستی ہو جاتا۔ اسی طرح ان صندلیں شعلوں سے لپٹ کر

سو جاتا اور جب سردیوں کی کسی نیلی سیاہ رات کو نہر کا پانی خشک ہوتا تو لوگ دیکھتے کہ جہاں میں گرا تھا وہاں موتیے کی ایک سفید کلی مسکرا رہی ہے۔ ---

لیکن تو نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تیرے ہونٹ منجمد رہے اور زبان پر تالا پڑا رہا۔ پہاڑوں کی سنگدل برف! تیرا خون کس قدر سفید ہے! تو نے ہمیں خون کے آنسو رلایا ہے۔ تو بھی عمر بھر روتی رہے گی، کبھی ترائی کی چٹانوں پر اور کبھی دامن کوہ کے غاروں میں منہ چھپا کر...... ہم نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں لیکن تیرے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ او کور چشم سرد مہر برف!

چھہرٹہ پیچھے رہ گیا تھا۔

اور اب ہماری بس پتلی گھر کی آبادی میں سے گزر رہی تھی۔ چوک میں اسی طرح گنے بک رہے تھے اور آرڈیننس ڈپو کے باہر دروازے پر سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ دیواروں پر جابجا فلموں کے اشتہار چسپاں تھے۔ اب ریگو برج سامنے نظر آنے لگا۔ ایک سکھ لڑکا پل کے جنگلے پر جھکا نیچے شنٹ کرتی ریل گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی میں بھی اسکول سے بھاگ کر اس پل پر آکر ریل گاڑیوں کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اسٹیشن آگیا۔ امرتسر اسٹیشن --- میں ایک ایک درخت، ایک ایک عمارت، ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب کچھ وہ نہیں تھا۔ سب چیزیں ویسی تھیں، لیکن ایک بھی چیز ویسی نہ تھی، پرنس ہوٹل، سٹیشن کی ڈیوڑھی، تانگوں کا اڈہ، سامنے والی سرائے، پیپل کا گنجان درخت، گھوڑوں کی لید، مزدوروں کا شور، بالکل وہی، بالکل وہی --- بالکل مختلف وہی ماتھا، بالکل مختلف وہی ہاتھ، وہی پاؤں، وہی بال، وہی آنکھیں --- مگر آواز نہیں حرکت نہیں، چہرے پر چمک نہیں، آنکھوں میں نور نہیں، باغ والی مسجد کے مینار کالے پڑ گئے ہیں اور گنبد کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور ایک طرف دراڑیں نمودار ہو گئی ہیں اور اس دم توڑتی ہوئی نیلی لاش کے ہونٹ کچھ کہہ رہے ہیں، کچھ کہنے کے لئے ہل رہے ہیں لیکن آواز نہیں، صدا نہیں، زندگی نہیں، حرارت نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں......!

بس سڑک کنارے سائبان تلے رک گئی۔ گوالیاری جامن والی نے گھوم کر اپنے میاں کو دیکھا۔ میاں نے ہاتھ سے اترنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ نیچے اترنے لگے۔ کیلے بیچنے والے

یہاں بھی آ گئے۔

"ہری چھیل ماراج! پیسے ہندوستانی یا پاکستانی---"

اور یہاں بھی لوگوں نے سب سے پہلے کیلے کھائے۔ اور پھر سامان اُتروا دیا پھر بیگم صاحبہ نے یہاں بھی اپنے بچوں کی فوج میں کیلوں کا راشن تقسیم کیا اور خود ایک کیلا چھیل کر اسے برقعے کے اندر کھانے لگیں۔ رکشا والا بھاگ کر میرے پاس آیا۔

"رکشا بابو جی۔"

"نہیں بھائی! ہم ایک مدت بعد اپنے وطن کے روضہ کی زیارت کو آئے ہیں۔ ہم اس کی گلیوں میں پیدل چلیں گے، ننگے پاؤں چلیں گے۔" میں نے سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پیدل ہال بازار کی طرف چل پڑا۔ وہی سڑک تھی۔ اسی طرح دو رویہ پیپل کے درخت کھڑے تھے اور ان کے نیچے کھڑے ہوئے فٹ پاتھوں پر میلے کچیلے چھابڑی فروش ریوڑیاں، چنے اور بھلے پکوڑیاں بیچنے والے مکھیاں اڑا رہے تھے۔ سیڑھیوں والے پل کی پہلی سیڑھی ایک طرف سے اسی طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ دوسرا بڑا پل آ گیا۔ ڈھلان پر بائیں جانب کبھی ہرا بھرا باغ ہوا کرتا تھا۔ اب یہ باغ اجڑ گیا تھا اور اس کے فوارے میں خشک اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ انجمن پارک میں میوہ منڈی بن گئی تھی۔ یہاں ہم سردیوں میں کرکٹ میچ اور گرمیوں میں گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ اب بوسیدہ جھکے ہوئے پرانے کھوکھوں کی قطاریں کبوتروں کی کابکوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ بدرو میں گندگی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ہال گیٹ کی گھڑی ویسے ہی تھی۔ صرف نیچے جہاں فوارے ہوا کرتے تھے اب وہاں جنسی اور جاسوسی کتابوں کی ڈربہ نما دکانیں تھی۔ دروازے میں سے ہندو سکھ عورتیں اور مرد آ جا رہے تھے ہر مرد عورت اور لڑکی کا چہرہ ایک ہی جیسا زرد، بے جان اور سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ ہال بازار بہت جلدی آ گیا تھا اور پہلے سے تنگ اور پھیکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میری نظر اسے دیکھتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ وقت اور فاصلہ سمٹ گیا تھا اور میں آٹھ سال پہلے کے امرتسر کو آٹھ سال بعد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھوا کر جب رجسٹر پر پاسپورٹ کا نمبر درج کروانے لگا تو دل کو ایک دھکا سا لگا۔ میں اتنا اجنبی، ناواقف اور بے یار اپنے وطن میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر میں بازاروں کی مٹر گشت کرنے نیچے اتر آیا۔

مسجد خیر الدین میں جھانک کر دیکھا۔ حوض میں گھاس اگ رہی تھی اور صحن میں دو لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ چوک گول ہٹی آ گیا۔ دکانیں روشنیوں کے باوجود ویران، اندھیری اور اجڑی اجڑی تھیں۔ مسجد جان محمد کے ایک مینار پر پیپل کی شاخ اگ آئی تھی۔ یہ ہمارا محلہ تھا۔ اس مسجد کی ٹونٹیوں سے پانی پی کر کئی بار میں نے روزہ توڑا تھا۔ اب اس کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور غسل خانوں کی چھتیں ڈھے گئی تھیں اور حجرے میں دیا جل رہا تھا اور دو تین گندے کپڑوں والے کشمیری باتو بیٹھے چائے پکا رہے تھے۔ کوتوالی کی بڑی ڈیوڑھی کے باہر کمیٹی کے لیمپ تلے ایک جوتشی مہاراج بیٹھے تھے اور ایک بوڑھے لالے کا ہاتھ دیکھ کر کہہ رہے تھے!

"بس تھوڑا ہی کشٹ رہ گیا ہے لالہ جی۔"

میونسپل لائبریری کے سامنے والے باغ میں کمیٹی کا دفتر بن گیا تھا۔ جہاں اب زرد رنگ کے پتھروں والی سرکاری پیشاب گاہ تھی وہاں پہلے فالسے کے چھوٹے چھوٹے درخت ہوا کرتے تھے اور بڑ کا ایک گھنا پیڑ ہوتا تھا، جس کی چھاؤں میں پرانی قسم کا ایک بڑا سا بنچ بچھا رہتا تھا۔ میں گرمیوں کی جھلسا دینے والی لمبی لمبی دوپہروں میں کبھی کبھی دادا جان کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ دادا جان بنچ پر بیٹھے اونگھا کرتے اور میں بڑ کے گرے پڑے پتے جمع کیا کرتا۔ کبھی کوئی بھولی چڑیا دادا جان کے کندھے پر آ کر بیٹھ جاتی تو میں خوشی سے چیخنے لگتا۔

"دادا جان پکڑلیں، پکڑلیں---"

لیکن اب وہاں کوئی درخت اور کوئی بنچ نہ تھا اور کوئی بھولی چڑیا کسی کے کندھے پر آ کر نہ بیٹھتی تھی۔ یہاں سے میں واپس ہوٹل آ گیا۔ میں اپنی گلی کی زیارت صبح کرنا چاہتا تھا۔ جب سورج طلوع ہو چکا ہو اور مکانوں کی منڈیروں پر سنہری دھوپ چمک رہی ہو۔ رات کو چترا ٹاکیز میں فلم "دیوداس" دیکھنے گیا۔ کبھی اس سینما کا نام پرل ٹاکیز تھا اور یہاں نور دین نامی ایک گیٹ کیپر ہوا کرتا تھا۔ نور دین ہمارے محلے میں رہتا تھا۔ میں دوسرے تیسرے شام کو اس کی روٹی لے کر سینما جایا کرتا تھا اور اس بہانے فلم دیکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کس طرح میں شام ہوتے ہی نور دین کے گھر جا کر اس کی بیوی کے پاس بیٹھ جاتا جو روٹی پکا رہی ہوتی تھی۔ میں ٹکٹ لے کر اندر آ گیا۔ ہال میں رش بالکل نہیں تھا۔ لیکن چھابڑی والوں نے چیخ و پکار سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ فلم ختم ہوئی تو میں رکشے میں بیٹھ کر

ریالٹو سینما کی طرف چل پڑا۔ بہت عرصہ گزرا جب یہ سینما بن رہا تھا تو ہم چھوٹے چھوٹے تھے اور سکول سے بھاگ کر اس کی زیر تعمیر عمارت دیکھنے آیا کرتے تھے۔ رکشا الیگزنڈرا پارک کے قریب سے گزر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں گراؤنڈ کے کناروں والے آسم کے درخت زیادہ گنجان دکھائی دے رہے تھے۔ بینگو پارک میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس پارک میں دادا جان کے ساتھ کرکٹ میچ دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ کھلی ہوتی۔ پارک میں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ لنچ کے وقفے میں ہم مالٹے، سنگترے اور مولیاں کھاتے، پھول توڑتے اور خوب اودھم مچاتے۔ میں نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا اور پارک میں دیکھا کہ دھوپ چمک رہی ہے۔ بینگو پارک کے آسم کے درخت ہوا میں جھوم رہے ہیں اور ایک لڑکا سر پر کاغذ کی بناوٹی ٹوپی رکھے سوکھی ہوئی نہر کے پل پر بیٹھا مولی کھا رہا ہے اور میچ زور شور سے ہو رہا ہے اور لوگ اچھل رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں اور ایک آدمی گراؤنڈ میں بلا تھامے ادھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ اور پھر ایک دم اندھیرا چھا گیا اور بینگو پارک نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، دور ہو گئی بہت دور ہو گئی۔

ریالٹو سے ایک بجے رات واپس آیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔

پچھلے پہر آنکھ کھل گئی اور غیر شعوری طور پر اذان کا انتظار کرنے لگا اچانک خیال آیا امرتسر میں اذان نہیں ہوتی۔ یوں لگا جیسے ایک غیر ملک میں ہوں جہاں کی بول چال اور رسم و رواج سے بالکل ناواقف ہوں۔ بتی جلا کر گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے بستر سے اٹھا، سفید بوٹ پہنا مفلر اوڑھا اور سیر کرنے، پرانے مندروں کے درشن کرنے چل پڑا۔ آسمان پر ستارے کانپ رہے تھے۔ سردی بہت ہو گئی تھی اور گلیاں بازار بالکل سنسان تھے۔ امرتسر بڑا اکیلا اکیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے بازار میں سے گزر کر جب گلی کے سامنے آیا تو دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نہیں۔۔۔۔۔ ابھی نہیں! میرے دل! میرے دل!!

گلی کا دروازہ اکھڑ گیا تھا اور بجلی کے دونوں کھمبے آمنے سامنے ویسے ہی کھڑے تھے۔ پچھلے پہر کے دم توڑتے پھیکے کافوری دھندلکے میں دونوں جانب اونچے نیچے بینگے ٹیڑھے خاموش مکان یوں لگ رہے تھے جیسے افسردہ دل لوگ سر جھکائے کسی جنازے کے گزرنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ خشک ہوا کا ایک دکھ بھرا جھونکا سرد آہ بھرتا ہوا میرے پاؤں چھو کر گزر گیا۔ میں اپنی گلی میں داخل نہ ہو سکا۔ بلکہ عقبی بازار میں سے گزرتا ہوا شہر سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر مشرق کی جانب پوپھٹ رہی تھی اور آسمان پر ستارے بالکل پہلے کی طرح صبح کے ابھرتے ہوئے نورانی اجالوں میں بھڑک بھڑک کر ماند پڑتے جا رہے تھے۔ سرد ہوا میں اسی طرح درختوں اور سبزے کی تازگی اور کھلی فضا کا شگفتہ پن تھا۔ یہی وہ ہوا تھی۔۔۔۔۔

ہاں یہی وہ ہوا تھی جو چیت بیساکھ کی صبحوں کو مونگرا اور چنبیلی کی ٹھنڈی میٹھی خوشبو اڑاتی مجھے جگانے ہمارے گھر آیا کرتی تھی جو میرے کانوں کے ہونٹ چوم کر سرگوشیوں میں کہا کرتی تھی جاگو جاگو! میرے پیارے! شہتوت کے گھنیرے پیڑوں میں سوئی ہوئی چڑیاں جاگ اٹھی ہیں۔ شہد کی مکھیاں میٹھی گنجاروں کے ساتھ رس کی تلاش میں اپنے اپنے چھتوں سے اڑ گئی ہیں اور لیموں کے پھولوں سے لدے ہوئے درختوں تلے کچی پگڈنڈیوں کے کناروں پر اگا ہوا گھاس صبح کی شبنمی ہوا میں لہرانے لگا ہے۔ تم بھی جاگو! صبح ہو گئی ہے، صبح ہو گئی ہے،۔۔۔ ہمیں درختوں، پھولوں، چڑیوں اور پگڈنڈیوں نے تجھے بلانے بھیجا ہے۔۔۔ اور میں اس مہکیلی ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ ساتھ اڑتا ہوا ان باغوں، کھیتوں اور کھلے میدانوں میں آ جاتا تھا۔

میں آج بھی انہی میدانوں، کھیتوں اور باغوں کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن آج مجھے کسی ہوا کا جھونکا جگانے نہیں آیا تھا۔ آج کسی چنبیلی کی خوشبو نے میرا منہ چوم کر مجھے نہیں اُٹھایا تھا۔ بلکہ آج میں اپنے آپ ہی ہوٹل میں بسر کی ہوئی پردیسی رات کے ناواقف بستر پر سے اٹھ کر اس طرف نکل آیا تھا۔ ویر کے والے پھاٹک کے پاس پہنچ کر مشرق میں صبح کا سنہری اُجالا جھلملانے لگا اور تاروں کے فانوس ایک ایک کر کے بجھنے لگے۔ بٹالہ جانے والی ریلوے لائن اُسی طرح بچھی ہوئی تھی۔ میں لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور جب اُس نالے پر آیا، جس کے ایک طرف چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ گاؤں۔۔۔ اب بھی وہاں موجود ہے۔ لیکن وہ پیپل کا درخت غائب ہے، جس کے نیچے ایک رات دیہاتی لڑکیوں نے پر درد گیت گایا تھا اور دلہن کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

تجھے بابل کی گلیاں سپنا ہو جائیں گی۔
او شہر میلی دُلہن!

جامن کے درختوں میں سے بلند ہوتے ہوئے کائی زدہ مسجد کے مینار دھوئیں کے ستون معلوم ہو رہے تھے۔ سامنے محراب پر لگی ہوئی پاتھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

بعض کوٹھوں پر جنگلی گھاس اُگ رہی تھی اور جو ڈھے گئے تھے ان کے ملبوں پر گندگی کے ڈھیروں پر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ہر مکان کی پیشانی پر لال کھریا مٹی سے "اوم" لکھا تھا۔ دوسری جانب جہاں کبھی آلوچے کے باغ ہوا کرتے تھے اب وہاں خانہ بدوش سانسیوں نے اپنے میلے کچیلے پھٹے ہوئے خیمے گاڑ رکھے تھے۔ خیموں کے اوپر کہرا جم رہا تھا۔ ایک جگہ ایک عورت جھاڑو دے رہی تھی اور قریب ہی کوئی کتا بھونک رہا تھا بستی کی جانب ایک مرغ نے اذان دی۔ جی خوش ہوا کہ مرغوں نے ابھی تک اذانیں دینا بند نہیں کیں۔ میں نے ایک کوٹھے کی کچی دیوار میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ آنگن صبح کی سردی میں سکڑ گیا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکشا ٹھٹھر رہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر لال مٹی سے "برچھا سنگھ سردار" لکھا تھا۔ ایک گلہری پھدک کر میرے پاس آئی اور اپنی شریر تھوتھنی اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیوں ری گلہری! اس مکان میں جو وہ کھدر کی چادر اوڑھ کر اپنے خاوند کی روٹی اور لسی کھتیوں میں لے جانے والی رہا کرتی تھی وہ کہاں چلی گئی ہے؟" گلہری نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پردیسی! اُس عورت کو میں نے اُن کھیتوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کا دوپٹہ سر سے گرا ہوا تھا اور چہرے پر موت ایسی زردی تھی اور قمیض جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی اور اس کے بعد میں نے اُسے پھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے زمین سے ایک سوکھا ہوا پتا اٹھا کر دیوار پر رکھا اور آگے چل پڑا۔

ندی کے دوسرے چھوٹے پل پر آیا تو مشرق کی جانب صبح کی روشنی تیزی سے بڑھنے پھیلنے لگی اور آسمان پر سورج کی اولین ملگجی کرنوں کا غبار اڑنے لگا۔ ہوا شبنم کی نمی سے مرطوب اور بوجھل تھی۔ اب لوکاٹ کے باغ شروع ہو گئے۔ باغ اسی طرح تھے اور گھرے سبز درختوں کے درمیان لوکاٹوں کے کیسری گچھے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ ہر پیڑ چوڑے چوڑے پتوں والی شاخیں پھیلائے صبح کی خوشبو اور تازگی سے لبریز ہوا اور مشرقی کناروں سے جنم لیتی ان چھوئی، پاکیزہ روشنی میں گویا مراقبے میں گم تھا۔ نیچے نالے کا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ میں نے آٹھ سال پہلے لوکاٹ کے ایک کیسری گچھے کو دیکھا تھا جو اپنی ٹہنی کی منڈیر پر سے جھک کر بہتے ہوئے پانی سے کہہ رہا تھا!

ہم سے پیار بڑھا لے! او گزرتے ہوئے پانی!

میں نے بھی اسی پانی کی ایک لہر سے پیار کا ناطہ جوڑ لیا تھا اور پانی کی چنچل، الہڑ اور نادان لہر مجھے بھول کر سمندر سے جا ملی ہے اور میں خاک اڑاتی بنجر زمینوں پر اکیلا کھڑا اُسے یاد کر رہا ہوں

ندی کی دوسری جانب اُسی طرح گندے جوہڑ پر کہرا جم رہا تھا اور کھاد کے ڈھیروں میں سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ اب لوگ بستی کے کچے مکانوں میں سے باہر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ میں پٹڑی پٹڑی کمپنی باغ کی طرف ہو لیا۔ اب سیدھے ہاتھ کو مولیوں اور ساگ کی کھیتیوں کے پار ناخوں کے درخت دکھائی دینے لگے۔ یہ درخت چھریرے اور دُبلے پتلے تھے اور فضا میں انگلیوں کی طرح اُٹھے ہوئے تھے۔ سیاہ ٹہنیوں پر سے پتے جھڑ چکے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے اُن کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک سرخ پتا توڑ لیا۔ پتا شبنم میں بھیگ رہا تھا رات اُس پر اپنے آنسوؤں کے نشان چھوڑ گئی تھی۔ کیا یہاں بھی راتیں رویا کرتی ہیں؟ کیا ہم انہیں یاد آتے ہیں؟ میں نے رات کا پریم پتر اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب دوبارہ نہر کی پٹڑی پر آیا تو میری آنکھیں سورج سے چار ہو گئیں۔ جاڑوں کا گہرا سرخ کانپتا ہوا، لرزتا ہوا، پگھلتا ہوا، بیضوی سورج آم کے درختوں کے سیاہ تنوں کے درمیان میں منڈیروں، درختوں کی پھنگوں اور گھاس کے خوشوں کے منہ لال ہو گئے۔ آٹھ سال بعد ان درختوں، کھیتوں اور باغوں میں سورج دیوتا کو طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی شان، اُسی آب و تاب اور اُسی جاہ و جلال کے ساتھ سونے کے رتھ پر سوار کرنوں کا صور پھونکتا اوپر اٹھ رہا تھا۔ اُس کی ایک بھی کرن تقسیم نہ ہوئی تھی۔ ایک بھی شعاع میلی نہ ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ اُسی طرح تھا۔ روشن، دمکیلا، تابناک، اور عظیم --- اُس کی نورانی، فراخ دل اور آزاد کرنیں، برچھا سنگھ کے گھر کے آنگن اور مسجد کے زنگ خوردہ میناروں پر اُسی بے نیازی اور خندہ پیشانی سے رقص کر رہی تھیں۔

اک شوخ کرن شہتوت کی ٹہنی پر آ کر ٹھٹھک سی گئی اور مجھے سنہری پلکیں جھپکا جھپکا کر تکنے لگی۔ میں بھی اُسے پلکیں جھپکا جھپکا کر تکنے لگا۔ ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے اور ہمارے چہرے خوشی سے لال ہو کر دمکنے لگے۔ میں نے جھک کر اُس شرمیلی کرن کے ماتھے پر بوسہ دیا اور آگے چل پڑا۔

سورج کی بیٹی کرن! تو ہمیشہ میرے ہونٹوں پر چمکتی رہے گی۔

روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔

اتنے میں ایک سِکھ عورت نہر کی پٹڑی پر نمودار ہوئی اور --- میں نے آنکھیں جھکا لیں اور جلدی جلدی وہاں سے گزر گیا۔ میرے پیارے وطن! تیرا دامن حیا کس نے تار تار کر دیا؟ تیرے سر سے دوپٹہ کس نے کھینچ لیا؟ تیری آنکھوں کی شرم کیا ہوئی جواب تو اپنے بیٹوں کے سامنے ننگا ہو گیا؟

کمپنی باغ میں ضرورت سے زیادہ چل پہل تھی اور لوگ یوں بے دلی سے سیر کر رہے تھے جیسے وہ بیمار رشتہ داروں کی عیادت کو جا رہے ہوں۔ موٹے بھدے، الٹے سیدھے، منحنی اور پستہ قد، ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں اور بے روح، بے جان چہروں والے بیوپاری مشین ایسی پھرتی اور تیزی سے گھاس پر چکر لگا رہے تھے۔ جگہ جگہ پھلوں کے چھلکے، مٹھائیوں کے لفافے اور پوری کچوریوں کے جھوٹے پتے بکھرے پڑے تھے۔ کہیں نہ کہیں کوئی تھل تھل پل پل موٹی للائین ہانپتی کانپتی اپنے آپ کو گھسیٹے لئے جاتی نظر آ جاتی تھی۔ درختوں کے تنوں کے پاس گھاس بڑھ رہی تھی۔ اور روشوں پر اکثر گرد اڑ رہی تھی۔ جس جگہ کبھی موتیے کے بے شمار پودے ہوا کرتے تھے اب وہاں خالی میدان تھا اور ایک طرف پان سگریٹ کا کھوکھا لگا تھا۔ میں اُس جگہ آ گیا جہاں آم کے درختوں کی چھاؤں میں نہر بہہ رہی تھی یہی وہ نہر تھی جس میں ایک دفعہ میں نے انور کے اوپر چھلانگ لگا دی تھی۔ نہر اُسی طرح پر سکون، ہموار اور سست رفتار کے ساتھ بہہ رہی تھی اور کناروں کی جانب تنکے اور پتے چکر کھا رہے تھے۔ درخت کی شاخیں بھی اُسی محبت سے نہر پر جھکی ہوئی تھیں اور فضا میں وہی بھنگ کی جھاڑیوں کی گرم گرم خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ذرا پرے ایک جگہ ایک سردار جی بیٹھے مسواک کر رہے تھے۔ میں نے آم کے کھردرے تنے کو ہاتھ سے چھوا۔ درخت کا جسم اُسی طرح گرم اور سانس لے رہا تھا۔ مجھے انور کا خیال آ گیا۔ سامنے والے پلاٹ میں، جہاں سے ہم صبح کے اندھیرے میں ناخیں اور امرود چرا کر بھاگ جایا کرتے تھے، اب کوٹھیاں بن گئی تھیں۔ جہاں سے ایک موٹر سائیکل شور مچاتی گزر رہی تھی۔

جب میں اُس درخت کے قریب سے گزرا جس پر ہم جٹ برہمن کا کھیل کھیلا کرتے تھے تو اُس نے میری طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ نہیں بھائی! اب وقت نہیں ہے تم سے دکھ سکھ کی باتیں کرنے بیٹھا تو کوئی دیکھ لے گا اور جیل میں ڈال دیا جاؤں گا۔ تمہارا

شہر پولیس کا سپاہی بن کر میرے پیچھے پیچھے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ اب رخصت بھائی درخت!

جامن کے پیڑ نے اپنی ٹہنیاں جھکا کر پوچھا۔ انور، صفیہ، سعیدہ، رضیہ اور محمودہ کیسی ہیں۔؟ میں انھیں اپنے میٹھے جامن گرا کر کھلایا کرتا تھا۔ مجھے وہ ساری کی ساری یاد ہیں؟ کیا میں بھی انھیں یاد ہوں؟ --- جامن کے اونچے درخت! تمھیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ وہ لڑکیاں تمہیں بالکل بھول گئی ہیں۔ وہ امرتسر کو گوکل کی مارکیٹ سمجھتی ہیں جہاں سے نئے نئے ڈیزائنوں کا کپڑا خریدا جا سکتا ہے انھیں کمپنی باغ کا ایک بھی پھول ایک بھی درخت یاد نہیں رہا۔ رضیہ چھ بچوں کی ماں ہے اور ساتواں پیدا کر رہی ہے۔ سعیدہ کو طلاق ہو گئی ہے اور وہ گھر پر کاپیاں پنسلیں بیچ کر اپنے بچوں اور بوڑھے باپ کا پیٹ پال رہی ہے۔ محمودہ خشک میوہ جات کے ایک تاجر سے بیاہ دی گئی ہے اور پہلے سے زیادہ خشک ہو گئی ہے۔ صفیہ کا بیاہ ایک ٹھیکیدار سے ہوا تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے اتنی موٹی ہو گئی کہ اُس کے خاوند کو دوسرا بیاہ کرنا پڑا۔ اس کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اب وہ پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ اب وہ گھر کی لونڈی ہے اور اپنی ساس، خاوند اور سوت اور سوت کے بچوں کی خدمت کرتی ہے اور روکھی سوکھی کھا کر سو رہتی ہے۔ تمھیں یاد ہے وہ کتنی کھلنڈری ہوتی تھی اور تمہاری چھاؤں میں وہ کتنا شور مچایا کرتی تھی۔ اس کے بلند اور نقرئی قہقہوں کی آواز تم بھولے نہیں ہو گے۔ اب اس کا رنگ زرد ہے، آنکھیں سیاہ حلقوں میں چھپ گئی ہیں اور اب اُسے کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر مکان کی سیڑھیوں، پچھلی کوٹھڑیوں اور دروازوں کی اوٹ میں آنسو بہاتی ہے اور کوئی اُسے تسلی کے دو بول کہنے والا نہیں۔

جامن کے پیارے درخت! میں کبھی انہیں ملا تو تمہارا سلام کہہ دوں گا۔

ہاں ---- انہیں میرا بہت بہت سلام کہنا اور پیار دینا اور کہنا میری بچیو! جہاں بھی ہو، زندہ رہو۔ خدا تمہارے دکھوں کو کم کرے اور تمہارے اچھے دن جلدی لائے تم نے ہمیں بھلا دیا ہے لیکن تمہارا جامن کا درخت تمہیں نہیں بھلا سکا۔ اُسے تمہاری ایک ایک بات یاد ہے۔ وہ راتوں کی غمگین خاموشی میں تمھیں یاد کر کے آہیں بھرا کرتا ہے اور ساون میں جب مینہ برستا ہے تو وہ چپکے چپکے رویا کرتا ہے میری پیاری، شرمیلی، ہنس مکھ اور بد نصیب بچیو!

اگر دھرتی نے میرے پاؤں نہ جکڑ رکھے ہوتے تو میں تمہارے ساتھ ہی یہاں سے کوچ کر جاتا۔ میں ہر سال برسات میں کالے کالے جامنوں سے لدی ہوئی شاخیں جھکائے تمہارا انتظار کیا کرتا ہوں۔ کیا تم پھر کبھی نہ آؤ گی؟

نہیں پیارے درخت! اب ہم کبھی نہ آئیں گے۔ اب ہمیشہ کے لئے الوداع! میں نے جامن کے درخت کو سلام کیا اور وہاں سے چل دیا۔

بکاؤلی کے درخت پر سے میں نے ایک بند پھول توڑ دیا۔ یہ پھول کچا اور چھوٹا تھا۔ میں نے اُسے جیب میں رکھ لیا اور شریف پورے کی طرف آ گیا اگر ریلوے لائن سے شریف پورے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ایک پگڈنڈی پر سے گزرنا پڑتا تھا، جس پر کھٹے کے درختوں نے اپنی چھاؤں کر رکھی ہوتی تھی۔ بہار میں یہ راستہ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو سے مہکا کرتا تھا۔ آج مجھے اس پگڈنڈی پر سے ناک پر رومال رکھ کر گزرنا پڑا۔ سوائے غلاظت اور گندگی کے ڈھیروں کے یہاں اور کچھ نہ تھا۔ کبھی یہ بستی بڑی صاف ستھری اور نویں نکور ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب ہر مکان دوسرے مکان کی حالت پر نوحہ کناں تھا۔ چھجے زیادہ جھک آئے تھے۔ دروازوں پر میل جم رہا تھا۔ کھڑکیوں کا روغن دھوپ اور بارش کھا گئی تھی۔ پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔ کسی ایک کھڑکی پر چق نہ تھی اور ہر کھڑکی اُس آنکھ کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس کی پلکیں غائب ہوں۔ ہر مکان ننگا تھا اور کپڑے اُتارے کسی فاحشہ عورت کی طرح راہگیروں کو گھور رہا تھا۔ رانی بازار کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ گول مسجد میں گوردوارہ تھا اور نیچے گھنشام داس شمشان داس پنساری کی دوکان تھی، جو سیتارام سیتارام کا بھجن گاتا تھڑے پر گائے کے گوبر کا لیپ کر رہا تھا۔ گلی کے وسط میں ایک جوان لڑکی کھڑی میلا سا سویٹر بن رہی تھی اور اپنی ہمسائی سے جو کھڑکی پر ٹانگ رکھے کھڑی تھی کہہ رہی تھی:

"منگ فلی کھاؤ گی شیلا؟---"

وہ خود بھی "منگ فلی" ہی تھی۔ بھنی ہوئی، گرم اور خشک!-- سیتارام! سیتارام!

رانی بازار میں میں نے اپنے کلاس فیلو کو دیکھا کہ اپنی برقع پوش بیوی اور بچوں کو ساتھ لئے ہر مکان کو حسرتناک نگاہوں سے دیکھتا گزر رہا ہے۔ عورت بدحواس سی تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ لگی جا رہی تھی۔ میں شریف پورے سے باہر آ گیا۔ پاتھی گراؤنڈ کو عبور کر کے اور نئی خانقاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اب لال حویلی کی عمارت سامنے تھی اور یہیں سے گزر کر

اپنی گلی میں داخل ہونا تھا۔ لال حویلی کی آدھی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور باقی نصف کی حالت بے حد خستہ تھی۔ منڈیروں پر سوکھی ہوئی گھاس اُگ آئی تھی۔ کھڑکیوں کی چوکھٹیں جلی ہوئی تھیں اور اندھی آنکھوں کی طرح خلاؤں میں تک رہی تھیں۔ کبھی ان کھڑکیوں پر بانس کی نازک چلمنیں پڑی رہتی تھیں اور ان کے پیچھے سرگوشیوں میں باتیں کرنے والی اور میز پوشوں پر خوبصورت پھول کاڑھنے والی شریف زادیاں رہا کرتی تھیں۔ ان کے شرمیلے اور محجوب چہرے سوائے ان کے گھر والوں کے اور کبھی کسی نے نہ دیکھے تھے۔ کہاں چلی گئیں؟ کہاں چلی گئیں؟ میری بہنیں! میری بہنیں!!

اب میں اپنی گلی میں تھا اور دل پر ہاتھ رکھے گلی کے پرانے فرش پر سے گزر رہا تھا۔ گلی میں سردی کی وجہ سے ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے قدموں کی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ ہر مکان جیسے مجھ پر جھکا ہوا تھا اور گلی جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی پچکتی جا رہی تھی۔ چھوٹی اور تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ میری نظر گھبرانے لگی اور ہر مکان جلدی جلدی گزرنے لگا یہ رضیہ کا مکان ہے دروازہ کھلا ہے۔ ڈیوڑھی میں اپلوں کا ڈھیر ہے۔ یہ صفیہ کا مکان ہے۔ اس کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہے اور اندر دیوان خانے میں ایک گائے بندھی ہوئی ہے اس دیوان خانے میں گرمیوں کی دوپہروں کو بڑی رونق ہوتی تھی۔ انور، صفیہ، رضیہ اور محمودہ سب لڑکیاں مل جل کر بیٹھتیں۔ سلائی کا کام کرتیں اور کروشئے کے رومال بُنتیں اور آپس میں خوب ہنسی مذاق کرتیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت فرش دھو رہی تھی۔ کیوں ماتا جی! وہ ستواں، لمبی، تیکھی ناک والی اور ہنس کی چال چلنے والی لڑکی کہاں ہے؟ ماتا جی نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے بائیں جانب دیکھا کہ محمودہ کا مکان غائب ہے اور اس کی جگہ گوبر اور ملبے کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اوپر، سامنے دیوار کے ساتھ آتش دان کی کارنس برہنہ تھی۔ یہاں محمودہ اسکول سے واپس آ کر اپنی کتابیں رکھا کرتی تھی۔ اب وہاں ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ یہ ہمارا مکان ہے۔

میں ذرا ٹھٹک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اپنے مکان سے آنکھیں چار کرتے گھبرا رہا تھا لیکن یہ ہمارا مکان نہ تھا۔ دروازہ اکھڑ چکا تھا۔ سیڑھیاں مٹی کی تہوں میں چھپ رہی تھیں۔ میں اوپر آ گیا۔ اوپر چھت کی بجائے آسمان جھانک رہا تھا۔ سامنے انور کے مکان کی کھڑکی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور چوکھٹ کا سیمنٹ اکھڑ چکا تھا اوپر منڈیر پر آمنے سامنے دو ڈبل اینٹیں پڑی

ہے۔ دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہیں۔ دوزانو ہو کر بیٹھا ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور بڑی رقت کے عالم میں جھوم جھوم کر نعت پڑھ رہا ہے۔ ایک روز ماشٹر نے اسی طرح کے ایک ختم شریف سے واپس دوکان پر آ کر مجھے ایک رقعہ دکھلایا۔ اسکول کی لکیر دار کاپی کے کاغذ پر زیڈ کی نب اور کاپی سیاہی سے بڑے بھونڈے خط میں لکھا تھا:

"بھائی جان رفیق!

سلام و دعا۔ آپ جب ہمارے گھر نعت پڑھ رہے تھے تو میں بھی چق کے پیچھے آپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں تو رو پڑی۔ کیا آپ مجھے یہ نعت نقل کر کے بھیج دیں گے اور طرز بھی اُس کی اچھی سی بنا دیں گے۔ آپ بہت اچھا گاتے ہیں اور ہاں جی --- کھٹی چیزیں نہ کھایا کریں۔"

فقط

نیچے نام نہیں لکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ماشٹر محلے کے ایک مشہور رفوگر کی چھوٹی لڑکی سے عشق لڑا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس لڑکی کی شادی ہو گئی اور ماشٹر سہگل اس حادثے کے بعد ایک عرصے تک اُس کی یاد میں ڈوب کر نعتیں پڑھتا رہا۔

ماشٹر حمید نیو تھیٹرز کی فلموں کا شیدائی تھا اور اُسے دیوداس کے سارے مکالمے اور گانے نوک برزبان تھے۔ وہ دیوداس کا آخری گیت بڑی سیدھی سادی خشک اور پھیکی مگر پرسوز آواز میں گایا کرتا تھا۔ اس کی آواز پر مجھے یوں لگتا جیسے خشک سرکنڈوں میں آگ کا پہلا شعلہ سرسرا رہا ہو۔ ماشٹر، دیوداس کا وہ منظر بڑی رقت بھری آواز میں سنایا کرتا تھا۔ جب ریل گاڑی میں پہلی بار دیوداس خون تھوکتا ہے اور وہ خون دیکھ کر سہم کر نوکر سے کہتا ہے:

"دھرم داس! خون!"

آج ماشٹر حمید لاہور کی ایک گندی اور اندھیری گلی میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ماشٹر سہگل اس دنیا میں نہیں رہا۔ ماشٹر حمید وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو رہا ہے۔ چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئی ہیں۔ پرانے واقف کاروں سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ پانچ وقت کا نمازی ہے اور ہر وقت کا روگی ہے۔ بیمار ہے، پریشان ہے، مفلوک الحال ہے۔ جب کبھی مجھ سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے تو سلام کے بعد سر

جھکا کر گزر جاتا ہے۔ شائد کسی دن مجھے اپنا گریبان کھول کر چپکے سے سینہ دکھلائے اور کھانس کر کہے:

"دھرم داس! خون!"

کبھی کبھی شام کو ہم اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں جا کر چاء پیتے۔ اس ہوٹل کی میزیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور بنچوں میں کھٹملوں نے اپنی چھاؤنیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ اسی ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھ کر میں نے انور کو پہلا محبت بھرا خط لکھا اور جب انور ڈولی میں سوار ہو کر اپنے خاوند کے گھر جانے لگی اُس وقت بھی میں اسی ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ ہوٹل کا مالک رحمان لالہ اوپر جواء کرواتا تھا اور خود اس کی کمیشن پر گزارہ کرتا تھا۔ ہر جمعرات کو وہ ختم شریف کرواتا اور گڑگڑا کر خدا سے اپنے ہفتے بھر کے گناہوں کی معافی مانگتا۔ وہ موٹا، بھدا، اونچا لمبا، بد وضع، بے ڈول پرانا کشمیری تھا اور لوگوں کو میٹھی چاء پلاتا اور خود سبز چاء پیا کرتا تھا۔ بیساکھی کے میلے پر جب گول باغ میں تھیٹر والی کمپنیاں اپنے خیمے گاڑ کر کھیل تماشے شروع کر دیتیں تو رحمان لالہ دو روپے روز پر وہاں جلاد کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ اُس نے ایک دنبہ پال رکھا تھا، جس سے اُسے بڑا پیار تھا۔ ایک روز لوگوں نے دیکھا کہ رحمان لالہ ڈنڈے سے دنبے کو تابڑ توڑ کوٹ رہا ہے کسی نے اُس کی وجہ پوچھی تو ہانپتے ہوئے بولا:

"بہن یاواا، دس روپے کا نوٹ کھا گیا ہے--- نکال باہر تیری ماں کو---" اور پھر دھڑا دھڑ ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔

سردیوں کی دھندلی صبحوں کو منہ اندھیرے ہماری گلی میں ایک فقیر آیا کرتا تھا جو اکتارے پر بار بار یہ مصرعہ گایا کرتا۔

تینوں چھڈ کے کلی نوں ٹُر گیاں

جنہاں دامان کریں۔

اس کی آواز میں بڑا جادو تھا اور میں یہ مصرع سن کر ہمیشہ پژمردہ ہو جاتا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جن پر اتنا مان ہو، اتنا ناز ہو وہ اکیلا چھوڑ کر چل دیں۔ گرمیوں میں وہ بوڑھا درویش آیا کرتا جو صبح صبح گلی میں داخل ہوتا اور ہر مکان کی کھڑکی سے منہ لگا کر یہ شعر تھکی تھکی، کانپتی بوڑھی آواز میں گاتا۔

اُٹھ فریدا سُتیا تیری داڑھی آیا بُور
اگا نیڑے آ گیا تے پچھا رہ گیا دُور

سوچتا ہوں یہ لوگ اب کہاں ہوں گے؟ شاید مر گئے ہوں۔ شاید مار دیئے گئے ہوں۔ شاید زندہ ہوں اور کسی دور افتادہ تکیئے میں اور یا کسی مصری شاہ کے پل کے نیچے چیتھڑوں میں لپٹے، جسم پر بھوک کے گھاؤ اور بیماریوں کے داغ لئے موت کا انتظار کر رہے ہوں۔--- اگا نیڑے آ گیا تے پچھارہ گیا دور۔

کمپنی باغ والی عید گاہ میں جامن کے گنجان درختوں تلے ایک پرانا حوض تھا۔ اس کے گدلے پانی میں مٹیالی مٹیالی مچھلیاں اور جامن کے خاکستری پتے تیرا کرتے تھے۔ برسات کے دنوں میں کالے کالے موٹے جامن دھپ دھپ گیلی زمین پر گرا کرتے یہاں سے قریب ہی چھوٹی نہر کے کنارے کنارے دونوں جانب شہتوت کے بے شمار درخت ہوا کرتے تھے۔ آج یہاں شرنارتھیوں نے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی ایک پوری کالونی آباد کر رکھی ہے۔ اپریل کے دنوں میں جب بہار کا آغاز ہوتا چھابڑی والے یہاں سے شہتوت خرید کر اُسے نہر میں دھو کر چھابڑیوں میں کیلے کے ہرے ہرے پتے لگاتے۔ ان پر لال، ہرے بھرے، قرمزی اور سیاہ شہتوت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بناتے۔ ان پرُ سچے گلاب کے پھول سجاتے اور پھر شہر کی طرف چل پڑتے۔ گلیوں میں صبح صبح ان کی آمد، آمدِ بہار کی دلیل تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شہر سے باہر ناخ کے درخت سفید سفید شگوفوں سے بھر گئے ہیں اور نہر کنارے آم کے درختوں پر خوشبودار سنہرا بور آ گیا ہے اور آلوچے کی ٹہنیوں پر کاسنی کلیاں پھوٹ پڑی ہیں اور طوطوں نے امرود اور رس دار لوکاٹیں کترنا شروع کر دی ہیں۔ پھر میں بھی چھڑی ہاتھ میں لے، نیکر اور قمیص پہنے، سر اور پاؤں سے ننگا باغوں کی مٹرگشت کرنے گھر سے نکل پڑتا اور سارا سارا دن کبھی اکیلا اور کبھی دوستوں کی ٹولی کے ساتھ امرود اور لوکاٹوں کے باغ میں آوارہ گردی کیا کرتا۔ کچے پکے امرود توڑ توڑ کر کھاتا، بلبلوں کے گھونسلے اجاڑتا، گری پڑی سنہری اور کتھئی رنگ کی لوکاٹیں اٹھا اٹھا کر جیبوں میں ڈالتا اور کھیتوں کھیت جانے والی کچی پگڈنڈیوں پر چھڑی ہوا میں لہراتا واپس گھر کی طرف چل پڑتا۔--- ایک جیب میں کچے امرود ہوتے، دوسری میں لوکاٹیں اور نیکر کی جیبیں شہتوت سے بھری ہوتیں اور ننگے پاؤں تلے پگڈنڈی کی مٹی ٹھنڈی ہوتی اور ہوا میں دھریک، نیم اور

لیموں کے پھولوں کی مہک اڑ رہی ہوتی اور رنگ برنگ تتلیاں ہوتیں اور آم کے بور پر منڈلانے والے سیاہ بھونرے ہوتے اور جب نہر آتی تو میں نیکر، قمیص اُتار کر ننگ دھڑنگ نہر میں چھلانگ لگا دیتا اور مزے لے لے کر نہاتا اور ڈبکیاں لگاتا۔

پھر ساون بھادوں کے کالے کالے، مٹیالے اور پانی سے لدے ہوئے مہیب بادل جھوم جھوم کر آتے اور کمپنی باغ، شریف پورہ اور تحصیل پورے پر گھٹا بن کر چھا جاتے اور دیکھتے دیکھتے بارش کی جھڑی لگ جاتی۔ تکیہ بودی سائیں میں بیری کے نیچے بیٹھ کر چوسر کھیلنے والے فوراً دریاں جھاڑتے ہوئے اُٹھتے اور کوٹھڑی کی طرف بھاگ جاتے۔ باغوں کی طرف سے کوئل کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ ہماری گلی کا فرش بھیگ جاتا اور فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی۔ سامنے والی مسجد کا پتھر کی سلوں والا فرش چمکنے لگتا۔ انور اپنی کھڑکی میں نمودار ہوتی۔ باہیں اوپر اُٹھا کر بندھی ہوئی چق کھولتی، نیچے گلی میں جھانک کر ادھر ادھر دیکھتی اور واپس چلی جاتی میں سائیکل اُٹھاتا اور کمپنی باغ کی آوارہ گردی کرنے چل نکلتا۔ جب واپس آتا تو چھاجوں پانی برس رہا ہوتا۔ انور اپنے دیوان خانے میں چق کے ساتھ فاختائی فرد اوڑھے بیٹھی ہوتی۔ ذرا چق اٹھا کر مجھے دیکھتی اور مسکرا کر کہتی۔

"وے چارلی! تجھے بارش میں بھی چین نہیں۔"

جاڑوں میں مینہ برستا تو انور کی نانی دیوان خانے میں سری نگر والا سماوار سلگا دیتی۔ میں بھی گرم فرد اوڑھے وہاں آن بیٹھتا۔ میری بہنیں بھی وہاں آ جاتیں۔ انور اوپر سے کانگڑی میں کوئلے ڈال کر لے آتی اور ہم لوگ آگ تاپتے ہوئے پوہ ماگھ کی سرد بارش میں سبز چاء کا انتظار کیا کرتے۔ مینہ کی بوچھاڑ تیز ہوا کے ساتھ چق پر بھی پڑنے لگتی۔ انور جلدی سے زمین پر بچھی ہوئی دری کو اپنی طرف سمیٹ لیتی اور ذرا سا پیچھے کھسک جاتی۔ سردی اور بارش کے احساس سے اس کا رنگ سرخ ہو جاتا اور کشمیری سیب ایسے گالوں پر ملائم اور ریشمی بور سا اُڑنے لگتا۔ کئی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں اُس ریشمی روئیں دار گالوں کو چوم لوں۔ اتنے میں بادل زور سے گرجتا اور سماوار میں چاء ابلنے لگتی۔ انور کی نانی باری باری چھوٹی چھوٹی پھول دار نیلی پیالیوں میں چائے انڈیلتی اور سماوار وسط میں رکھ کر بڑی موج میں آ کر کوئی پرانا کشمیری گیت سنانا شروع کر دیتی۔ وہ کشمیری بڑی روانی سے بول لیتی تھی اور لب و لہجہ اور سبھاؤ پورا پرانی کشمیری عورتوں ایسا تھا۔ مجھے وہ گیت یاد نہیں

رہے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بڑے یاس امیز اور غمناک ہوتے تھے اور میں انہیں بڑی توجہ سے سنا کرتا تھا۔ خیال ہی خیال میں، میں مہیب پہاڑوں کے ان خوفناک دشوار گزار جنگلوں میں پہنچ جاتا جہاں موسلادھار بارش ہو رہی ہوتی اور تمام پتھریلے راستے اور بانس کے جھنڈوں میں سے ہو کر گزرنے والی پگ ڈنڈیاں بارش کی دھند میں چھپ گئی ہوتیں۔ میں دیکھتا کہ ایک سانولی سی کالی کالی آنکھوں اور سرخ ساری والی لڑکی ماتھے پر بندیا لگائے، کانسی کی گاگر اُٹھائے ان راستوں پر چلی جا رہی ہے اور گرتی بارش میں اس کی ساری اس کے سانولے بدن سے چپک رہی ہے اور دھند نے اس کے ارد گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے بانس کی شاخیں ہوا اور تیز بارش میں جھک جھک کر اس کے دہکتے ہوئے رخساروں کو چومنے کی کوشش کر رہی ہیں اور وہ ہراساں ہے، گھبرائی ہوئی سی ہے، کبھی ہاتھ سے ساری کا پلو سنبھالتی ہے اور کبھی اُسے چھوڑ کر آنکھوں پر آیا ہوا پانی پونچھتی ہے۔--- پھر ایک دم آنکھوں کے سامنے ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ پھیل جاتا۔ میں دیکھتا تند ہواؤں کے جھکڑوں اور زور دار بارش میں نیم اور دھریک کے درخت دہرے ہوئے جا رہے ہیں۔ کھیت جوہڑ بن گئے ہیں اور ندی نالے دریا بن کر بہنے لگے ہیں۔ دیہات کے کچے کوٹھوں پر سے پانی چھوٹی چھوٹی آبشاریں بن کر نیچے گلی میں گر رہا ہے۔ گلی میں ایک بھینس کیچڑ میں پھنسی ہوئی ہے ایک کالا سا لڑکا کمبل سر پر اوڑھے اُسے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک کسان کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ اُس نے سر پر بوریا رکھا ہوا ہے اور سینٹے سے بیلوں کو پیٹ رہا ہے۔ ہوا تیز ہو گئی ہے، سرد ہو گئی ہے اور اس سردی اور بارش میں بڑی نہر کو جانے والی، جنڈیالے کو جانے والی ایک پکی سڑک سامنے آ جاتی ہے۔ سڑک بارش میں دھندلی ہو رہی ہے۔ دونوں جانب ٹاہلیوں کے درخت ہوا اور بارش میں جھوم رہے ہیں اور مرجھائے ہوئے مٹیالے پتے بڑی تیزی سے گر رہے ہیں۔ سامنے پیپل کے درخت تلے نانک شاہی اینٹوں والی ایک پرانی حویلی کا بوسیدہ دروازہ ہے جس کا ایک پٹ بند ہے اور دوسرا غائب ہے۔ اندر صحن میں ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ ایک جگہ کھپریل کے چھپر کھٹ تلے دو تین بھینسیں بندھی ہیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بیل بیٹھا جگالی کر رہا ہے۔ پاس ہی ایک کسان آگ جلائے کھیس اوڑھے حقہ پی رہا ہے اور اوپر چوبارے میں بڑی سی رنگیل چارپائی پر چوہدری جی کمبل میں لپٹے بیٹھے ہیں اور پٹواری سے نئی زمینوں میں پانی کی تقسیم پر بات چیت کر رہے ہیں۔

درمیان میں لوہے کی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے ہیں اور کھڑکی بند ہے اور ہوا اور بارش کی بوچھاڑ بند کھڑکی سے سر پٹخ رہی ہے اور کیکر کے کالے اور کانٹے دار ننگے درخت سردی، بارش اور پالے میں ٹھٹھر رہے ہیں۔---

میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ جاتی اور میں تیزی سے گرم چاء کے دو تین گھونٹ چڑھا جاتا۔

انور کہتی:

""وے چارلی! زبان جل جائے گی۔"

نانی کہتی:

"وہ چاء ہی کیا جو زبان نہ جلائے---"

انور کی نانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ چائے ہی کیا جو زبان نہ جلائے اور وہ محبت ہی کیا جو دل نہ جلائے اور خون کے آنسو نہ رلائے اور دیس دیس کی اور در در کی خاک نہ چھنوائے---!

عید، شب برات پر محلے میں خوب رونق ہوتی۔ صبح سویرے ہی چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں نئے نئے گوٹہ لگے رنگدار ریشمی کپڑے پہن کر گلی میں نکل آتیں۔ فضل جُھیور کا بیٹا جان اپنے مکان کے آگے تخت پوش بچھا کر اُس پر سفید کھیس ڈالتا اور تانبے کے خوانوں میں گلاب دانیاں، کھلونے، فالودے کے پیالے اور پھولوں کے گلدستے سجانے لگتا۔ عنایتا حلوائی اپنی دکان کو چھت سے لے کر فرش تک رنگ برنگی مٹھائیوں کے تھالوں سے آراستہ کر دیتا۔ کاکا عمدو کی دکان کی سج دھج تو سب سے نرالی ہوتی تھی۔ دو روز پہلے ہی دکان کے آگے بڑی سی قنات کی چھاؤں کر دی جاتی۔ عید کے روز باہر بڑے تخت پوش پر لکڑی کی تختیاں اوپر سائبان تک لگا دی جاتیں اور ان پر سفید چاندی بچھ جاتی۔ یہ بالکل سیڑھیاں سی بن جاتیں۔ جن پر کہیں ورق لگے اراروٹ بہار دے رہے ہوتے تو کہیں قیمے کے تافتانے اور شیرمال، نمکین قلچے اور کھانڈ قلچے سج رہے ہوتے اور کہیں روغنی روٹیاں اور باقر خانیاں بجلی کی روشنی میں دعوت نظارہ دے رہیں ہوتیں۔ کاکا عمدو--- بوسکی کا تہمد اور بوسکی کی سونے کے بٹنوں والی قمیض پہنے بڑی گرم جوشی کے عالم میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہا ہوتا۔ کبھی ملازموں کو ہدایت دیتا، کبھی گاہک سے بات کرتا اور کبھی بڑی نفاست سے

پان منہ میں ڈال کر سر پر ہاتھ ملتا اور کبھی بیش قیمت پیچوان کے کش لگاتا دکھائی دیتا۔ کاکا عمدو بڑا خرچیلا اور شوقین مزاج قلندرو تھا۔ ناٹا قد، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، تیکھے نقش، چوڑے شانے، بھرا بھرا جسم، گوراچٹا رنگ ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ بڑا خوش مزاج اور نمائش پسند تھا۔ جب ہنستا تو آنکھیں گالوں میں چھپ جاتیں اور سفید سفید ہموار دانت موتیے کی طرح چمکا کرتے۔ ہر کام میں سب سے آگے ہوتا۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کا عادی تھا۔ محلے میں سے احراری لیڈر گزرے یا کانگرسی، لیگی یا نیلی پوش، عمدو کاکا اپنی دوکان کے آگے کیلے کے پتوں اور جھنڈیوں سے سجا ہوا محرابی دروازہ ضرور لگائے گا اور اپنے کسی کاریگر کے ہاتھوں لیڈر کے گلے میں پھولوں اور نوٹوں کا ہار ضرور پہنائے گا۔ عالمگیر باجے والا خواہ کسی کی برات لے کر گزرے، عمدو کاکا کی دوکان کے آگے ضرور سلامی دیتا اور کاکا عمدو کا کاریگر فوراً پانچ دس کا نوٹ لے کر اُس کی طرف بڑھتا۔ ایک بار بازار میں سے سیف الدین کچلو کا جلوس گزرنا تھا۔ کاکا جی نے بڑا خوبصورت آرائشی دروازہ لگوایا اور اس کے عین بیچ میں رومال میں بندھے ہوئے گلاب کے پھولوں کی پوٹلی لٹکا دی۔ جب کچلو وہاں سے گزرنے لگا تو کاکا جی نے فوراً کاریگر کو اشارہ کیا، اس نے رسی کھینچ دی۔ پوٹلی کھل گئی اور گلاب کے سرخ سرخ پھول ڈاکٹر کچلو کے اوپر برسنے لگے۔ لوگوں نے جوش میں آ کر تالیاں پیٹیں اور "کچلو زندہ باد"، "کاکا عمدو زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ کاکا جی کی خوشی کا بھلا کوئی ٹھکانہ تھا۔ پھول کر کپا ہو رہے تھے۔ چہرہ لال سرخ ہو گیا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی سلامی لے رہے تھے۔--- آج اُن کے مکان پر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ لوگ اُن کے مکان کا ملبہ تک اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ دن کو وہاں ایک بھٹیارن دانے بھونتی ہے اور رات کو زرد آنکھوں والا اُلو اپنی منحوس آواز میں پچھلے پہر تک بولتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کچلو زندہ باد!--- عمدو کاکا زندہ باد!

عید کی صبح کو منہ اندھیرے میں اور میرا چھوٹا بھائی قبرستان ضرور جاتے۔ ہم دونوں گھی منڈی والے دروازے سے نکل کر قبرستان کو جانے والی سڑک پر آتے تو پل کے پاس ہمیں گلاب کے پھول بیچنے والے ملتے۔ انہوں نے بڑی بڑی چنگیروں میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ڈھیر لگا رکھے ہوتے اور دو پیسے کے کتنے سارے پھول دے دیتے۔ ہم ایک آنے کے پھول خرید کر رومال میں باندھ لیتے اور سردی میں گرم چادریں اوڑھے قبرستان کی راہ

لیتے۔ ٹھنڈ میں ہاتھ پیر ٹھٹھر رہے ہوتے اور منہ سے بات کرتے وقت بھاپ نکل رہی ہوتی۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے صبح کے انتظار میں زرد ہو رہے ہوتے چھوٹی سی سڑک کی دونوں جانب ہمیں فقیر بیٹھے ہوئے ملتے۔ ان کے پیچھے اناروں اور امرودوں کے باغوں میں گھپ اندھیرا چھا رہا ہوتا۔ اب ادھر ادھر سے قرآن کریم کے تلاوت کرنے کی ہلکی ہلکی پر اسرار آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر موم بتیاں جلا رہے ہوتے اور پھول اور چاول بکھیر رہے ہوتے۔ عورتیں اپنے بچوں، بھائیوں، خاوندوں اور رشتہ داروں کے مزاروں پر بیٹھی تلاوت کلام پاک سے ان کی روحوں کو ثواب پہنچا رہی ہوتیں۔ یہ خیال کہ ان لوگوں نے خوشی کے موقع پر بھی اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو نہیں بھلایا، دل کو بڑی تسکین دیتا اور انسانی بھلائی میں میرا یقین زیادہ محکم ہو جاتا۔ اسی قبرستان میں بسنتی پھولوں والا وہ درخت بھی تھا، جس کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر انور نے مجھے بمبئی جاتے ہوئے اپنا ایک کنگن یادگار کے طور پر دیا تھا اور کہا تھا:

"وہاں زیادہ دن نہ ٹھہرنا وے۔"

قبرستان سے واپس آتے تو دن نکل آیا ہوتا اور گلی میں بڑی رونق ہوتی۔ بچے نیلے پیلے غبارے ہاتھوں میں لئے بانس کے باجے بجا رہے ہوتے۔ جان کی دوکان پر بچوں کا ہجوم کھلونے خرید رہا ہوتا۔ گاماں ٹپ گرکے بھلے پکوڑیاں ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہوتیں۔ عنائتی حلوائی اور کاکا عمدو کی دوکانیں دلہنوں کی طرح سجی ہوئی ہوتیں۔ اور لوگ بڑے شوق سے شیر مال اور اراروٹ اور مٹھائیاں خرید رہے ہوتے۔ چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری بچیاں بے احتیاطی سے چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپے ریشمی رومالوں سے ڈھکی ہوئی سویّوں کی تھالیاں لئے اپنے اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کے گھروں کو جا رہی ہوتیں۔ ہر شخص کے چہرے پر خوشی اور شادمانی کی چمک ہوتی اور بچے اپنی اپنی عیدیاں جیبوں میں ڈالے بنے ٹھنے گلی میں چکر لگا رہے ہوتے اور کبھی اس دوکان سے غبارے خریدتے اور کبھی وہاں بیٹھ کر کھیرے کھانے لگتے۔ یوں لگتا جیسے آج اس گلی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ ہر گھر میں سویّاں ابل رہی ہوتیں ہر گھر میں دو دو تین تین سالن چولھوں پر چڑھے ہوتے۔ ہر گھر سے سویوں کے ورق لگے تھال باہر نکل رہے ہوتے۔ ہر مکان پر مسرتوں کا قافلہ خیمہ زن ہوتا اور فقیروں میں خیرات بانٹی جا رہی ہوتی۔

عید سے ایک دن پہلے کی رات میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔ اُسے حرفے کی رات کہا جاتا۔ وہ رات ہم تقریباً جاگ کر گزارتے۔ محلے بھر میں سبزی فروش، منیاری والے، گوشت والے اور درزیوں اور حجاموں کی دوکانیں رات گئے تک کھلی رہتیں۔ درزیوں اور حجاموں کی دوکانوں میں تو میلہ لگا ہوتا۔ سبزی فروش چراغ ارائیں آلو اور مٹر تول تول کر دھڑا دھڑ بیچ رہا ہوتا۔ گوشت ایک سیر سے کم کسی کے گھر نہ جاتا۔ جیرے قصائی نے دوکان کے باہر بکرے الٹے لٹکائے ہوتے اور کاریگر اندر گوشت کاٹ رہے ہوتے اور قیمہ بنا رہے ہوتے۔ حسن منیاری والے کی دکان پر بچے بچیاں، نوکرانیاں اور نوکر جرابیں، رومال، ربن، کلپ، چوڑیاں، پراندے، سرخی پاوڈر، کریمیں اور بنیانیں خرید رہے ہوتے۔ درزیوں کی دوکانوں کے دروازے بند ہوتے اندر بتیاں جل رہی ہوتیں اور مشینیں گرز گرز کی آوازوں کے ساتھ چل رہی ہوتیں۔ لوگ بار بار آ کر تقاضا کر رہے ہوتے اور ماسٹر صاحب ہر ایک کو یہی جواب دیتے۔

"بس جی عید کی نماز سے پہلے قمیضیں تیار لیں۔"

لیکن آج اس محلے میں عید کی نماز پڑھنے والا کوئی نہیں۔ آج اس گلی میں کوئی درزی حرفے کی رات کو مشین لے کر صبح ہونے تک نہیں بیٹھتا۔ آج اس گلی پر کسی ٹیلر ماسٹر کی بجھی ہوئی استری کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک کبھی نہ ختم ہونے والی گہری شدید اور انمٹ اداسی، بیوگی اور بے کسی کی راکھ اڑ رہی ہے۔ آج یہ کسی عید، کسی شب برات پر نہیں مسکراتی، کسی سے ہنس کر بات نہیں کرتی ---- اپنے فرش پر چلنے والوں کو ایک افسردہ بیگانگی سے دیکھتی ہے اور مکانوں کی تاریک ڈیوڑھی میں سر رکھ کر رات رات بھر آہیں بھرا کرتی ہے۔ اس کا منہ کھلا ہے، آنکھیں بے نور ہیں، چہرہ فق ہے، ہونٹ اندر کو بھنچ گئے ہیں اور چھاتی کا فرش چھلنی ہو رہا ہے اور اپنی گندی نالیوں کے بے جان بازو پھیلائے یہ اس پھول کی یاد دلا رہی ہے جو کسی جنازے میں سے سڑک پر گر پڑا ہو اور وہیں پڑے پڑے مرجھا کر سوکھ گیا ہو، جیسے لحد نے بھی اپنی آغوش میں پناہ نہ دی ہو، جیسے موت نے بھی اپنے دامن سے جھٹک دیا ہو --- کبھی اس کے ہاتھوں میں حنا کا رنگ تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر چلمنیں پڑی رہتی تھیں اور دروازوں کے پٹ نیم وا ہوتے تھے اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی ڈیوڑھیوں میں سے موتیے کی خوشبو اڑاتی، برقعوں میں لپٹی ہوئی جھکی جھکی شرمیلی

نگاہوں والی لڑکیاں گزرا کرتی تھیں۔ لیکن آج اس کے ہر مکان کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور پرنالے گر پڑے ہیں اور ممٹیاں ڈھے گئی ہیں اور ہر کھڑکی ننگی ہے، ہر دروازہ چوپٹ کھلا ہے اور ہر گھر دہلیز سے لے کر پچھلے کمرے تک عریاں دکھائی دیتا ہے۔ اس بے حیا طوائف کی طرح جو سب کے سامنے ننگی نہا رہی ہے اور ہر نلکے پر نیم عریاں عورتیں میلے کپڑے دھوتی ملتی ہیں اور ان کے بچے نالیوں پر گندگی سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی

یہ گیت مدت ہوئی میں نے امرتسر میں سنا تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ دسمبر گزر رہا تھا، آسمان پر بھورے سرد بادل چھا رہے تھے۔ میں صبح کی سیر سے ٹھٹھرتا ہوا واپس آ رہا تھا میرے ہاتھ میں شبنم سے لدے ہوئے گلاب کے دو تین پھول تھے۔ بٹالہ جانے والی ریلوے لائن کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا نالہ آلو چے کے باغ کے ساتھ ساتھ کمپنی باغ کو جاتا تھا اس نالے کی ایک طرف چھوٹا سا صاف ستھرا گاؤں تھا۔ دس بیس چکنی مٹی سے لپے ہوئے کچے کوٹھے ہوتے تھے۔ سفید سفید دودھیا میناروں اور گنبد والی ایک مسجد بھی تھی جس کے صحن میں جامن کا پیڑ اگا ہوا تھا۔ میرا معمول تھا کہ واپسی پر اس گاؤں میں سے ضرور گزرتا۔ مجھے ان کوٹھوں کی سادگی اور مسجد کے میناروں کا اجلا پن بڑا پیارا لگتا تھا۔ اس دن جب میں یہاں سے گزرنے لگا تو مجھے کہیں قریب ہی سے لڑکیوں کے مل کر گانے کی آواز سنائی دی۔ میں وہاں رک گیا۔ ایک مکان کے آنگن میں پیپل کے درخت تلے کچھ دیہاتی لڑکیاں تالی بجاتی گا رہی تھیں۔

تینوں سفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی
(تجھے بابل کی گلیاں خواب ہو جائیں گی۔)

او دلہن!

وہاں کسی لڑکی کی شادی تھی، صبح کا سماں، سردی، ہوا، بھورے بھورے بادل، سفید سفید دیہاتی کوٹھے، کھلا آنگن، جھڑے ہوئے پتوں والا ٹنڈ منڈ پیپل کا درخت اور لڑکیوں کی دردناک آوازیں۔ میرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کی آنکھیں بھر آئیں اور میں نے ان کی

پلکیں چوم لیں اور دل پر ہاتھ رکھے نہر کی پٹڑی پٹڑی چل پڑا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بابل کی گلیاں واقعی ایک دن سپنا بن جائیں گی اور پھر کبھی ان کی زیارت نصیب نہ ہو گی تو میں بھاگ کر ان لڑکیوں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتا اور کہتا پیپل تلے جدائی کے گیت گانے والی بچیو! اپنے گھروں میں چھپ جاؤ۔ ایک دن یہ گلیاں ہی نہیں، تمھارے بابل بھی تمھیں سپنا ہو جائیں گے اور پھر کسی گھر کی کچی دیوار کے ساتھ لگ کر خوب روتا ساری عمر کے آنسو ایک ہی دن میں ختم کر دیتا۔ کیا خبر تھی وہ دن بھی آئیں گے جب غم کے پیالے میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپک سکے گا۔ تمام درخت اجنبی اور ساری گلیاں ویران ہو جائیں گی۔ کوئی ہمیں نہ پہچانے گا، کوئی باہیں پھیلا کر ہمیں اپنی طرف نہ بلائے گا۔ میں ان گلیوں میں کبھی چاند کے ساتھ سوتا اور سورج کے ساتھ بیدار ہوتا تھا۔ مگر آج اس نگری پر چمکنے والے چاند نے مجھے بلایا اور نہ طلوع ہوتے ہوئے سورج نے آنکھ ملائی۔ جن پر بھروسہ تھا، مان تھا، وہ اکیلا چھوڑ کر چل دیئے۔ اک تارے والا فقیر سچا تھا وہ پیپل تلے گانے والی لڑکیاں بھی سچ کہتی تھیں جانے اب وہ کہاں ہوں گی۔ جانے اپنی سہیلی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے والیوں کو خود بھی دلہن بننا نصیب ہوا ہو گا یا نہیں۔ کیا خبر ان میں سے کتنی پاکستان پہنچ سکی ہوں گی اور کتنی ضلع جالندھر یا ضلع امرتسر میں نیم کے درخت تلے چارپائی پر بیٹھی روڑھ سنگھ یا کشمیرا سنگھ کے بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں گی۔

امرتسر! امرتسر! یہ تو نے ہم سے کس جنم کا بدلہ لیا رے؟

رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت جگانے والوں کی ٹولیاں آیا کرتیں۔ گلی کے موڑ پر نعت گانے کی آواز سنائی دیتی تو میں لحاف سے نکل کر کھڑکی میں آن کھڑا ہوتا۔ باورچی خانے میں امی پراٹھے بنا رہی ہوتیں اور آپا چائے کا پانی گرم کر رہی ہوتی۔ امی مجھے دہی لانے کے لئے بھیج دیتیں۔ میں برتن ہاتھ میں لئے گلی میں نکل آتا اور ڈھول یا کنستر بجا بجا کر جگانے والوں کے قریب کھڑا ہو کر انہیں بڑے شوق سے دیکھا کرتا۔ یہ احساس کہ تمام گلی جاگ رہی ہے۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ پکایا جا رہا ہے میرے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دیتا اور میں خوشی خوشی حلوائی کی دوکان کی طرف چل پڑتا۔ کسی گھر سے لکڑیوں کے توڑنے، کہیں سے برتنوں کو دھونے اور کہیں سے دہی بلونے کی زندگی بخش آوازیں آ رہی ہوتیں۔ گاما ٹپ گر دوکان کا ایک پٹ کھولے حقے کے لئے آگ جلا رہا ہوتا۔ قاندرو کے تنور میں آگ کے شعلے

چھت کو چھو رہے ہوتے۔ انور کے مکان میں بھی اوپر والی منزل میں روشنی ہو رہی ہوتی۔ آسمان پر صبح کا نور پھیل رہا ہوتا اور تاروں کی چمک دمک آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی ہوتی۔ کھِتّاں انور کے مکان کی ممٹی کے اوپر آ گئی ہوتیں۔ سحری کھا کر میں اور میرا چھوٹا بھائی ہم دونوں دیواروں پر لگے ہوئے فلمی اشتہار اتارنے نکل جاتے۔ ہم ان اشتہاروں کو بڑی جانفشانی سے دیواروں درختوں اور بجلی کے کھمبوں پر چڑھ کر اتارتے اور پھر گھر آ کر ان میں سے مس سلوچنا، مادھوری اور مس کجن کی تصویریں کاٹ کر الگ رکھ لیتے۔ جس روز اشتہاروں کا پروگرام نہ ہوتا تو ہم کمپنی باغ میں مٹر گشت کرنے آ جاتے۔ یہاں ہمیں ہمارے دوسرے ساتھی بھی مل جاتے اور ہم گراؤنڈ والے مشہور درخت پر جٹ برہمن کا کھیل کھیلتے۔ جب تھک جاتے تو حوض کے فوارے کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیتے اور پھر روزہ ٹوٹ جانے پر خدا سے معافیاں مانگنا شروع کر دیتے۔ لاوا ہمارا ایک یار ہوا کرتا تھا۔ وہ جلدی سے بول اٹھتا "بھول کر کھانے سے کچھ نہیں ہوتا۔" یہ لاوا بڑا شیطان کی ٹونٹی تھا۔ ایک روز میرے منہ میں پاسنگ شو کا سگریٹ رکھ کر سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا:

"میں نے مولوی سے پوچھ لیا ہے۔ سگریٹ پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا"

عید میلاد النبیؐ کے دن جو جلوس ہماری گلی سے نکلتا اس کا جھنڈا میرے سپرد ہوتا۔ میں صبح صبح ہی سرخ ہلال پرچم لے کر گلی کے وسط میں آن کھڑا ہوتا۔ دوسرے لڑکے ہمیشہ مجھے رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ہمارا جلوس محلے سے نکل کر انجمن پارک میں جا کر شہر کے دوسرے جلوسوں کے ساتھ مل جاتا اور پھر تمام جلوس ایک قافلے کی صورت میں سکتری باغ کی طرف روانہ ہو جاتے، جہاں شام کو دال اور نان بٹتے اور ایک زبردست جلسہ ہوتا تھا۔

ہمارے مکان میں آنگن والی دیوار پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور زمین پر دیوار کے ساتھ ساتھ نیازبو، موتیا اور رتن جوت کے گملے بہار دیا کرتے۔ دادا جان ان پودوں کی بڑی خبر گیری کیا کرتے۔ وہ ان کے پاس دری کے ایک پرانے ٹکڑے پر مہاتما بدھ کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھے رہتے اور پھول پتوں کو چڑیوں کی نوک جھونک سے بچایا کرتے۔ کبھی موج میں آ کر سی حرفی ہدایت اللہ کے بیت گنگنانے لگتے۔ اتوار کو وہ ہمیں ساتھ لے کر ریلوے لائین کے پار بامبی پر سیر کو لے جاتے۔ خود، ہنسلی دری بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہم

کھیتوں میں پتنگ اڑاتے اور ہرے ہرے بسنتی اور سرخ پتے جمع کیا کرتے جو پتے درختوں پر سے ٹوٹ کر دادا جان کے پاس گرتے انھیں وہ بھی سنبھال کر رکھ لیتے اور جب ہم کھیل کود سے واپس آتے تو ہم تینوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیتے۔ وہ بڑے ہنس مکھ اور درویش منش تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی بات پر رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے۔ چائے کے بڑے رسیا تھے اور اسے بالکل بچوں ایسی شوق اور دلچسپی سے پیتے، خالی پیالی بڑے آرام سے زمین پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے سفید مونچھوں کو پونچھتے اور کہتے:

"واہ بھئی روح خوش کر دیا"

ایک رات سردیوں میں بارش ہوئی۔ میں کمرے میں لیمپ کی روشنی میں بیٹھا میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ بڑی سخت سردی تھی۔ دادا جان میرے قریب ہی چارپائی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بارش کا کپکپی طاری کر دینے والا پر اسرار شور سنائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بارش ہلکی ہو گئی اور پھر بالکل بند ہو گئی۔ میں نے کتاب بند کی اور اٹھ کر باہر دالان میں آ گیا۔ آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ غسل خانے کے چھپر پر سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپاٹپ گر رہا تھا۔ گلی کے پرنالے ابھی تک بہہ رہے تھے۔ آنگن کا فرش دُھل گیا تھا۔ سامنے انور کا مکان بارش کے بعد اندھیرے اور پالے میں ٹھٹھر رہا تھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں نے دیکھا۔ انور اپنی چارپائی پر لحاف میں گرم ہو کر سو رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر ہے۔ دوسرا گال کے نیچے ہے اور آنکھیں بند ہیں اور سوئے ہوئے گرم کنوارے بدن میں ہلکی ہلکی خوشبودار آنچ سی اٹھ رہی ہے۔ اتنے میں اندر سے دادا جان کے گانے کی آواز آئی۔

نکیاں نکیاں پون پھواراں
اِکناں دیاں نے موج بہاراں
جندے پل پل بھئی جاناں
بھئی جاناں ہو
ہری پور نور پور ٹھنڈیاں چھاواں
پل پل بھئی جاناں ہو

ہری پور نور پور ٹھنڈیاں چھاواں
پل پل بھئی جاناں ہو

سرد بادلوں میں لپٹی ہوئی مرطوب سیاہ رات، سناٹا، سائبانوں پر سے پانی کے قطروں کے گرنے کی ٹپاٹپ، سنسان گلی، خاموش اونگھتے مکانوں کے گرم کمرے اور ان کمروں میں دلہنوں کے دھڑکتے سانسوں کی مہک اور کمیٹی کے لیمپوں کی دھندلی روشنی میں چمکتا ہوا گلی کا فرش---- میرے دل کو جیسے کسی نے اپنی پرسکون گرم چھاتی سے لگا لیا اور میرے ہونٹ کسی درد انگیز خوشی اور ایک بے نام سے انجانے غم اور دور دراز کی اجنبی سوچوں کے زیر اثر کپکپانے لگے۔ وہ ہری پور، نور پور کہاں ہیں، جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہے اور جہاں آم کی ٹہنیوں پر روساکھ میں میٹھا رس ٹپکتا ہے اور کیسری رنگ کے پھولوں کے کھیت ہیں اور بانسوں کے جھنڈ اور گیندے اور چنبیلی کی شاخیں ہاتھ کے اشاروں سے اپنی طرف بلاتی ہیں۔ کیا پھر کبھی ان جنگلوں میں ہم صحرا نوردوں کا گذر نہ ہو گا، کیا پھر کبھی راتوں کو بارش نہ ہو گی؟ پھر کبھی درشن نہ ہوں گے----؟

آج اتنے سالوں کے بعد جب پرانی یادوں کے دھندلے سمندروں میں کھوئے ہوئے موتیوں کی تلاش میں نکلا ہوں تو میری آنکھیں بند ہیں اور ان پر جھکی ہوئی پلکیں چنار کی خشک پتیوں کی طرح کانپ رہی ہیں، جو خزاں کی بارش میں اپنی ڈالیوں سے لپٹ گئی ہوں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی دکھی عورت گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں جا کر اپنے جہیز کا صندوق کھولے، اپنی شادی کا پرانا عروسی جوڑا نکال کر اسے حسرت ناک نگاہوں سے دیکھے اور پھر اس میں منہ چھپا کر جی بھر کر روئے---- کہاں چھپ گئے وہ حنا کی خوشبو میں بسے ہوئے، ریشم کی ڈوری میں پروئے ہوئے پھولوں کی سیج پر سوئے ہوئے چمکتے، دمکتے، روشن اور پر مسرت دن؟ جب خاوند کی باہیں گلے میں حائل ہوتی تھیں، ساس اٹھتے بیٹھتے بلائیں لیتی تھی اور نندیں آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں------ وقت کی بھٹی نے ان گرموش دنوں کی ساری چمک، ساری آنچ اپنے اندر جذب کر لی ہے اور راکھ زندگی کے دامن میں پھینک دی ہے۔ اب وہ پہلی کوئی بات باقی نہیں اب ساس صبح شام پاؤں دبواتی ہے اور نندیں خوشامدیں کرواتی ہیں اور خاوند ذرا ذرا سی بات پر جھڑک دیتا ہے اور بچے روتے ہیں چلاتے ہیں اور اس کی بوٹیاں توڑتے ہیں۔

ہے بھگوان! ہے رب العالمین! ہے خدا!

کیا پھولوں کا منہ چوم کر گزرنے والے جھونکے اب کبھی اس گلی سے نہ گزریں گے؟

کیا ٹوٹ کر گرا ہوا پتا اب کبھی اپنی ڈالی پر واپس نہ جائے گا؟ کیا اب بے درد آندھیوں کے جھکڑ اسے تپتے ہوئے، اجڑے ہوئے بنجر میدانوں میں اڑاتے پھریں گے اور پہاڑوں پر چپ چاپ گرنے والی برف! وادیوں میں اترتے سمے تیرے آنسو کیوں نکل آتے ہیں؟ کیا تجھے بنفشہ کے ان بسنتی شگوفوں کا خیال آجاتا ہے جنھیں تو گل مرگ کی ڈھلانوں پر دفن کر آئی ہے یا ان پردیسیوں کی یاد آجاتی ہے، جو تیری اندھیری گھاٹیوں میں لاپتہ ہو گئے؟ تو جب پہاڑوں کی بلندیوں پر گری تو برف کی پاکیزہ کلی تھی اور جب ہماری گلیوں میں آئی تو آنسوؤں کی جھڑی تھی تو پھول بن کر کوہساروں پر گرتی اور آنسو بن کر ہمارے آنگن میں ڈھلک آتی۔ کیا تجھے خبر تھی کہ ایک دن ہم اپنے گھروں کے صحن سونے کر جائیں گے، اپنی گلیوں سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر جائیں گے اور اپنے مکانوں کی سیڑھیوں، ڈیوڑھیوں، دروازوں اور کھڑکیوں سے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ تو نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ ہم ساری زندگی ایک ہی دن میں اپنے وطن کی گلیوں میں بسر کر دیتے۔ ہم ہر صبح کا استقبال دونوں بازو پھیلا کر کرتے اور ہر رات کو ایک لاکھ مرتبہ چوم کر رخصت کرتے۔ ہم گرمیوں کی اداس دوپہروں کو اپنے دل میں جگہ دیتے اور چاندنی راتوں کو اپنی آنکھوں میں بٹھلاتے، ہم غروب ہوتے وقت بھی سورج کا ساتھ نہ چھوڑتے اور اس کی سمٹتی ہوئی قرمزی کرنوں کی جھالر تھام کر مغرب کی لالہ زار وادیوں میں اتر جاتے اور صبح دم اس کی پہلی کرن کے ساتھ زرتار موتیوں کا ہار پہنے طلوع ہوتے اور شبنم کے آنسو بن کر پھول پھول پر، کلی کلی پر، کانٹے کانٹے پر گرتے۔ لیکن تو نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ بس روتی ہی رہی، گرتی ہی رہی۔ جب بھی ہمارے گھر آئی روتی ہوئی آئی اور آنسو پونچھتی واپس گئی۔ تجھے یاد ہے ایک دن میں غلطی سے کمپنی باغ والی نہر میں انور کے اوپر کود پڑا تھا۔ اگر مجھے اس ہمیشہ کی جدائی کی اس وقت خبر ہوتی تو میں نہر سے پھر کبھی باہر سر نہ نکالتا۔ نہر میں نہاتی ہوئی انور کے نیم عریاں ٹھنڈے اور گرم جسم پر گرنا جنت اور دوزخ میں بیک وقت چھلانگ لگانا تھا۔

میں اس پھول، خوشبو اور شبنم کی پھوار اڑاتے شعلوں کی چتا پر سے پھر کبھی نہ اٹھتا بلکہ ان خواب انگیز یادوں کے ساتھ ہی ستی ہو جاتا۔ اسی طرح ان صندلیں شعلوں سے لپٹ کر

سو جاتا اور جب سردیوں کی کسی نیلی سیاہ رات کو نہر کا پانی خشک ہوتا تو لوگ دیکھتے کہ جہاں میں گرا تھا وہاں موتیے کی ایک سفید کلی مسکرا رہی ہے۔

لیکن تو نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تیرے ہونٹ منجمد رہے اور زبان پر تالا پڑا رہا۔ پہاڑوں کی سنگدل برف! تیرا خون کس قدر سفید ہے! تو نے ہمیں خون کے آنسو رلایا ہے۔ تو بھی عمر بھر روتی رہے گی، کبھی ترائی کی چٹانوں پر اور کبھی دامن کوہ کے غاروں میں منہ چھپا کر........ ہم نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں لیکن تیرے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ او کور چشم سرد مہر برف!

چھہرٹہ پیچھے رہ گیا تھا۔

اور اب ہماری بس پتلی گھر کی آبادی میں سے گزر رہی تھی۔ چوک میں اسی طرح گنے بک رہے تھے اور آرڈیننس ڈپو کے باہر دروازے پر سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ دیواروں پر جابجا فلموں کے اشتہار چسپاں تھے۔ اب ریگو برج سامنے نظر آنے لگا۔ ایک سکھ لڑکا پل کے جنگلے پر جھکا نیچے شنٹ کرتی ریل گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی میں بھی اسکول سے بھاگ کر اس پل پر آ کر ریل گاڑیوں کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اسٹیشن آگیا۔ امرتسر اسٹیشن --- میں ایک ایک درخت، ایک ایک عمارت، ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب کچھ وہ نہیں تھا۔ سب چیزیں ویسی تھیں، لیکن ایک بھی چیز ویسی نہ تھی، پرنس ہوٹل، سٹیشن کی ڈیوڑھی، تانگوں کا اڈہ، سامنے والی سرائے، پیپل کا گنجان درخت، گھوڑوں کی لید، مزدوروں کا شور، بالکل وہی، بالکل وہی --- بالکل مختلف وہی ماتھا، بالکل مختلف وہی ہاتھ، وہی پاؤں، وہی بال، وہی آنکھیں --- مگر آواز نہیں حرکت نہیں، چہرے پر چمک نہیں، آنکھوں میں نور نہیں، باغ والی مسجد کے مینار کالے پڑ گئے ہیں اور گنبد کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور ایک طرف دراڑیں نمودار ہو گئی ہیں اور اس دم توڑتی ہوئی نیلی لاش کے ہونٹ کچھ کہہ رہے ہیں، کچھ کہنے کے لئے ہل رہے ہیں لیکن آواز نہیں، صدا نہیں، زندگی نہیں، حرارت نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں......!

بس سڑک کنارے سائبان تلے رک گئی۔ گوالیاری جامن والی نے گھوم کر اپنے میاں کو دیکھا۔ میاں نے ہاتھ سے اترنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ نیچے اُترنے لگے۔ کیلے بیچنے والے

ہے بھگوان! ہے رب العالمین! ہے خدا!

کیا پھولوں کا منہ چوم کر گزرنے والے جھونکے اب کبھی اس گلی سے نہ گزریں گے؟ کیا ٹوٹ کر گرا ہوا پتا اب کبھی اپنی ڈالی پر واپس نہ جائے گا؟ کیا اب بے درد آندھیوں کے جھکڑ اسے تپتے ہوئے، اجڑے ہوئے بنجر میدانوں میں اڑاتے پھریں گے اور پہاڑوں پر چپ چاپ گرنے والی برف! وادیوں میں اترتے سمے تیرے آنسو کیوں نکل آتے ہیں؟ کیا تجھے بنفشہ کے ان بسنتی شگوفوں کا خیال آجاتا ہے جنھیں تو گل مرگ کی ڈھلانوں پر دفن کر آئی ہے یا ان پردیسیوں کی یاد آجاتی ہے، جو تیری اندھیری گھاٹیوں میں لاپتہ ہوگئے؟ تو جب پہاڑوں کی بلندیوں پر گری تو برف کی پاکیزہ کلی تھی اور جب ہماری گلیوں میں آئی تو آنسوؤں کی جھڑی تھی تو پھول بن کر کوہساروں پر گرتی اور آنسو بن کر ہمارے آنگن میں ڈھلک آتی۔ کیا تجھے خبر تھی کہ ایک دن ہم اپنے گھروں کے صحن سونے کر جائیں گے، اپنی گلیوں سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر جائیں گے اور اپنے مکانوں کی سیڑھیوں، ڈیوڑھیوں، دروازوں اور کھڑکیوں سے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہوجائیں گے۔ تو نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ ہم ساری زندگی ایک ہی دن میں اپنے وطن کی گلیوں میں بسر کر دیتے۔ ہم ہر صبح کا استقبال دونوں بازو پھیلا کر کرتے اور ہر رات کو ایک لاکھ مرتبہ چوم کر رخصت کرتے۔ ہم گرمیوں کی اداس دوپہروں کو اپنے دل میں جگہ دیتے اور چاندنی راتوں کو اپنی آنکھوں میں بٹھلاتے، ہم غروب ہوتے وقت بھی سورج کا ساتھ نہ چھوڑتے اور اس کی سمٹتی ہوئی قرمزی کرنوں کی جھالر تھام کر مغرب کی لالہ زار وادیوں میں اتر جاتے اور صبح دم اس کی پہلی کرن کے ساتھ زرتار موتیوں کا ہار پہنے طلوع ہوتے اور شبنم کے آنسو بن کر پھول پھول پر، کلی کلی پر، کانٹے کانٹے پر گرتے۔ لیکن تو نے تو ہمیں کچھ بھی نہ بتایا۔ بس روتی ہی رہی، گرتی ہی رہی۔ جب بھی ہمارے گھر آئی روتی ہوئی آئی اور آنسو پونچھتی واپس گئی۔ تجھے یاد ہے ایک دن میں غلطی سے کمپنی باغ والی نہر میں انور کے اوپر کود پڑا تھا۔ اگر مجھے اس ہمیشہ کی جدائی کی اس وقت خبر ہوتی تو میں نہر سے پھر کبھی باہر سر نہ نکالتا۔ نہر میں نہاتی ہوئی انور کے نیم عریاں ٹھنڈے اور گرم جسم پر گرنا جنت اور دوزخ میں بیک وقت چھلانگ لگانا تھا۔

میں اس پھول، خوشبو اور شبنم کی پھوار اڑاتے شعلوں کی چتا پر سے پھر کبھی نہ اٹھتا بلکہ ان خواب انگیز یادوں کے ساتھ ہی ستی ہوجاتا۔ اسی طرح ان صندلیں شعلوں سے لپٹ کر

سو جاتا اور جب سردیوں کی کسی نیلی سیاہ رات کو نہر کا پانی خشک ہوتا تو لوگ دیکھتے کہ جہاں میں گرا تھا وہاں موتیے کی ایک سفید کلی مسکرا رہی ہے۔

لیکن تو نے ہمیں اندھیرے میں رکھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تیرے ہونٹ منجمد رہے اور زبان پر تالا پڑا رہا۔ پہاڑوں کی سنگدل برف! تیرا خون کس قدر سفید ہے! تو نے ہمیں خون کے آنسو رلایا ہے۔ تو بھی عمر بھر روتی رہے گی، کبھی ترائی کی چٹانوں پر اور کبھی دامن کوہ کے غاروں میں منہ چھپا کر...... ہم نے اپنے آنسو پونچھ لئے ہیں لیکن تیرے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ او کور چشم سرد مہر برف!

چھ ہرٹہ پیچھے رہ گیا تھا۔

اور اب ہماری بس پتلی گھر کی آبادی میں سے گزر رہی تھی۔ چوک میں اسی طرح گنے بک رہے تھے اور آرڈیننس ڈپو کے باہر دروازے پر سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ دیواروں پر جابجا فلموں کے اشتہار چسپاں تھے۔ اب ریگو برج سامنے نظر آنے لگا۔ ایک سکھ لڑکا پل کے جنگلے پر جھکا نیچے شنٹ کرتی ریل گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی میں بھی اسکول سے بھاگ کر اس پل پر آکر ریل گاڑیوں کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ اسٹیشن آگیا۔ امرتسر اسٹیشن --- میں ایک ایک درخت، ایک ایک عمارت، ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ سب کچھ وہی تھا مگر سب کچھ وہ نہیں تھا۔ سب چیزیں ویسی تھیں، لیکن ایک بھی چیز ویسی نہ تھی، پرنس ہوٹل، سٹیشن کی ڈیوڑھی، تانگوں کا اڈہ، سامنے والی سرائے، پیپل کا گنجان درخت، گھوڑوں کی لید، مزدوروں کا شور، بالکل وہی، بالکل وہی --- بالکل مختلف وہی ماتھا، بالکل مختلف وہی ہاتھ، وہی پاؤں، وہی بال، وہی آنکھیں --- مگر آواز نہیں حرکت نہیں، چہرے پر چمک نہیں، آنکھوں میں نور نہیں، باغ والی مسجد کے مینار کالے پڑ گئے ہیں اور گنبد کا پلستر اکھڑ گیا ہے اور ایک طرف دراڑیں نمودار ہو گئی ہیں اور اس دم توڑتی ہوئی نیلی لاش کے ہونٹ کچھ کہہ رہے ہیں، کچھ کہنے کے لئے ہل رہے ہیں لیکن آواز نہیں، صدا نہیں، زندگی نہیں، حرارت نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں......!

بس سڑک کنارے سائبان تلے رک گئی۔ گوالیاری جامن والی نے گھوم کر اپنے میاں کو دیکھا۔ میاں نے ہاتھ سے اترنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ نیچے اترنے لگے۔ کیلے بیچنے والے

یہاں بھی آ گئے۔

"ہری چھیل ماراج! پیسے ہندوستانی یا پاکستانی---"

اور یہاں بھی لوگوں نے سب سے پہلے کیلے کھائے۔ اور پھر سامان اُتروا دیا پھر بیگم صاحبہ نے یہاں بھی اپنے بچوں کی فوج میں کیلوں کا راشن تقسیم کیا اور خود ایک کیلا چھیل کر اسے برقعے کے اندر کھانے لگیں۔ رکشا والا بھاگ کر میرے پاس آیا۔

"رکشا بابو جی۔"

"نہیں بھائی! ہم ایک مدت بعد اپنے وطن کے روضہ کی زیارت کو آئے ہیں۔ ہم اس کی گلیوں میں پیدل چلیں گے، ننگے پاؤں چلیں گے۔" میں نے سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پیدل ہال بازار کی طرف چل پڑا۔ وہی سڑک تھی۔ اسی طرح دو رویہ پیپل کے درخت کھڑے تھے اور ان کے نیچے کھڑے ہوئے فٹ پاتھوں پر میلے کچیلے چابڑی فروش ریوڑیاں، چنے اور بھلے پکوڑیاں بیچنے والے مکھیاں اڑا رہے تھے۔ سیڑھیوں والے پل کی پہلی سیڑھی ایک طرف سے اسی طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ دوسرا بڑا پل آ گیا۔ ڈھلان پر بائیں جانب کبھی ہرا بھرا باغ ہوا کرتا تھا۔ اب یہ باغ اجڑ گیا تھا اور اس کے فوارے میں خشک اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ انجمن پارک میں میوہ منڈی بن گئی تھی۔ یہاں ہم سردیوں میں کرکٹ میچ اور گرمیوں میں گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ اب بوسیدہ جھکے ہوئے پرانے کھوکھوں کی قطاریں کبوتروں کی کابکوں کی طرح ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ بدرو میں گندگی پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ ہال گیٹ کی گھڑی ویسے ہی تھی۔ صرف نیچے جہاں فوارے ہوا کرتے تھے اب وہاں جنسی اور جاسوسی کتابوں کی ڈربہ نما دکانیں تھی۔ دروازے میں سے ہندو سکھ عورتیں اور مرد آ جا رہے تھے ہر مرد عورت اور لڑکی کا چہرہ ایک ہی جیسا زرد، بے جان اور سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ ہال بازار بہت جلدی آ گیا تھا اور پہلے سے تنگ اور رکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میری نظر اسے دیکھتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ وقت اور فاصلہ سمٹ گیا تھا اور میں آٹھ سال پہلے کے امرتسر کو آٹھ سال بعد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھوا کر جب رجسٹر پر پاسپورٹ کا نمبر درج کروانے لگا تو دل کو ایک دھچکا لگا سا لگا۔ میں اتنا اجنبی، ناواقف اور بے یار اپنے وطن میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر میں بازاروں کی مٹر گشت کرنے نیچے اتر آیا۔

مسجد خیر الدین میں جھانک کر دیکھا۔ حوض میں گھاس اگ رہی تھی اور صحن میں دو لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ چوک گول ہٹی آ گیا۔ دوکانیں روشنیوں کے باوجود ویران، اندھیری اور اجڑی اجڑی تھیں۔ مسجد جان محمد کے ایک مینار پر پیپل کی شاخ اگ آئی تھی۔ یہ ہمارا محلہ تھا۔ اس مسجد کی ٹونٹیوں سے پانی پی کر کئی بار میں نے روزہ توڑا تھا۔ اب اس کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور غسل خانوں کی چھتیں ڈھے گئی تھیں اور حجرے میں دیا جل رہا تھا اور دو تین گندے کپڑوں والے کشمیری باتو بیٹھے چائے پکا رہے تھے۔ کوتوالی کی بڑی ڈیوڑھی کے باہر کمیٹی کے لیمپ تلے ایک جوتشی مہاراج بیٹھے تھے اور ایک بوڑھے لالے کا ہاتھ دیکھ کر کہہ رہے تھے!

"بس تھوڑا ہی کشٹ رہ گیا ہے لالہ جی۔"

میونسپل لائبریری کے سامنے والے باغ میں کمیٹی کا دفتر بن گیا تھا۔ جہاں اب زرد رنگ کے پتھروں والی سرکاری پیشاب گاہ تھی وہاں پہلے فالسے کے چھوٹے چھوٹے درخت ہوا کرتے تھے اور بڑ کا ایک گھنا پیڑ ہوتا تھا، جس کی چھاؤں میں پرانی قسم کا ایک بڑا سا بنچ بچھا رہتا تھا۔ میں گرمیوں کی جھلسا دینے والی لمبی لمبی دوپہروں میں کبھی کبھی دادا جان کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ دادا جان بنچ پر بیٹھے اونگھا کرتے اور میں بڑ کے گرے پڑے پتے جمع کیا کرتا۔ کبھی کوئی بھولی چڑیا دادا جان کے کندھے پر آ کر بیٹھ جاتی تو میں خوشی سے چیخنے لگتا۔

"دادا جان پکڑ لیں، پکڑ لیں---"

لیکن اب وہاں کوئی درخت اور کوئی بنچ نہ تھا اور کوئی بھولی چڑیا کسی کے کندھے پر آ کر نہ بیٹھتی تھی۔ یہاں سے میں واپس ہوٹل آ گیا۔ میں اپنی گلی کی زیارت صبح کرنا چاہتا تھا۔ جب سورج طلوع ہو چکا ہو اور مکانوں کی منڈیروں پر سنہری دھوپ چمک رہی ہو۔ رات کو چترا ٹاکیز میں فلم "دیوداس" دیکھنے گیا۔ کبھی اس سینما کا نام پرل ٹاکیز تھا اور یہاں نور دین نامی ایک گیٹ کیپر ہوا کرتا تھا۔ نور دین ہمارے محلے میں رہتا تھا۔ میں دوسرے تیسرے شام کو اس کی روٹی لے کر سینما جایا کرتا تھا اور اس بہانے فلم دیکھا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کس طرح میں شام ہوتے ہی نور دین کے گھر جا کر اس کی بیوی کے پاس بیٹھ جاتا جو روٹی پکا رہی ہوتی تھی۔ میں ٹکٹ لے کر اندر آ گیا۔ ہال میں رش بالکل نہیں تھا۔ لیکن چابڑی والوں نے چیخ و پکار سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ فلم ختم ہوئی تو میں رکشے میں بیٹھ کر

ریالٹو سینما کی طرف چل پڑا۔ بہت عرصہ گزرا جب یہ سینما بن رہا تھا تو ہم چھوٹے چھوٹے تھے اور سکول سے بھاگ کر اس کی زیر تعمیر عمارت دیکھنے آیا کرتے تھے۔ رکشا الیگزنڈرا پارک کے قریب سے گزر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں گراؤنڈ کے کناروں والے آم کے درخت زیادہ گنجان دکھائی دے رہے تھے۔ بینگو پارک میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس پارک میں دادا جان کے ساتھ کرکٹ میچ دیکھنے آیا کرتا تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ کھلی ہوتی۔ پارک میں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ لنچ کے وقفے میں ہم مالٹے، سنگترے اور مولیاں کھاتے، پھول توڑتے اور خوب اودھم مچاتے۔ میں نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا اور پارک میں دیکھا کہ دھوپ چمک رہی ہے۔ بینگو پارک کے آم کے درخت ہوا میں جھوم رہے ہیں اور ایک لڑکا سر پر کاغذ کی بناوٹی ٹوپی رکھے سوکھی ہوئی نہر کے پل پر بیٹھا مولی کھا رہا ہے اور میچ زور شور سے ہو رہا ہے اور لوگ اچھل رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں اور ایک آدمی گراؤنڈ میں بلا تھامے ادھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ اور پھر ایک دم اندھیرا چھا گیا اور بینگو پارک نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، دور ہو گئی بہت دور ہو گئی۔

ریالٹو سے ایک بجے رات واپس آیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔

پچھلے پہر آنکھ کھل گئی اور غیر شعوری طور پر اذان کا انتظار کرنے لگا اچانک خیال آیا امرتسر میں اذان نہیں ہوتی۔ یوں لگا جیسے ایک غیر ملک میں ہوں جہاں کی بول چال اور رسم و رواج سے بالکل ناواقف ہوں۔ بتی جلا کر گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے بستر سے اٹھا، سفید بوٹ پہنا مفلر اوڑھا اور سیر کرنے، پرانے مندروں کے درشن کرنے چل پڑا۔ آسمان پر ستارے کانپ رہے تھے۔ سردی بہت ہو گئی تھی اور گلیاں بازار بالکل سنسان تھے۔ امرتسر بڑا اکیلا اکیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے بازار میں سے گزر کر جب گلی کے سامنے آیا تو دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نہیں ------ ابھی نہیں! میرے دل! میرے دل!!

گلی کا دروازہ اکھڑ گیا تھا اور بجلی کے دونوں کھمبے آمنے سامنے ویسے ہی کھڑے تھے۔ پچھلے پہر کے دم توڑتے پھیکے کافوری دھند لکے میں دونوں جانب اونچے نیچے بینگے ٹیڑھے خاموش مکان یوں لگ رہے تھے جیسے افسردہ دل لوگ سر جھکائے کسی جنازے کے گزرنے کا انتظار کر رہے ہوں۔ خشک ہوا کا ایک دکھ بھرا جھونکا سرد آہ بھرتا ہوا میرے پاؤں چھو کر گزر گیا۔ میں اپنی گلی میں داخل نہ ہو سکا۔ بلکہ عقبی بازار میں سے گزرتا ہوا شہر سے باہر نکل آیا۔ آسمان پر مشرق کی جانب پو پھٹ رہی تھی اور آسمان پر ستارے بالکل پہلے کی طرح صبح کے ابھرتے ہوئے نورانی اجالوں میں بھڑک بھڑک کر ماند پڑتے جا رہے تھے۔ سرد ہوا میں اسی طرح درختوں اور سبزے کی تازگی اور کھلی فضا کا شگفتہ پن تھا۔ یہی وہ ہوا تھی -----

ہاں یہی وہ ہوا تھی جو چیت بیساکھ کی صبحوں کو موتیا اور چنبیلی کی ٹھنڈی میٹھی خوشبو اڑاتی مجھے جگانے ہمارے گھر آیا کرتی تھی جو میرے کانوں کے ہونٹ چوم کر سرگوشیوں میں کہا کرتی تھی جاگو جاگو! میرے پیارے! شہتوت کے گھنیرے پیڑوں میں سوئی ہوئی چڑیاں جاگ اٹھی ہیں۔ شہد کی مکھیاں میٹھی گنجاروں کے ساتھ رس کی تلاش میں اپنے اپنے چھتوں سے اڑ گئی ہیں اور لیموں کے پھولوں سے لدے ہوئے درختوں تلے کچی پگڈنڈیوں کے کناروں پر اگا ہوا گھاس صبح کی شبنمی ہوا میں لہرانے لگا ہے۔ تم بھی جاگو! صبح ہو گئی ہے، صبح ہو گئی ہے، --- ہمیں درختوں، پھولوں، چڑیوں اور پگڈنڈیوں نے تجھے بلانے بھیجا ہے --- اور میں اس مہکیلی ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ ساتھ اڑتا ہوا ان باغوں، کھیتوں اور کھلے میدانوں میں آ جاتا تھا۔

میں آج بھی انہی میدانوں، کھیتوں اور باغوں کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن آج مجھے کسی ہوا کا جھونکا جگانے نہیں آیا تھا۔ آج کسی چنبیلی کی خوشبو نے میرا منہ چوم کر مجھے نہیں اُٹھایا تھا۔ بلکہ آج میں اپنے آپ ہی ہوٹل میں بسر کی ہوئی پردیسی رات کے ناواقف بستر پر سے اٹھ کر اس طرف نکل آیا تھا۔ ویر کے والے پھاٹک کے پاس پہنچ کر مشرق میں صبح کا سنہری اُجالا جھلملانے لگا اور تاروں کے فانوس ایک ایک کر کے بجھنے لگے۔ بٹالہ جانے والی ریلوے لائن اُسی طرح بچھی ہوئی تھی۔ میں لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور جب اُس نالے پر آیا، جس کے ایک طرف چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ گاؤں --- اب بھی وہاں موجود ہے۔ لیکن وہ پیپل کا درخت غائب ہے، جس کے نیچے ایک رات دیہاتی لڑکیوں نے پردرد گیت گایا تھا اور دلہن کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

تجھے بابل کی گلیاں سپنا ہو جائیں گی۔
او شرمیلی دُلہن!

جامن کے درختوں میں سے بلند ہوتے ہوئے کائی زدہ مسجد کے مینار دھوئیں کے ستون معلوم ہو رہے تھے۔ سامنے محراب پر لگی ہوئی پاتھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

بعض کوٹھوں پر جنگلی گھاس اُگ رہی تھی اور جو ڈھے گئے تھے ان کے ملبوں پر گندگی کے ڈھیروں پر سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ہر مکان کی پیشانی پر لال کھریا مٹی سے "اوم" لکھا تھا۔ دوسری جانب جہاں کبھی آلوچے کے باغ ہوا کرتے تھے اب وہاں خانہ بدوش سانسیوں نے اپنے میلے کچیلے پھٹے ہوئے خیمے گاڑ رکھے تھے۔ خیموں کے اوپر کہرا جم رہا تھا۔ ایک جگہ ایک عورت جھاڑو دے رہی تھی اور قریب ہی کوئی کتا بھونک رہا تھا بستی کی جانب ایک مرغ نے اذان دی۔ جی خوش ہوا کہ مرغوں نے ابھی تک اذانیں دینا بند نہیں کیں۔ میں نے ایک کوٹھے کی کچی دیوار میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ آنگن صبح کی سردی میں سکڑ گیا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکشا ٹھٹھر رہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر لال مٹی سے "برچھا سنگھ سردار" لکھا تھا۔ ایک گلہری پھدک کر میرے پاس آئی اور اپنی شریر تھوتھنی اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیوں ری گلہری! اس مکان میں جو وہ کھدر کی چادر اوڑھ کر اپنے خاوند کی روٹی اور لسی کھیتوں میں لے جانے والی رہا کرتی تھی وہ کہاں چلی گئی ہے؟" گلہری نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پردیسی! اُس عورت کو میں نے اُن کھیتوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کا دوپٹہ سر سے گرا ہوا تھا اور چہرے پر موت ایسی زردی تھی اور قمیض جگہ جگہ سے پھٹ رہی تھی اور اس کے بعد میں نے اُسے پھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے زمین سے ایک سوکھا ہوا پتا اٹھا کر دیوار پر رکھا اور آگے چل پڑا۔

ندی کے دوسرے چھوٹے پل پر آیا تو مشرق کی جانب صبح کی روشنی تیزی سے بڑھنے پھیلنے لگی اور آسمان پر سورج کی اولین ملگجی کرنوں کا غبار اڑنے لگا۔ ہوا شبنم کی نمی سے مرطوب اور بوجھل تھی۔ اب لوکاٹ کے باغ شروع ہو گئے۔ باغ اسی طرح تھے اور گھرے سبز درختوں کے درمیان لوکاٹوں کے کیسری گچھے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ ہر پیڑ چوڑے پتوں والی شاخیں پھیلائے صبح کی خوشبو اور تازگی سے لبریز ہوا اور مشرقی کناروں سے جنم لیتی ان چھوئی، پاکیزہ روشنی میں گویا مراقبے میں گم تھا۔ نیچے نالے کا شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ میں نے آٹھ سال پہلے لوکاٹ کے ایک کیسری گچھے کو دیکھا تھا جو اپنی ٹہنی کی منڈیر پر سے جھک کر بہتے ہوئے پانی سے کہہ رہا تھا!

ہم سے پیار بڑھا لے! او گزرتے ہوئے پانی!

میں نے بھی اسی پانی کی ایک لہر سے پیار کا ناطہ جوڑ لیا تھا اور پانی کی چنچل، الھڑ اور نادان لہر مجھے بھول کر سمندر سے جا ملی ہے اور میں خاک اڑاتی بنجر زمینوں پر اکیلا کھڑا اُسے یاد کر رہا ہوں

ندی کی دوسری جانب اُسی طرح گندے جوہڑ پر کہرا جم رہا تھا اور کھاد کے ڈھیروں میں سے بخارات اٹھ رہے تھے۔ اب لوگ بستی کے کچے مکانوں میں سے باہر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ میں پٹڑی پٹڑی کمپنی باغ کی طرف ہو لیا۔ اب سیدھے ہاتھ کو مولیوں اور ساگ کی کھیتیوں کے پار ناخوں کے درخت دکھائی دینے لگے۔ یہ درخت چھریرے اور دُبلے پتلے تھے اور فضا میں انگلیوں کی طرح اُٹھے ہوئے تھے۔ سیاہ ٹہنیوں پر سے پتے جھڑ چکے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے اُن کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک سرخ پتا توڑ لیا۔ پتا شبنم میں بھیگ رہا تھا رات اُس پر اپنے آنسوؤں کے نشان چھوڑ گئی تھی۔ کیا یہاں بھی راتیں رویا کرتی ہیں؟ کیا ہم انہیں یاد آتے ہیں؟ میں نے رات کا پریم پتر اپنی جیب میں رکھ لیا اور جب دوبارہ نہر کی پٹڑی پر آیا تو میری آنکھیں سورج سے چار ہو گئیں۔ جاڑوں کا گہرا سرخ کانپتا ہوا، لرزتا ہوا، پگھلتا ہوا، بیضوی سورج آم کے درختوں کے سیاہ تنوں کے درمیان میں منڈیروں، درختوں کی پھنگوں اور گھاس کے خوشوں کے منہ لال ہو گئے۔ آٹھ سال بعد ان درختوں، کھیتوں اور باغوں میں سورج دیوتا کو طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی شان، اُسی آب و تاب اور اُسی جاہ و جلال کے ساتھ سونے کے رتھ پر سوار کرنوں کا صور پھونکتا اوپر اٹھ رہا تھا۔ اُس کی ایک بھی کرن تقسیم نہ ہوئی تھی۔ ایک بھی شعاع میلی نہ ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ اُسی طرح تھا۔ روشن، دمکیلا، تابناک، اور عظیم --- اُس کی نورانی، فراخ دل اور آزاد کرنیں، برچھا سنگھ کے گھر کے آنگن اور مسجد کے زنگ خوردہ میناروں پر اُسی بے نیازی اور خندہ پیشانی سے رقص کر رہی تھیں۔

اک شوخ کرن شہتوت کی ٹہنی پر آ کر ٹھٹک سی گئی اور مجھے سنہری پلکیں جھپکا جھپکا کر تکنے لگی۔ میں بھی اُسے پلکیں جھپکا جھپکا کر تکنے لگا۔ ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے اور ہمارے چہرے خوشی سے لال ہو کر دہکنے لگے۔ میں نے جھک کر اُس شرمیلی کرن کے ماتھے پر بوسہ دیا اور آگے چل پڑا۔

سورج کی بیٹی کرن! تو ہمیشہ میرے ہونٹوں پر چمکتی رہے گی۔

روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔

اتنے میں ایک سکھ عورت نہر کی پٹڑی پر نمودار ہوئی اور --- میں نے آنکھیں جھکا لیں اور جلدی جلدی وہاں سے گزر گیا۔ میرے پیارے وطن! تیرا دامن حیا کس نے تار تار کر دیا؟ تیرے سر سے دوپٹہ کس نے کھینچ لیا؟ تیری آنکھوں کی شرم کیا ہوئی جواب تو اپنے بیٹوں کے سامنے ننگا ہو گیا؟

کمپنی باغ میں ضرورت سے زیادہ چل پہل تھی اور لوگ یوں بے دلی سے سیر کر رہے تھے جیسے وہ بیمار رشتہ داروں کی عیادت کو جا رہے ہوں۔ موٹے بھدے، الٹے سیدھے، منحنی اور پستہ قد، ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں اور بے روح، بے جان چہروں والے بیوپاری مشین ایسی پھرتی اور تیزی سے گھاس پر چکر لگا رہے تھے۔ جگہ جگہ پھلوں کے چھلکے، مٹھائیوں کے لفافے اور پوری کچوریوں کے جھوٹے پتے بکھرے پڑے تھے۔ کہیں نہ کہیں کوئی تھل تھل پل پل موٹی للائین ہانپتی کانپتی اپنے آپ کو گھسیٹے لئے جاتی نظر آ جاتی تھی۔ درختوں کے تنوں کے پاس گھاس بڑھ رہی تھی۔ اور روشوں پر اکثر گرد اڑ رہی تھی۔ جس جگہ کبھی موتیے کے بے شمار پودے ہوا کرتے تھے اب وہاں خالی میدان تھا اور ایک طرف پان سگریٹ کا کھوکھا لگا تھا۔ میں اُس جگہ آ گیا جہاں آم کے درختوں کی چھاؤں میں نہر بہہ رہی تھی یہی وہ نہر تھی جس میں ایک دفعہ میں نے انور کے اوپر چھلانگ لگا دی تھی۔ نہر اُسی طرح پر سکون، ہموار اور سست رفتار کے ساتھ بہہ رہی تھی اور کناروں کی جانب تنکے اور پتے چکر کھا رہے تھے۔ درخت کی شاخیں بھی اُسی محبت سے نہر پر جھکی ہوئی تھیں اور فضا میں وہی بھنگ کی جھاڑیوں کی گرم گرم خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ذرا پرے ایک جگہ ایک سردار جی بیٹھے مسواک کر رہے تھے۔ میں نے آم کے کھردرے تنے کو ہاتھ سے چھوا۔ درخت کا جسم اُسی طرح گرم اور سانس لے رہا تھا۔ مجھے انور کا خیال آ گیا۔ سامنے والے پلاٹ میں، جہاں سے ہم صبح کے اندھیرے میں ناخیں اور امرود چرا کر بھاگ جایا کرتے تھے، اب کوٹھیاں بن گئی تھیں۔ جہاں سے ایک موٹر سائیکل شور مچاتی گزر رہی تھی۔

جب میں اُس درخت کے قریب سے گزرا جس پر ہم جٹ برہمن کا کھیل کھیلا کرتے تھے تو اُس نے میری طرف اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ نہیں بھائی! اب وقت نہیں ہے تم سے دکھ سکھ کی باتیں کرنے بیٹھا تو کوئی دیکھ لے گا اور جیل میں ڈال دیا جاؤں گا۔ تمہارا

شہر پولیس کا سپاہی بن کر میرے پیچھے پیچھے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ اب رخصت بھائی درخت!

جامن کے پیڑ نے اپنی ٹہنیاں جھکا کر پوچھا۔ انور، صفیہ، سعیدہ، رضیہ اور محمودہ کیسی ہیں۔؟ میں انھیں اپنے میٹھے جامن گرا کر کھلایا کرتا تھا۔ مجھے وہ ساری کی ساری یاد ہیں؟ کیا میں بھی انھیں یاد ہوں؟ --- جامن کے اونچے درخت! تمھیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ وہ لڑکیاں تمھیں بالکل بھول گئی ہیں۔ وہ امرتسر کو گوکل کی مارکیٹ سمجھتی ہیں جہاں سے نئے نئے ڈیزائنوں کا کپڑا خریدا جا سکتا ہے انھیں کمپنی باغ کا ایک بھی پھول ایک بھی درخت یاد نہیں رہا۔ رضیہ چھ بچوں کی ماں ہے اور ساتواں پیدا کر رہی ہے۔ سعیدہ کو طلاق ہو گئی ہے اور وہ گھر پر کاپیاں پنسلیں بیچ کر اپنے بچوں اور بوڑھے باپ کا پیٹ پال رہی ہے۔ محمودہ خشک میوہ جات کے ایک تاجر سے بیاہ دی گئی ہے اور پہلے سے زیادہ خشک ہو گئی ہے۔ صفیہ کا بیاہ ایک ٹھیکیدار سے ہوا تھا۔ وہ دیکھتے دیکھتے اتنی موٹی ہو گئی کہ اُس کے خاوند کو دوسرا بیاہ کرنا پڑا۔ اس کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اب وہ پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ اب وہ گھر کی لونڈی ہے اور اپنی ساس، خاوند اور سوت اور سوت کے بچوں کی خدمت کرتی ہے اور روکھی سوکھی کھا کر سو رہتی ہے۔ تمھیں یاد ہے وہ کتنی کھلنڈری ہوتی تھی اور تمہاری چھاؤں میں وہ کتنا شور مچایا کرتی تھی۔ اس کے بلند اور نقرئی قہقہوں کی آواز تم بھولے نہیں ہو گے۔ اب اس کا رنگ زرد ہے، آنکھیں سیاہ حلقوں میں چھپ گئی ہیں اور اب اُسے کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر مکان کی سیڑھیوں، پچھلی کوٹھڑیوں اور دروازوں کی اوٹ میں آنسو بہاتی ہے اور کوئی اُسے تسلی کے دو بول کہنے والا نہیں۔

جامن کے پیارے درخت! میں کبھی انھیں ملا تو تمہارا سلام کہہ دوں گا۔

ہاں ---- انھیں میرا بہت بہت سلام کہنا اور پیار دینا اور کہنا میری بچیو! جہاں بھی ہو، زندہ رہو۔ خدا تمہارے دکھوں کو کم کرے اور تمہارے اچھے دن جلدی لائے تم نے ہمیں بھلا دیا ہے لیکن تمہارا جامن کا درخت تمھیں نہیں بھلا سکا۔ اُسے تمہاری ایک ایک بات یاد ہے۔ وہ راتوں کی غمگین خاموشی میں تمھیں یاد کر کے آہیں بھرا کرتا ہے اور ساون میں جب مینہ برستا ہے تو وہ چپکے چپکے رویا کرتا ہے میری پیاری، شرمیلی، ہنس مکھ اور بد نصیب بچیو!

اگر دھرتی نے میرے پاؤں نہ جکڑ رکھے ہوتے تو میں تمہارے ساتھ ہی یہاں سے کوچ کر جاتا۔ میں ہر سال برسات میں کالے کالے جامنوں سے لدی ہوئی شاخیں جھکائے تمہارا انتظار کیا کرتا ہوں۔ کیا تم پھر کبھی نہ آؤ گی؟

نہیں پیارے درخت! اب ہم کبھی نہ آئیں گے۔ اب ہمیشہ کے لئے الوداع! میں نے جامن کے درخت کو سلام کیا اور وہاں سے چل دیا۔

بکاؤلی کے درخت پر سے میں نے ایک بند پھول توڑ دیا۔ یہ پھول کچا اور چھوٹا تھا۔ میں نے اُسے جیب میں رکھ لیا اور شریف پورے کی طرف آ گیا اگر ریلوے لائن سے شریف پورے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے ایک پگڈنڈی پر سے گزرنا پڑتا تھا، جس پر کھٹے کے درختوں نے اپنی چھاؤں کر رکھی ہوتی تھی۔ بہار میں یہ راستہ کھٹے کے سفید پھولوں کی خوشبو سے مہکا کرتا تھا۔ آج مجھے اس پگڈنڈی پر سے ناک پر رومال رکھ کر گزرنا پڑا۔ سوائے غلاظت اور گندگی کے ڈھیروں کے یہاں اور کچھ نہ تھا۔ کبھی یہ بستی بڑی صاف ستھری اور نویں نکور ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب ہر مکان دوسرے مکان کی حالت پر نوحہ کناں تھا۔ چھجے زیادہ جھک آئے تھے۔ دروازوں پر میل جم رہا تھا۔ کھڑکیوں کا روغن دھوپ اور بارش کھا گئی تھی۔ پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔ کسی ایک کھڑکی پر چق نہ تھی اور ہر کھڑکی اُس آنکھ کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس کی پلکیں غائب ہوں۔ ہر مکان ننگا تھا اور کپڑے اُتارے کسی فاحشہ عورت کی طرح راہگیروں کو گھور رہا تھا۔ رانی بازار کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ گول مسجد میں گوردوارہ تھا اور نیچے گھنشام داس شمشان داس پنساری کی دوکان تھی، جو سیتارام سیتارام بھجن گاتا تھڑے پر گائے کے گوبر کا لیپ کر رہا تھا۔ گلی کے وسط میں ایک جوان لڑکی کھڑی میلا سا سویٹر بن رہی تھی اور اپنی ہمسائی سے جو کھڑکی پر ٹانگ رکھے کھڑی تھی کہہ رہی تھی:

"منگ پھلی کھاؤ گی شیلا؟---"

وہ خود بھی "منگ پھلی" ہی تھی۔ بھنی ہوئی، گرم اور خشک!-- سیتارام! سیتارام!

رانی بازار میں میں نے اپنے کلاس فیلو کو دیکھا کہ اپنی برقع پوش بیوی اور بچوں کو ساتھ لئے ہر مکان کو حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا گزر رہا ہے۔ عورت بدحواس سی تھی اور اپنے خاوند کے ساتھ لگی جا رہی تھی۔ میں شریف پورے سے باہر آ گیا۔ پاتھی گراؤنڈ کو عبور اور نئی خانقاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اب لال حویلی کی عمارت سامنے تھی اور یہیں سے گزر کر

اپنی گلی میں داخل ہونا تھا۔ لال حویلی کی آدھی عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی اور باقی نصف کی حالت بے حد خستہ تھی۔ منڈیروں پر سوکھی ہوئی گھاس اُگ آئی تھی۔ کھڑکیوں کی چوکھٹیں جلی ہوئی تھیں اور اندھی آنکھوں کی طرح خلاؤں میں تک رہی تھیں۔ کبھی ان کھڑکیوں پر بانس کی نازک چلمنیں پڑی رہتی تھیں اور ان کے پیچھے سرگوشیوں میں باتیں کرنے والی اور میز پوشوں پر خوبصورت پھول کاڑھنے والی شریف زادیاں رہا کرتی تھیں۔ ان کے شرمیلے اور محجوب چہرے سوائے ان کے گھر والوں کے اور کبھی کسی نے نہ دیکھے تھے۔

کہاں چلی گئیں؟ کہاں چلی گئیں؟ میری بہنیں! میری بہنیں!!

اب میں اپنی گلی میں تھا اور دل پر ہاتھ رکھے گلی کے پرانے فرش پر سے گزر رہا تھا۔ گلی میں سردی کی وجہ سے ہلکی ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے قدموں کی آواز اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ ہر مکان جیسے مجھ پر جھکا ہوا تھا اور گلی جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی پچکتی جا رہی تھی۔ چھوٹی اور تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ میری نظر گھبرانے لگی اور ہر مکان جلدی جلدی گزرنے لگا یہ رضیہ کا مکان ہے دروازہ کھلا ہے۔ ڈیوڑھی میں اپلوں کا ڈھیر ہے۔ یہ صفیہ کا مکان ہے۔ اس کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہے اور اندر دیوان خانے میں ایک گائے بندھی ہوئی ہے اس دیوان خانے میں گرمیوں کی دوپہروں کو بڑی رونق ہوتی تھی۔ انور، صفیہ، رضیہ اور محمودہ سب لڑکیاں مل جل کر بیٹھتیں۔ سلائی کا کام کرتیں اور کروشئے کے رومال بُنتیں اور آپس میں خوب ہنسی مذاق کرتیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت فرش دھو رہی تھی۔ کیوں ماتا جی! وہ ستواں، لمبی، تیکھی ناک والی اور ہنس کی چال چلنے والی لڑکی کہاں ہے؟ ماتا جی نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے بائیں جانب دیکھا کہ محمودہ کا مکان غائب ہے اور اس کی جگہ گوبر اور ملبے کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اوپر، سامنے دیوار کے ساتھ آتش دان کی کارنس برہنہ تھی۔ یہاں محمودہ اسکول سے واپس آ کر اپنی کتابیں رکھا کرتی تھی۔ اب وہاں ایک کوّا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ یہ ہمارا مکان ہے۔

میں ذرا ٹھٹھک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اپنے مکان سے آنکھیں چار کرتے گھبرا رہا تھا لیکن یہ ہمارا مکان نہ تھا۔ دروازہ اکھڑ چکا تھا۔ سیڑھیاں مٹی کی تہوں میں چھپ رہی تھیں۔ میں اندر آ گیا۔ اوپر چھت کی بجائے آسمان جھانک رہا تھا۔ سامنے انور کے مکان کی کھڑکی ٹیڑھی ہو گئی تھی اور چوکھٹ کا سیمنٹ اکھڑ چکا تھا اوپر منڈیر پر آمنے سامنے دو ڈبل اینٹیں پڑی

تھیں۔ جس طرح قبر کے اوپر نصب کر دی جاتی ہیں۔ ایک چھپکلی دھپ سے بوسیدہ دیوار پر سے میرے قدموں میں گری اور بھاگ کر ایک بل میں گھس گئی۔ نہیں یہ ہمارا مکان نہیں۔ ہمارا مکان نہیں ہو سکتا۔ وہ مکان کہاں ہے جس کے آنگن کی دیوار پر عشق پیچاں کی کاسنی پھولوں والی بیل تھی اور جس کے کمرے میں سرما کی راتوں کو سماوار گرم ہوا کرتا تھا اور اس میں سے سفید سفید بھاپ نکلا کرتی تھی اور اس گرتی بارش میں دادا جان کے گانے کی اُداس آواز آیا کرتی تھی۔

نکیاں نکیاں پون پھواراں
اکناں دیاں نے موج بہاراں

اور میرے اجڑے ہوئے ویران گھر کے آنگن میں بارش ہونے لگی اور کالی سرد رات میں گلی سنسان ہو گئی اور دادا جان کی پر سوز آواز بند دریچوں، ٹپکتے چھجوں، گرتے پرنالوں اور چپ چاپ گیلی منڈیروں کے ساتھ لگ کر رونے لگی اور سامنے والی کھڑکی میں روشنی ہوئی اور ایک سانولی سی لڑکی جیسے نیند میں اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور چق اُٹھا کر گلی میں جھانکنے لگی --- کوئی نہیں، کوئی نہیں --- گلی ویران ہے۔ بارش ہو رہی ہے، ہوا اُڑ رہی ہے اور سائبانوں سے سر ٹکرا کر چیخ رہی ہے --- بالوں کی سیاہ لٹ پھسل کر اُس لڑکی کے ماتھے پر جھولنے لگی اور بارش تیز ہو گئی اور مکانوں کے پرنالوں کا شور بڑھ گیا اور ہمارے آنگن والی بیل کے نیلے پھول پتوں کی چھتریوں میں چھپ گئے اور کھڑکی میں جھانکنے والی لڑکی کے سانولے رخسار کا ریشم لرزنے لگا اور سیاہ تل دھڑکنے لگا --- سردی، سردی، سردی --- سماوار لاؤ، چاء کی پتیاں لاؤ، نیلی پھولدار پیالیاں اور چنار کی لکڑی کا ٹرے اٹھا لاؤ اور آگ جلاؤ --- میں نے جلدی سے آگ روشن کی، سماوار میں پانی گرم کیا کارنس پر سے چنار کی لکڑی کا ٹرے اٹھایا اور نیلی پھول دار پیالی میں سبز چاء ڈال کر جب انور کی طرف بڑھا تو اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کھڑکی بند کر دی اور عشق پیچاں کے پھول ایک ایک کر کے جھڑ گئے، آنگن کا فرش اکھڑ گیا۔ دیواروں میں شگاف پڑ گئے، سیڑھیاں مٹی کی تہوں میں چھپ گئیں اور مکان دادا جان سمیت ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ اور ایک مکروہ صورت گندی چھپکلی دھپ سے میرے قدموں میں آن گری۔

میں نیچے گلی میں آ گیا۔ سامنے وہ دیوان خانہ تھا، جہاں جاڑوں کی بارش میں انور کی

نانی ہمیں پرانے کشمیری گیت سنایا کرتی تھی اور انور فاختائی رنگ کی گرم فرد میں کانگڑی چھپائے بیٹھی اپنی اُجلی اُجلی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اوپر وہ کھڑکی تھی جس کی ذرا سی چق اُٹھا کر وہ مجھے گلی میں سے گزرتا دیکھا کرتی تھی اور اس کی ایک لٹ پھسل کر ماتھے پر آ جایا کرتی تھی اور جہاں اب کوئی چق نہ تھی، کوئی انور نہ تھی ---- دیوان خانے کی آدھی چوکھٹ جل چکی تھی اور آدھی چوکھٹ کے کونوں پر مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے!۔

میری محبتوں کے تاریک کفن! میرے پیار کی عریاں بے گور و کفن لاشیں! سعیدہ کے مکان کی جگہ محلے کا کوڑا کرکٹ جمع ہوتا تھا۔ یہی وہ مکان تھا، جس کی ڈیوڑھی میں ایک رات انور نے میرا منہ چوم کر کہا تھا:

"وے چارلی! مجھے خط نہ لکھا کرو۔"

نہیں لکھوں گا، نہیں لکھوں گا ---- میں گزرتا گیا، بھاگتا گیا، اُلٹتا گیا ---- کچھ نہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ نہ دیکھ سکتا تھا۔ گلی سے باہر آ گیا اور تیز تیز ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گلی [illegible] حواس باختہ آتشک زدہ رنڈی کی طرح اپنے تمام کپڑے اُتارے، کیچڑ میں لت پت میرے تعاقب میں ہے۔ میں بھاگ کر ہوٹل میں آ گیا۔ دروازہ زور سے بند کیا اور بستر پر گر پڑا ---- دن گزر گیا شام ڈوب گئی، رات آ گئی۔ میں بستر پر پڑا رہا رات زیادہ ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ مکانوں کی روشنیاں گل ہو گئیں۔ بازار ویران ہو گئے۔ لوگ خاموش ہو گئے اور کتے بھونکنے لگے۔ میں چپکے سے اٹھا اور بازاروں میں سے ہوتا ہوا اپنی گلی کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہر طرف گہری، عمیق خاموشی تھی۔ کسی مکان میں کوئی روشنی نہ تھی۔ کوئی آواز نہ تھی۔ میں نے آہستہ سے جیب میں سے ہاتھ نکال کر گلی کے پاؤں چھونے چاہے۔ گلی نے پاؤں پیچھے کر لئے۔

میرے وطن کی بیٹی! میری سنگدل بیوہ گلی! تجھے کس کی نظر کھا گئی جو تیرے سہاگ کی ایک بھی نشانی سلامت نہ رہی۔ کل تو میرے شہر کی مانگ تھی۔ کل اس مانگ میں صندل اور سیندور کا سرخ فرش بچھا تھا۔ آج تو ایک گندی نالی ہے، جس کے کناروں پر کوڑے کے ڈھیروں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ ایک دن تیرا آنچل سر سے ڈھلک گیا تھا تو سورج نے شرم سے مغرب میں اپنا منہ چھپا لیا تھا اور آج تو برہنہ سر، ننگے پاؤں چوک میں کھڑی ہے اور ہر غیر مرد سے آنکھیں لڑا رہی ہے۔ کل تجھے میلوں سے ہماری بُو آ جایا کرتی تھی۔ آج تو

قریب سے بھی ہمیں نہیں پہچان رہی۔ ہم نے تجھ سے جدا ہو کر ہر محفل میں تیرے گیر
گائے، ہر گیت میں تیرا نام لیا، ہر نام میں تیرا روپ دیکھا اور ہر روپ میں تیرے نام
مالا جپی ۔مگر تو نے ہمیں بھلا کر دوسروں سے ناطہ جوڑ لیا۔ وفا کا سبق ہم سے سیکھا اور وفادار
کا پیمان دوسروں سے باندھ لیا۔ محبت کی قسمیں ہم سے کھائیں اور جے مالا دوسروں ر
گلے میں پہنا دی۔ تو نے ہماری قبر پر اگے ہوئے پھول سے رقیب کا گریبان سجایا ہے۔ ا
نے ہماری چھاتی سے دودھ پی کر ہمارے دامن پر خون اگل دیا ہے۔ تو نے ہم سے اچ
سلوک نہیں کیا۔ ہم نے تجھے بلایا۔ تو نے منہ پھیر لیا۔ ہم نے آواز دی۔ تو نے کانوں پر ہا
رکھ لئے۔ تیرے دروازے پر سورج نے دستک دی اور تو نے کہا گوالا دودھ لے کر آ
ہے۔ تیرے آنگن میں چاند نکلا اور تو نے لحاف اوپر کر لیا اور کھڑکی بند کر دی۔ ہم نے تج
دودھیا گنبد، مصفا حوض اور موتیے کے پھولوں والے صحن دیئے اور تو نے وہاں بھینسیں
باندھیں گنبدوں میں جانوروں کے گھونسلے بنائے اور چلمنوں والی کھڑکیوں کو آگ لگا دی۔
منڈیروں پر سرخ ریشمی دوپٹے ڈال گئے تھے۔ تو نے وہاں سوکھی ہوئی خشک گھاس اگا دی
اب مہر بلب کیوں ہے؟ اب خاموش کیوں ہے؟ بتا! وہ گوالے کدھر گم ہو گئے جو
اندھیرے بکریوں کے ریوڑ لے کر دودھ بیچنے آیا کرتے تھے؟ وہ دلہنیں کہاں کھو گئیں
کی ڈولیاں پو پھٹے رخصت ہوا کرتی تھیں۔؟ کل جن دہلیزوں پر محبت کے دیئے جلائے جا
تھے آج وہاں راکھ ملا اندھیرا اڑ رہا ہے اور کل جن ڈیوڑھیوں میں پیار نے سرگوشیاں
تھیں آج وہاں بھینسیں ڈکرا رہی ہیں اور کل جو کانٹا پاؤں میں لگا تھا آج اُس کی چبھن دل
محسوس ہو رہی ہے --- سن! اے پتھر دل مورتی! --- ہرجائی! اب ہم بھی تجھے پہچا
گے۔ اب ہم بھی تجھے بھلا دیں گے۔ راتوں کو جب تیری یاد آواز دے گی تو ہم کانوں
ہاتھ رکھ لیں گے۔ چلتے چلتے جب تیرا خیال آئے گا تو ہم وہ راستہ چھوڑ دیں گے۔
تیرے اداس کھیتوں، ویران گلیوں اور اجاڑ باغوں کو بھلا دیں گے۔ اور نئے باغ لگائیں گے
نئے کھیت بنائیں گے نئی گلیوں کے سنگ بنیاد رکھیں گے، نئی زمینوں میں ہل چلائیں
اور ایک نئے امرتسر، نئے کمپنی باغ اور نئی رضیہ اور نئی صفیہ کو جنم دیں گے اور پھر جب
ہمارے کمپنی باغ میں سورج کی سنہری کرنوں میں پہلا پھول مسکرائے گا تو ہم اس کا
تیرے کھنڈروں کی طرف پھیر کر تجھے کہیں گے دیکھ اے پتھروں کے شہر! اس پھول

ہمارے خون کی سرخی اور پسینے کی مہک ہے۔ اتنی دیر تک کے لئے رخصت ۔ میرے
دوست میرے دشمن شہر! تیری دوستی میں ہم نے کوئی سکھ نہ پایا۔ تیری کانٹوں بھری
جھاڑیوں پر ہم نے انگور کی بیل چڑھائی اور ہر گچھا زخمی ہو گیا۔ تو وہ کھجور کا درخت ہے جو
دھوپ لگے تو سایہ کھینچ لیتا ہے اور بھوک لگے تو پھل اوپر لے جاتا ہے۔ اب ہم بھی اپنا پھل
تجھ سے دور لے جائیں گے۔ اب ہم بھی اپنا سایہ تجھ سے کھینچ لیں گے۔ اب ہم بھی دامن
کشاں گزریں گے اب کوئی گلاب کا پھول توڑنے تیرے شہر نہیں آئے گا۔ اب لاہور ہی
سچے گلاب کا پھول ہے اب لاہور ہی کمپنی باغ ہے، لاہور ہی شریف پورہ ہے اور لاہور ہی
امرتسر ہے۔ ہمیں بنجر زمینوں پر نئی زمینوں پر ہل چلانے والے مبارک اور تجھے رات کی رانی
کے جھنڈ میں بیٹھ کر آلو چھولے کھانے والے مبارک! --- چلو! چلو! --- میری دلگیر،
سوگوار یادوں کے ویران جزیرو! اپنے چہروں پر خاک ڈال کر تاریک سمندروں میں ڈوب جاؤ۔
رانی بازار میں سہمی سہمی پھرنے والی میرے دوست کی بیوی! اپنے بچوں اور خاوند کو لے کر
امرتسر سے بھاگ جا۔ امرتسر مر چکا ہے امرتسر مر چکا ہے۔ یہ امرتسر نہیں ہے، اُس کی سڑتی
ہوئی پھولی ہوئی نعش ہے جو دربار صاحب کے تالاب میں تیر رہی ہے۔--- میں نے کوٹ
کی جیب میں سے گلاب کی مرجھائی ہوئی پتیاں نکال کر گلی کے دروازے پر رکھیں اور چپ
چاپ واپس ہوٹل آ گیا۔ دوسرے روز میں پہلا پاکستانی تھا جو اٹاری بارڈر پر اپنا سامان چیک
کروا رہا تھا۔ کسٹم آفیسر نے بکاؤلی کا بند پھول غور سے دیکھا اور بولا:

"یہ کیا ہے جی؟"

"بکاؤلی کا پھول۔"

"اس میں کوئی سونا وغیرہ تو نہیں چھپا رکھا؟"

اتنا کہہ کر کسٹم آفیسر نے چاقو سے پھول کو چیر ڈالا، امرتسر کی آخری نشانی کو بھی
ہلاک کر دیا۔ پھول نے کچھ نہ کہا۔ میں نے بھی کچھ نہ کہا۔ کسٹم افسر سونا ڈھونڈتا رہا اور پھول
کی خوشبو اڑنے لگی، سونا اڑنے لگا اور سونا اڑتا رہا اور میں اسے وہیں چھوڑ کر لاہور جانے والی
بس میں سوار ہو گیا۔ الوداع! میرے امرتسر! میرے یروشلم! میرے قرطبہ! تیرے
معبدوں کی تربتیں ویران ہو گئیں، تیری سرخ فصیلوں کے برج کھنڈر بن گئے، تیرے جالی
دار مرمریں جھروکوں کے سینے چھلنی ہو گئے اور تیرے بیت المقدس پر سے یسوع مسیح تجھے

اکیلا چھوڑ کر پرواز کر گئے۔ تو نے ہماری شہزادیوں کو ہر چوک میں رسوا کیا اور ہمارے شہزادوں کو گلی گلی قتل کیا۔ تو نے ہمارے محلات کو قبرستان بنا دیا اور قبروں کو ویران کر دیا۔ ہمیں مر کر بھی تیری آغوش میں سکون نہ ملا۔ کل ہم تاج شاہی پہن کر تیرے بازاروں میں نکلا کرتے تھے اور آج تیری منڈیروں پر سے ہم پر پتھروں کی بارش ہوئی۔ کل ہم آنکھوں میں محبت کے درِشہوار لئے تیرے گھر میں اُترے، تو نے ہمیں کوئی کمپنی باغ، کوئی ٹھنڈی چھاؤں والی نہر نہیں دی۔ کوئی سماوار اور گلاب کی کھیتیاں نہیں دیں۔ تو نے گدھوں کو پھولوں کے ہاروں سے لادا ہے اور ہرنیوں پر تیر برسائے ہیں، گولیاں برسائی ہیں۔ لیکن ہم تجھ سے پیار کرتے ہیں اور تجھے اپنے دل میں اور اپنا دل تیری پہلی سیڑھی پر رکھتے ہیں۔ ہم نے انور کا مکان، رضیہ کا آنگن اور صفیہ کا دوپٹہ دے کر تجھے پایا ہے۔

کیا تو بھی ہمیں بھلا دے گا؟

تاریک صلیب اور زرد چاند

اور پھر یوں ہوا کہ پھاگن کے مہینے کی ایک رات کو جبکہ پورا چاند سبز آسمان کے وسط میں چمک رہا تھا اور آموں پر سرخی آ رہی تھی اور کھلی فضاء میں اڑتے ہوئے بھونرے سویٹ پیز اور لیموں کے رس دار پھولوں کی خوشبو سے مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اُس نے چائے بنائی اور ہم چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہ اک منزل سرخ مکان کوارٹرز کی طرز کا تھا اور شہر سے باہر ایک سوکھی ہوئی ویران کھائی کے پاس واقع تھا۔ کچے آنگن میں نیم کا ایک گھنا پیڑ تھا جس کی ٹہنیوں پر پھول آ رہے تھے ایک طرف کونے میں اوندھے پڑے ٹوکرے میں مرغیاں بند تھیں۔ کنارے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیوں پر گرد پڑی تھی اور بازو والے کمرے میں اس کی بیمار ماں اور بہن بھائی سو رہے تھے۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہاں چھت پر مدھم بلب روشن تھا اور سیلن کے باعث دیواروں کی سفیدی دو ایک جگہ سے اکھڑ رہی تھی پرانی وضع کی آرام کرسیوں پر دھول کی تہہ جمی تھی اور آتشدان پر فریم میں سجی ہوئی کچھ تصویروں کے درمیان چند ایک ایک کتابیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ پاس ہی ایک کالے رنگ کا میلا سا گلدان باسی پھولوں سے بھرا ہوا تھا سیز پر کچھ نئے اور پرانے انگریزی رسالے بکھرے ہوئے تھے۔ پلنگ پر سبز لحاف کے اوپر کوروڑے کا ایک بادامی پتلون بے خیالی میں پھینک رکھا تھا کھڑکی کے دونوں پٹ ویران کھائی کی جانب کھلے تھے جدھر سے آنے والی جنک ہوائیں لیموں کے پھولوں اور سبزے کی مہک تھی۔ سامنے درختوں کے تنوں میں سے ترکاریوں کے کھیت اور دور ٹاہلیوں کے جھنڈ بھرپور چاندنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے کسی وقت انہیں درختوں کے جھنڈوں میں کسی جانور کی اُداس اواز اپنے پیچھے ایک ویران سنسناہٹ چھوڑتی ہوئی گونج جاتی میرے دوست نے سگریٹ جلا کر پیالیوں میں چائے انڈیلی تو فضا میں اُس کی تازہ مہک کھائی میں اُگے ہوئے سرکنڈوں کی بو سے مخلوط ہو گئی رات بڑھی چپ چاپ تھی اور ہر طرف ایک جادو بھری، کچھ کہتی، کچھ سنتی، گہری خاموشی طاری تھی جس میں کبھی کبھی باہر جھاڑیوں میں چھپ کر بولنے والے جھینگروں کی آوازیں مخل ہو جاتی تھیں۔ چائے بنا کر اُس

نے ایک گھونٹ لیا۔ اپنی جگہ سے آہستہ سے اٹھا اور کالے گلدان کے پاس جا کر باسی پھولوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا:

"تم نے گالزوردی کی کہانی سیب کا درخت ضرور پڑھی ہو گی اور تمہیں اس کی ہیروئن میگن بھی یاد ہو گی میگن --- یہی اس کا نام تھا کالے بالوں اور غمگین آنکھوں والی بد نصیب لڑکی، جو اپنے معصوم بہن بھائیوں کے ساتھ دیہاتی مکان میں رہتی تھی۔ جس کے عقب میں سیب کے درختوں کا پرانا باغ تھا اور جسے اُس کے بے وفا محبوب نے پہلی بار سبز ڈھلان سے نیچے اُترتے دیکھا تھا۔ اُس نے ٹوکری اٹھائی تھی اور کالے بال بہار کی ہوا میں اُس کے ماتھے پر لہرا رہے تھے۔ مسافر نے پوچھا یہاں رات بسر کرنے کو کوئی جگہ مل جائے گی؟ میگن نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک چشمہ ہے وہاں ہمارا گھر ہے میرے ساتھ آیئے وہاں میری امی اور ابا ہیں اور ایک گائے بھی ہے اور ایک گائے بھی ہے اور ہم اپ کو چائے --- اور پھر ایک شام اُسی دیہاتی مکان کے باغ میں دیوار کے ساتھ لگ کر مسافر نے میگن سے کہا تھا جب سب سو جائیں تو رات کو سیب کے درخت کے نیچے آنا اور پھر ایک روز میگن اُسی درخت کے نیچے چشمے کے نیلے پانی میں مردہ پائی گئی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر پتھروں میں سنہرے پھولوں کا ایک پودا اُگ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کسی ننھے بچے کے چہرے کی طرح معصوم اور پرسکون تھا۔ مرنے سے پہلے اُسے سیب کے شگوفے کی چھوٹی سی ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی جسے اُس نے بالوں میں لگا رکھا تھا۔

میری محبت کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے کہیں سے سیب کے شگوفے کی ٹہنی نہیں مل سکی۔ اور میرے سرہانے پتھروں میں سنہرے پھولوں کا پودا نہیں اُگا ہے میں نے بھی جب پہلی بار آلیو کو اومنی بس میں سے مال روڈ پر اُترتے اور فٹ پاتھ پر اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ مجھے بالکل میگن ہی لگی تھی زردی مائل گندی سا رنگ، درمیانہ جسم، نہ پاؤڈر، نہ لپ سٹک، سر کے بیچوں بیچ نکلی ہوئی باریک مانگ، ہلکے بھورے بال یقین کرو۔ مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے سیب کے درخت کی ہیروئن پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھائے مرغزار کی ڈھلان سے نیچے آ رہی ہو۔ مال روڈ پلک جھپکنے میں ایک پرسکون وادی میں تبدیل ہو گئی۔ زمین سبزے اور پھلوں سے ڈھک گئی اور نکھرا ہوا نیلا

آسمان پرندوں کے راگ سے گونج اٹھا اور ہواؤں میں شہر کی خوشبو مل گئی اور میں ابھی میگن سے آگے بڑھ کر کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ایک موٹر تیز ہلدن دیتی گزر گئی اب میگن یا آلیو میرے قریب آ گئی تھی۔ اپنے آپ میں گمن اور خاموش، یوں ایک ایک قدم اُٹھاتی جیسے پھلوں پر چل رہی ہو۔ میں پیپل کے درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ آلیو نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک پل کے لئے اپنی آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ ذرا سا مسکرائی ہو۔ یہ مسکراہٹ بڑی حیرت انگیز اور وحشی تھی۔ اس میں کوئی بھولا بسرا خواب یاد دلانے والی کیفیت تھی میں نے دیکھا کہ آلیو کے گالوں کا اوپر کا حصہ گلابی تھا اور بھورے خشک بال چمک رہے تھے فارول سینٹ کی اُداس مہک کا تیز سانس میرے ہونٹوں کو چھو کر گزر گیا۔ آلیو اگرچہ پاکستانی کرسچن لڑکی تھی لیکن اس کی چال میں قدیم سنتھالی شہزادیوں ایسا وقار اور بانکپن تھا تھوڑی دور جا کر وہ اس گلی میں گھوم گئی جو ہماری بلڈنگ کے عقب میں پرائیویٹ کمپنیوں کے دفتروں کی جانب نکل گئی ہے میں اپنی کتابوں کی دوکان کے شوروم میں واپس آ گیا۔ مجھے اس دوکان میں نوکری کرتے دو سال ہو گزرے تھے مگر آج تک ایسی کرسچن لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ میرا کام صبح سے شام تک یہاں شوروم میں گاہکوں کا خیر مقدم کرنا اور انہیں ضرورت کی ہر کتاب اور رسالہ وغیرہ بہم پہنچانا ہے اور اس دوران میں کئی کرسچن اور غیر کرسچن لڑکیوں سے سابقہ پڑا ہے لیکن میں نے ایسی راز بھری مسکراہٹ سمٹی سمٹی شبنمی آنکھیں اور سنتھالی شہزادیوں ایسی پر تمکنت کھلی پیشانی نہیں دیکھی۔ جیسا کہ تم جانتے ہو میں فطرتاً شرمیلا اور کم آمیز ہوں۔ آج تک رسمی گفتگو کے سوا کبھی کسی لڑکی سے کھل کر بات کر سکوں اُس سے اظہار عشق کر سکوں۔ میرا باپ مر چکا ہے ماں دائم المریض ہے دو جوان بہنیں کنواری بیٹھی ہیں۔ بادامی باغ سے ہر روز سائیکل پر آتا ہوں اور سائیکل پر واپس جاتا ہوں۔ بارش ہو یا آندھی، مجھے اس شوروم میں آنا ہی پڑتا ہے۔ ان حالات میں کوئی کیا عشق کرے گا؟ اور پھر روزانہ دس میل سائیکل چلانے سے تو عشق ویسے ہی ختم ہو جاتا ہے اس کے باوجود آلیو کو ایک نظر دیکھ لینے سے میں اپنے آپ کو کھو بیٹھا تھا اور اُسے ایک بار پھر دیکھنے کے لئے خود بخود بس سٹاپ پر پہنچ گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آلیوں کی شخصیت کے تمام رنگوں میں سب سے الگ اور سب سے نمایاں ایک ایسا رنگ نظر آ گیا ہے جو میرا اپنا رنگ، ہے وہ ایک ایسی قدیم اور پر

اسرار خوشبو بن کر میرے قریب سے گزر گئی تھی جس کی مدہوش لہروں میں میرے ہر جنم، ہر زندگی کے الم، درد، خوشیاں محبتیں اور جنسی اذیتیں پوشیدہ تھیں ایک دل شکستہ بچھڑی ہوئی خون آلود، گردمیں اٹی ہوئی پرانی، شناسا، اجنبی، کچھ کہتی، کچھ یاد دلاتی، کچھ اُداس کچھ مسکراتی ہوئی پر اسرار روح کی مانند جو ایک دلگیر اہ بھر کر پاس سے گذر جائے اور انسان عین چوراہے میں یوں حیرت زدہ اور ہیبت زدہ ہو کر رہ جائے جیسے اُس نے خدا کی آواز سن لی ہو۔ تم افسانہ نگار ہو شاید میری باتوں پر ہنسو اور کسی افسانے میں ان کا مذاق اڑاؤ، لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شے، کوئی غیر مرئی ناقابل تسخیر شے ہے جو مجھ سے کسی نہ کسی روپ میں ایک بار پھر ملنا چاہتی ہے لیکن نہیں مل سکی، نہیں مل رہی، کبھی کبھی، کہیں کہیں، مجھے اُس کی جھلکیاں سی ملتی ہیں۔ سائے سے نظر آتے ہیں۔ سرگوشیاں سی سنائی دیتی ہیں، آہٹ سی ملتی ہے اور دیکھتے دیکھتے کوئی نہ کوئی پردہ درمیان میں آ گرتا ہے دیوار آن کھڑی ہوتی ہے اور ایک بار پھر جدائی کا تند، وحشی اور جھاگ اڑاتا، غضب ناک سمندر حائل ہو جاتا ہے۔ تم اُس شے کو اُس گریز پا حسین ترین ذرے کو ایک خشک، دیوانی اور بے رنگ آواز سے تشبیہہ دے سکتے ہو۔ ایک ایسی آواز --- جس کی کوئی صدا نہیں، کوئی لے نہیں، جو گم شدہ ماضی کے نیم خوابیدہ، نیم فراموش مندروں کے گرد آلود، تہ خانوں سے اُبھرتی --- قدیم جنگلوں کے عمر رسیدہ درختوں کو اپنے کھردرے زخمی ہونٹوں سے چومتی، بال پھیلائے برہنہ، بے داغ اور لہولہان سیاہ جسم نے قرن ہا قرن سے آوارہ اور بے خانماں ہے۔ جس نے ہزاروں سال پہلے تاریک درختوں میں چھپے ہوئے قلعوں کی مرمریں شہ نشینوں میں تیکھی چتونوں والی برہمن راجکماریوں کو جالی دار جھروکوں میں اپنے عاشقوں کو اشارے کرتے اور حبشی غلاموں کو بہیمہ غلام گردشوں کے اندھیروں میں سمٹ کر اپنے خنجر شہنشاہوں کی پشت میں پیوست کرتے اور بھگوان بدھ کو کرمنڈل ہاتھ میں لئے شودروں کے دروازوں پر بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ یہ انوکھی، درد بھری، پرانی تیز خوشبوؤں والی صدا، آدھی رات کو جب چاند کہیں نہیں ہوتا اور ہری ہری پتیوں پر بارش کی گرم گرم بوندیں گرتی ہیں۔ جب ناریل اور تاڑ کے گھنیرے جنگلوں میں تاڑی کی رس بھری خوشبو پر اسرار اندھیروں کو زیادہ وحشی بنا دیتی ہے۔ تو یہ میری تلاش میں اپنے گھر سے نکلتی ہے اور گیلے سایوں پر اپنے ننگے گرم حنائی پاؤں رکھتی ہر گھر کے دروازے سے منہ لگاتی مجھے اپنے پاس

بلایا کرتی ہے جس بارش والی راتوں کو گیلے مکانوں کی بھیگتی منڈیروں پر اگا ہوا گھاس اپنے سرخ پھول چھپا لیتا ہے اور محبت کے دکھوں کا جہنم اپنا دہکتا ہوا منہ کھول کر ہانپنے لگتا ہے۔ اور جسم کی ساری ناتمام لذتیں، بے ثمر پارسائی کے سارے ملال، پشیمانیاں، غم نفرتیں اور تمہنگیاں اس آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی ہیں اور آتما کا ایک نیا روپ ایک نیا سر، ایک نیا سنگار جنم لیتا ہے تو یہی صدا، یہی آواز --- اُس آگ کے ہر شعلے شعلے کی ہر زبان میں سنسناتی، پھنکارتی، لپکتی اور ڈستی محسوس ہوتی ہے اور یہی وہ آواز تھی۔ یہی وہ شعلہ تھا جس کے ٹوٹے ہوئے سر کی باز گشت مجھے آلیو کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی یہی وہ پرانی محل سراؤں کی ریشمی خلوت گاہوں والی خواب ناک خوشبو تھی جس کا ایک رنگ فارول سینٹ میں مل کر چھپ چھپا کر، سب کی نظروں سے بچ کر، میرے اور صرف میرے چہرے کو تیز مہکیلا سانس بن کر چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔

دوسرے دن میں نے اُسے دیکھا۔ میں بس سٹاپ سے ذرا ہٹ کر پیپل کے پیڑ تلے جا کھڑا ہوا ٹھیک نو بج کر تین منٹ پر ایک بس آ کر رُکی اس کا دروازہ کھلا اور آلیو نیلے رنگ کی ایک نوٹ بک اور پرس ہاتھ میں لئے، نسوانیت کی تمام دلکشی کے ساتھ، سر جھکائے خاموش قدم اُٹھاتی اپنے دفتر کی طرف چل پڑی۔ پہلے روز کی طرح آج بھی اُس نے ایک پل کے لئے مجھے دیکھا اور فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ مجھے ایک بار پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں بڑی دل نشین ادا سے مسکرا دی ہو۔ اس مسکراہٹ میں نہ تو پیام محبت تھا اور نہ دعوت عشق، نہ شوخی تھی اور نہ شرارت، نفرت تھی نہ حسرت --- بس ایک بے نام سا احساس تھا یاد دہانی کا تسلی اور خود اطمینانی کا --- جیسے کہہ رہی ہو، میں تمہیں جانتی ہوں، تم وہی ہو نا؟ جس نے ہر دور میں موت پر فتح پائی ہے اور ہر عہد میں جنم لیا ہے جو شہزادہ بن کر پیدا ہوتا ہے اور کھڑاویں پہن کر گلی گلی پھر کر عمر بسر کرتا ہے جو کانٹوں پر اس طرح چلتا ہے جیسے پھول ہوں، جو پھولوں کو اس طرح پیار کرتا ہے جیسے اُس کے بچے ہوں اور جو بچوں سے اس طرح پیش آتا ہے جیسے اُس کے اپنے بازو ہوں، ہاتھ ہوں، جو کرب انگیز وحشیانہ چیخیں سنتا ہے اور سکھ شانتی کے منتر پھونکتا ہے جو بگولوں کے ساتھ اڑتا ہے اور شبنم کے ساتھ گرتا ہے جو دہکتے ہوئے انگارے نگلتا ہے اور دہکتے ہوئے ہیرے اُگلتا ہے جو خاموش ہے لیکن بول رہا ہے جو چپ ہے لیکن سن رہا ہے جو ازلی ہے ابدی ہے۔

تم وہی ہونا؟ وہی ہونا؟

وہ مجھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی رہتی۔ میں جب بھی اُسے دیکھتا اُسی پُر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوتی۔ میں چپ رہتا، خاموش رہتا لیکن اُسے دیکھتا رہتا، ہر روز دیکھتا۔ پورے نو بجے شوروم سے نکل کر بس سٹاپ پر پیپل کے پیڑ تلے آن کھڑا ہوتا۔ نو بج کر تین یا چار منٹ پر اُس کی بس آ کر وہاں رکتی۔ دروازہ کھلتا اور وہ باہر نکلتی۔ اترتے اترتے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتی جیسے ذرا سا مسکراتی اور فارول کی خوشبو اڑاتی چپ چاپ اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو جاتی۔ میں کبھی اس کے پیچھے نہ گیا تھا اس نے کبھی مجھے بلانے کی کوشش نہ کی تھی۔ شاید اسی ایک تیکھی سی شوخ سی خود ستائی اور بے نیازی کے احساس نے ہمیں صدیوں سے ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا اور جانے ابھی کتنی صدیاں اور جدا رہنا تھا اسی اثناء میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ جرمنی کی ایک ٹریکٹر بیچنے والی فرم میں سٹینو ہے اور ریلوے کالونی کے کہیں قریب ہی اپنی چچی کے ساتھ رہتی ہے اور اس کا نام آلیو ہے۔ اس دفتر کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا۔ اتفاق سے وہاں میرا ایک دوست ملازم نکل آیا جس کی بدلی لاہور والے دفتر میں ہو گئی تھی۔ وہ ایک روز اچانک ہمارے شوروم میں آ گیا اور واپسی پر مجھے اپنے ساتھ دفتر لیتا گیا۔ کہنے لگا چائے وہاں اپنے کمرے میں بیٹھ کر پئیں گے۔ مجھے معلوم تھا کہ آلیو اُسی دفتر میں کام کرتی ہے چنانچہ سیڑھیوں ہی میں میرا دل دھڑکنے لگا اور پھر دفتر کے بڑے کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ بھورے بالوں والی سبک اندام آلیو دیوار کے ساتھ خوبصورت سی چھوٹی میز کے سامنے بیٹھی ٹائپ کر رہی ہے۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اُسی پُر اسرار بے معلوم سے اشارے والے انداز میں مسکرائی اور اپنا چہرہ ٹائپ کی مشین کے پیچھے چھپا لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شوخ چشم ترچھے ابروؤں والی دیوار اسی پرانے مندر کی زنگ لگی دیوار کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے صرف آلیو کے بال اور ان کے درمیان نکلی ہوئی مانگ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اور پھر ٹائپ رائٹر کی ننھی ننھی ٹک ٹک کی مسلسل آواز تھی جو ٹین کے چھپر پر بارش کی بوندوں کی طرح گر رہی تھی۔ میں اپنے دوست کے کمرے میں آ گیا۔ ٹک ٹک کی آواز نے وہاں بھی میرا پیچھا کیا۔ یہ صدا آلیو کے چہرے سے زیادہ نمایاں پُر جوش اور بھرپور تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات کی تمام آوازیں، تمام بولیاں، تمام

سُر اسی ایک ٹک ٹک سے نکلے ہوں۔ آلیو میرے پاس نہیں تھی۔ لیکن میرے لئے یہی خیال کافی تھا کہ جس کمرے میں میں یہاں بیٹھا ہوں وہاں کی فضا میں آلیو کے جسم کے ان چھوئے لمس کی حدت اور عطر بھری انگلیوں کی پاکیزہ خوشبو ملی ہوئی ہے۔ اور کیا خبر---- کہ یہ ہوا جو سانس بن کر میرے جسم میں داخل ہو رہی ہے آلیو کے نیم گلابی رخساروں کو چھو کر آ رہی ہو۔ اُس کی بے صدا آواز ہی ہو۔ اُس کا اپنا سانس ہی ہو۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ میں ہر روز بس سٹاپ پر اُس کے درشن کرتا۔ پیپل کے پیڑ تلے چپ چاپ کھڑا رہتا اور اُسے بس میں سے نکلتے، فٹ پاتھ پر سمٹ سمٹ کر خوبصورت پاؤں اُٹھاتے اور دفتر والی گلی میں مڑتے دیکھتا رہتا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو واپس اپنے شوروم میں آ جاتا۔ اس دوران میں ہم نے ایک دوسرے سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ کبھی اپنا حال دل ظاہر نہ کیا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ تھی اور میں بھی محبت اور انوکھی لگن کی اس دھیمی دھیمی آنچ کو اپنی روح میں جذب کر رہا تھا۔ جس طرح کوئی غریب مسافر جاڑے کی ٹھٹھرتی رات میں کسی میدان میں خانہ بدوشوں کی چھوڑی ہوئی راکھ کے پاس بیٹھ جائے اور اپنے ہاتھ پاؤں تاپنے لگے۔ بالکل اسی طرح میں بھی اسی شور مچاتی نفرت اور گندگی کا کف اڑاتی ٹھنڈی دنیا کے میدان میں گزری ہوئی محبتوں کی راکھ کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اُسے کریدتے ہوئے ڈر رہا تھا کہیں نیچے سے مٹی نہ نکل آئے، اتنی سی آگ بھی نہ بجھ جائے۔ مجھے میرے دوست نے بتایا کہ آلیو ایک سال سے اُس دفتر میں ملازم ہے لیکن کبھی اُس نے کسی سے زیادہ بات نہیں کی۔ ایک بار گنجے مینجر نے اُسے سینما اور شیزان میں ڈنر کی دعوت دی تھی جسے آلیو نے قبول نہ کیا تھا۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی، جیسے میں نے ہی گنجے مینجر کی ڈنر کی مکارانہ پیش کش کو ٹھکرا دیا ہو، جیسے یہ ساری خود نگری، بے نیازی اور تمکنت میری اپنی ہو میرے اپنے آپ کا ایک حصہ ہو۔

اسی طرح برسات کا موسم بھی گزر گیا۔ سردیاں آ گئیں۔ یہ رُت بھی گزرتی چلی گئی۔ جنوری کا مہینہ آ گیا اور جاڑے کی بارشیں شروع ہو گئیں۔ ایک دن صبح بڑی سردی تھی۔ کہرا چھایا ہوا تھا۔ رات بھر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر درختوں کے مسلسل ٹپکنے سے جابجا تھوڑا تھوڑا پانی جمع ہو گیا تھا۔ بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ اُس روز ہمارے شوروم میں بڑی گہما گہمی تھی۔ میں نے برآمدے میں آ کر دیکھا کہ باہر بارش پھر

شروع ہو گئی تھی اور درختوں پر دھند زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ اتنے میں فٹ پاتھ پر آلیو نمودار ہوئی۔ وہ اپنا آپ سمیٹے تیز تیز قدم اُٹھاتی بارش میں بھیگتی چلی آ رہی تھی۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ آلیو لپک کر ہماری دوکان کے برآمدے میں آئی اور ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر رومال سے منہ پونچھنے لگی۔ اُس نے نسواری رنگ کی ٹویڈ کا فل کوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں اُسی رنگ کا گرم اُونی مفلر تھا اور کچھ بال بارش میں بھیگ کر پیشانی سے چپک گئے تھے۔ میرے قدم اپنے آپ ہی اُس کی طرف اُٹھ گئے۔ اب اُس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور کچھ گھبرا سی رہی تھی۔ دوسرے لمحے میں اُس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کبوتری کی طرح کچھ اندر ہی اندر سمٹ سی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی پلکوں کے بال گیلے تھے اور سردی میں رخساروں کی روئیں کانپ رہی تھیں اور چہرے پر آنکھوں کے اردگرد ایک مدھم اور ملائم سی چمک تھی۔ جیسے گیلی رات میں دریا کے دوسرے کنارے پر کوئی دیا ٹمٹما رہا ہو۔ اُس کا نچلا ہونٹ ٹھنڈ سے نیلا ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا"

"اگر آپ ہمارے شوروم میں بیٹھ جائیں تو بارش کے---"

وہ جلدی سے بولی:

"جی نہیں - آپ کا شکریہ۔ شکریہ---"

اُس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی اور اُس کا سرخ رومال فرش پر گر پڑا۔ میں فوراً اسے اٹھانے کے لئے جھکا۔ آلیو بھی جھکی ایکدم ہمارے چہرے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے اور آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں کو تکنے لگیں اور ہر شے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مہر بہ لب ہو گئی، ساکت ہو گئی، جامد ہو گئی اور میں نے اُس کی آنکھوں میں اپنے آپ کو آندھی بن کر اُٹھتے ، بادل بن کر گرجتے، بجلی بن کر چمکتے، پھول بن کر شاخوں میں سمٹتے شیر بن کر ہرنوں پر جھپٹتے اور ہرن بن کر قلانچیں بھرتے، ماں بن کر جنم دیتے اور بچہ بن کر جنم لیتے، روتے ہنستے، محبت سے باہیں پھیلاتے، نفرت سے منہ پھیرتے، غموں کے پہاڑ اُٹھاتے، کمندیں پھینک کر دیو ہیکل پرانے قلعوں کی دیواریں پھاندتے اور نیم روشن بارہ دریوں کے دبیز قالینوں پر جھک کر اظہار محبت کرتے، سایہ دار کنجوں میں سسکیاں بھرتی دوشیزاؤں سے خوں ریز عشق کے عہد و پیمان باندھتے، سنگدل محبوباؤں کی بے وفائیوں پر خوفناک سمندروں میں چھلانگ لگاتے اور شاہی عبائیں پھاڑ کر

رات کی تاریکی میں راج محل سے جنگل کی طرف نکلتے اور اجاڑ بنوں میں نیک دل بیراگیوں کے ساتھ بیٹھ کر تپسیا کرتے ریاضت کرتے دیکھا۔ میں یوں وفور مسرت اور حیرت سے چپ کا چپ رہ گیا۔ گویا کسی ناقابلِ عبور دریا کا منبع دریافت کر لیا ہو۔ جیسے کوئی کتاب اخیر سے لے کر شروع تک پڑھ لی ہو۔ آلیو بھی مبہوت سی ہو گئی تھی۔ جیسے ایک طویل خونچکاں فراق کے بعد دو ذرے اڑتے، بھاگتے، گھومتے، چکراتے، صدیوں کی راکھ اڑاتے، اچانک ایک دوسرے کے مقابل آ گئے ہوں اور دو معصوم بچوں کی طرح ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم وہی ہو؟ وہی ہو---

جی نہیں --- آپ کا شکریہ شکریہ۔"

میں نے سرخ رومال اٹھا کر آلیو کی طرف بڑھایا۔ اُس نے رومال لے لیا اور جلدی سے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گرتی بارش میں ہی گلی میں مڑ گئی۔ ڈیڑھ سال کی مدت میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم نے کوئی بات کی تھی۔ میں نے آلیو کے رومال کو چھوئی ہوئی انگلیاں ہونٹوں سے لگا لیں۔ ان میں سے فارول کی اُداس خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں اُس خوشبو سے بھی زیادہ اُداس ہو کر شوروم میں واپس آ گیا اور سوچنے لگا۔ اگر آلیو میری بات مان لیتی، ہمارے شوروم میں آ جاتی تو دیکھتی کہ باہر کی گیلی سردی کے مقابلے میں یہاں کی فضا کتنی پرسکون اور گرم ہے۔ پھر میں اُسے اپنے ساتھ یہاں لے آتا۔ اپنے رومال سے اس کے لئے کرسی صاف کرتا۔ تازہ پتیوں والی سونے کے رنگ ایسی چائے بناتا اور خود زمین پر بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ دیتا اور اسے ایک کہانی سناتا کہ کسی پہاڑ پر ایک بھولی بھالی صورت والا ایک چرواہا رہا کرتا تھا۔ اُسے اپنی بھیڑوں سے بہت پیار تھا۔ جب بھیڑیں چراگاہ کی ہری ہری گھاس چرا کرتیں تو وہ درخت سے ٹیک لگا کر انہیں بانسری پر محبت کے نغمے سنایا کرتا۔ ایک روز بارش کے طوفان میں وہ گھر واپس آ رہا تھا کہ اس کی ایک بھیڑ گم ہو گئی۔ معصوم چرواہا پریشان ہو گیا اور اس کی تلاش میں کوہ قاف کی وادیوں میں جا نکلا۔ وہ بڑا غمگین ہو کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں ایک نیک دل پری نمودار ہوئی اور چرواہے کو اپنے ساتھ پرستان لے گئی۔ وہاں اُس کی بھیڑ اُسے واپس مل گئی اور پری نے اُسے میٹھے پھل اور ایک بانسری دی اور چرواہا خوشی خوشی بھیڑ کو گلے لگائے اپنے گھر واپس آ گیا--- پھر میں اُسے کہتا۔ آلیو! دیکھو یہ کتنی عجیب سی کہانی ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں

ہے۔ پھر بھی سب کچھ موجود ہے۔ گڈریا ہے، میٹھے پھل ہیں۔ بانسری کے گیت ہیں او بارش کا وحشی طوفان ہے اور نیک دل پریاں ہیں اور آلیو! میں نے تمھیں سب سے پہلے اس وادی میں دیکھا تھا اور سیب کے درخت کے پاس بیٹھ کر تمھارے بالوں کے لئے سفید پھولوں کے ہار بنائے تھے۔ اور سرخ انگوروں کے خوشے زرد پتوں میں سجا کر تمھارے سامنے رکھے تھے۔ تمھیں یاد ہے نا؟ یاد ہے نا؟ --- مگر آلیو برآمدے کی سیڑھیاں اُتر ک بارش میں بھیگتی اپنے دفتر جا چکتی تھی۔ وہ ہمارے شوروم میں نہیں آئی تھی اور میری سونے ایسے رنگ والی چائے اُسی طرح پڑی رہی تھی اور بارش گرتی رہی تھی۔

ہمارے ہاں دوکان میں کبھی کبھی ایک عیسائی لڑکی آیا کرتی تھی۔ چھوٹے قد ک تھی۔ جسم ذرا بھاری تھا۔ بڑی گول مٹول سی تھی۔ شوروم میں داخل ہوتی تو یوں لگتا جیسے چھوٹی سی بچی چلی آرہی ہو۔ چہرہ بڑا بھولا اور معصوم تھا۔ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی دودھ پی کر رہی ہے۔ وہ ہفتے میں ایک دوبار ضرور آتی اور ہمیشہ اکیلی آتی۔ عورتوں کا رسالہ یا کوئی سنسنی خیز ناول خریدتی اور بچوں ایسے قدم اٹھاتی واپس چلی جاتی اس کا نام لیزا تھا ایک رو میں نے اُسے شرارت سے کہا۔ "لیزا! تم بالکل مجھے اپنی چھوٹی سی بہن لگتی ہو۔" وہ اس بات پر بڑی خوش ہوئی۔ شاید اُسے آج تک سوائے اپنے بھائی کے اور کسی نے اپنی بہن کہا تھا۔ اب وہ اندر داخل ہوتے ہی سیدھی میرے پاس آتی۔ میری خیریت پوچھتی۔ ا ٹائی کی ناٹ ڈھیلی ہوتی تو اُسے ٹھیک کرنے کو کہتی۔ اگر سویٹر نہ پہنا ہوتا تو دوسرے ر پہن کر آنے کی تاکید کرتی۔ غرض کہ اُسے مجھ سے بڑا لگاؤ ہو گیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں ک آلیو اُس کے ساتھ ہمارے شوروم میں چلی آرہی ہے۔ میں تو حیران سا ہو کر رہ گیا۔ لی حسبِ عادت سیدھی میرے پاس آئی۔ خیر خیریت پوچھی اور مجھ سے آلیو کا تعارف کروانے لگی۔

"مس آلیو --- ہماری ملاقات آنٹی کے ہاں ہوئی۔ بڑی سویٹ ہے۔

میری طرح کسی سے مکس اپ نہیں ہوتی اور وہاں وہ ہاؤس وائف آیا؟"

آلیو کچھ نہ بولی۔ حسبِ عادت خاموش رہی۔ صرف کان کی لوئیں سرخ ہو گئیں فضا میں فارول کی سلگتی ہوئی خوشبو پھیل گئی اور میں نے دیکھا کہ آلیو کے کانوں میں ٹر گرین کلر کے بندے جھلملا رہے تھے، جن کے رنگ سونے کے تھے اور وہ رسالہ د

ہوئے بار بار اپنی شبنمی پلکیں جھپکا رہی تھی۔ ایک بار اُس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ آنکھیں جھکا لیں پھر اس نے لیزا کے کان میں کچھ کہا۔ لیزا نے مجھے بتایا کہ آلیو کو ناول ،ربیکا، کی تلاش ہے۔ میں انھیں کتابوں والے ڈیپارٹمنٹ میں لے گیا اور دیر تک وہاں خود وہ ناول تلاش کرتا رہا اور مجھے وہ چرواہا یاد آگیا جس کی بھیڑ بارش کے طوفان میں گم ہو گئی تھی، اور وہ اُس کی کھوج میں کوہ قاف کے مرغزاروں میں نکل گیا تھا۔ مگر افسوس بھیڑ نہ مل سکی، کتاب نہ مل سکی۔ میں نے لیزا کی وساطت سے آلیو سے اُس کے گھر کا ایڈریس لے لیا اور دوسرے دن ایک اور دوکان سے کتاب خرید کر اُسے پھول دار کاغذ میں لپیٹا اور آلیو کو پارسل کر دی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خط لکھ دیا کہ --- مس آلیو! کتاب گھر میں ہی پڑی مل گئی تھی۔ اسے بھیج رہا ہوں اور ساتھ ہی اُس عقیدت اور محبت کو بھی، جو ایک مدت سے میرے دل میں تمھارے لئے موجزن ہے --- "کچھ دن بعد وہ خط مجھے واپس مل گیا۔ آلیو نے اُسے پڑھ کر، لفافے میں بند کر کے مجھے پوسٹ کر دیا تھا۔ وہ خط میرے پاس موجود ہے۔ وہ لفافہ بھی جس پر اُس نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنا خط اُسی

لفافہ میں بند کر کے کسی ایسی رات کو گھر سے نکلوں جبکہ سہمی ہوئی چاندنی پرانی حویلیوں کی سنسان ڈیوڑھیوں میں پاؤں رکھتے ڈر رہی ہو اور ------ دھرتی کے سب سے اونچے پربت کی چوٹی پر باہیں پھیلا کر کھڑا ہو جاؤں اور لفافے پر لکھے ہوئے اپنے نام کو آنکھوں سے لگا کر چپکے سے کسی نظر نہ آنے والے ستارے کی دہلیز پر رکھ دوں ---- یا پت جھڑ کی رُت میں اسے کسی سیب کے پیڑ تلے دفن کر دوں۔ اچھا، بتاؤ تو جب بہار کا موسم آئے گا تو کیا وہاں بھی سرخ رنگ کے بے وفا بے مہر پھول کھلیں گے؟

لیکن پھول تو صرف وہیں کھلتے ہیں جہاں آلیو اپنا پاؤں رکھ کر گزرتی ہے اور آلیو کو میں نے ابھی تک صرف پاتھ ہی پر گزرتے دیکھا تھا۔ ہونٹوں کے خمیدہ کونوں کو ذرا سا بھینچے، ہلکے سنہری بالوں کو لہراتی، بے معلوم سی مسکراتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتی۔ وہ ایک پرشکوہ اور تمنا دینے والے خیال کی طرح میرے قریب سے گزر جاتی اور فارول کے سینٹ کی تیز خوشبو ان ننھی ننھی معصوم بچیوں کی مانند پیچھے رہ جاتی جو شہزادیوں کے عقب میں

ٹوکریاں تھامے پھول لٹاتی چلا کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح وقت گزر گیا ہے اور میں اس کے پیچھے رہ گیا ہوں۔

اسی طرح کچھ اور وقت گزر گیا۔ آلیو کچھ اور آگے نکل گئی اور میں تنہا فٹ پاتھ پر اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے پھول لٹاتا کچھ اور پیچھے رہ گیا۔ پھر ----- ایک دن لیزا نے مجھے بتایا کہ آلیو ایک ڈانسنگ سکول میں داخل ہو گئی ہے۔ یہ سکول ایک خوبصورت، انگریزی سینما کے اوپر واقع ہے۔ دل نے کئی بار کہا۔ چلو وہاں چلیں اور کسی نیم روشن کونے میں بیٹھ کر، کسی دروازے کے ساتھ لگ کر چپکے چپکے آلیو کو ناچتے ہوئے دیکھیں۔ لیکن ہر بار یہ خیال کر کے رک گیا کہ اسے کسی دوسرے کے ساتھ محو رقص کیسے دیکھ سکوں گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن یہ الم خیز منظر بھی مجھے دیکھنا ہو گا یہ کانٹوں کا تاج بھی سر پر رکھنا ہو گا یہ صلیب بھی کندھے پر اٹھانی ہو گی اور پھر وہ تاریک خوں رلاتی شام بھی آپہنچی جب سینما ہال کی لابی میں کھڑے میں نے آلیو کو پہلی بار ایک خوش پوش غیر مرد کے ساتھ ڈانسنگ سکول کی سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ میں اسے غیر مرد ہی کہوں گا۔ اس لئے کہ آلیو کا سوائے میرے بھلا اور کون اپنا ہو سکتا ہے مگر آلیو نے میری طرف نگاہ بھی نہ کی۔

وہ اس آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بڑے اطمینان سے لابی میں سے گزر کر باہر نسواری رنگ کی ایک چھوٹی سی کار میں جا بیٹھی اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ میری پہلی شب تنہائی تھی جو میں نے جاگ کر کاٹی۔ مجھے یاد ہے اسی کمرے میں، جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں میں پہروں کھڑکی کے ساتھ لگا کھائی میں اگی ہوئی ویران جھاڑیوں کو تکتا رہا تھا۔ جانے پچھلی رات کا کون سا پہر ہو گا کہ میری جلتی ہوئی آنکھوں پر رحم دل نیند نے اپنی حنا میں ڈوبی ہوئی خوشبودار انگلیاں رکھ دیں اور میں سو گیا اور خواب میں دیکھا کہ آلیو اسی خوش پوش آدمی کے ساتھ ایک پھولوں سے لدے ہوئے باغ کے کنج میں بیٹھی ہے اور آنکھوں میں آنسو لئے اسے اپنا سرخ رومال محبت کی نشانی کے طور پر دے رہی ہے اور جیسے میں ایک بہت بڑے بے برگ و بار، سیاہ درخت کے روپ میں پاس ہی کھڑا ہوں اور میرے تنے سے بہتے ہوئے سرخ خون کا ہر قطرہ یاقوت بن کر نیچے گر رہا ہے۔ پھر جیسے ایک یاقوت اچانک نسواری رنگ کی کار بن گیا اور یہ کار پوری رفتار سے سڑک پر بھاگنے لگی اور آلیو کے بال ہواؤں میں وحشی بن کر اڑنے لگے اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ بھینچ لئے۔ پھر ایک

زبردست دھماکا ہوا اور دوسرے لمحے آلیو کی لاش سڑک کی مٹی میں پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ رومال میں چھپی ہوئی تھیں اور نازک گردن پر گہرے زخم کا نیلا نشان تھا ----- میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرہ سنسان تھا۔ صرف اس کھڑکی میں سے ستاروں کی پھیکی کمزور سی چمک اندر آ رہی تھی۔ میں کسی سحر کے تحت اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور جلتی ہوئی خشک آواز میں آہستہ آہستہ آلیو کو پکارنے لگا۔

آلیو! آلیو!

مگر وہاں کون تھا جو مجھے جواب میں کہتا کہو کہو ----- میں یہاں ہوں ----- باہر درخت مراقبے میں سر جھکائے سائیں سائیں کر رہے تھے۔

دوسرے روز میں نے لیزا سے آلیو کے نئے دوست کے بارے میں پوچھا۔ اب وہ میری رازدار بن گئی تھی اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں آلیو کو چاہتا ہوں اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیزا نے بتایا کہ وہ آدمی کسی بہت بڑی غیر ملکی فرم کا ایجنٹ ہے اور آلیو کو بڑے قیمتی تحفے لا کر دیا کرتا ہے۔ وہ اسے ضرور پسند کرتی ہے مگر محبت نہیں کرتی۔ آلیو ایسی لڑکی ہے جو شاید کسی سے محبت نہیں کر سکی۔ ----- لیکن میں تو ایسا لڑکا نہیں ہوں لیزا۔ میں تو اس سے محبت کرتا ہوں۔ ایسی محبت جس نے آلیو کی پیدائش سے پہلے جنم لیا تھا۔ بتاؤ اس نے کبھی تم سے میرا ذکر نہیں کیا؟ کبھی میری بات نہیں کی؟ لیزا کے ہاتھ میں نرگس کے پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے پھولوں کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے کہنے لگی۔ کبھی کبھی مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ آلیو اگر اس دنیا میں کسی سے پیار کرتی ہے تو وہ تم ہو۔ اگرچہ اس نے میرے سامنے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن عورت، عورت کے دل کا حال بہت جلد معلوم کر لیتی ہے ایک دن وہ مجھے کہہ رہی تھی۔ لیزا یہ کیسا عجیب سا لڑکا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جب سے پیدا ہوا ہے مجھے چپ چاپ ٹکٹکی لگائے تک رہا ہے اور منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ کبھی کبھی میں شوروم میں اسے دیکھتی ہوں کہ یہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کتابوں کی الماریوں کے پاس جاتا ہے۔ ایک پل کے لئے رکتا ہے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ پھر ایک دم اداس ہو جاتا ہے اور کوئی پرانی سی جلد والی کتاب کھول کر اس کے ورق الٹنے لگتا ہے۔ گویا

کوئی بد نصیب شہزادہ ہے جو اجاڑ قلعے میں مرے ہوؤں کا ماتم کرنے کے لئے اکیلا رہ گیا ہو یا کوئی اگلے وقتوں کی بھٹکی ہوئی روح ہے جس کی باتیں غمگین اور بڑی دل پر اثر کرنے والی ہیں۔ مگر جنھیں کوئی نہیں سنتا، کوئی نہیں سمجھتا----

لیزا خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلدستہ لیا۔ زرد پھولوں کو آنکھوں سے لگایا اور انہیں واپس کر دیا۔ لیزا کچھ نہ بولی۔ جاتے ہوئے اس نے دو پھول میری میز پر رکھ دیئے۔

اب آلیو اکثر اس خوش پوش ایجنٹ کے ساتھ نظر آنے لگی۔ وہ اپنی چھوٹی نسواری کار میں اس کے دفتر بھی آنے لگا۔ کبھی دوپہر کو لنچ کے لئے شیزان بھی لے جاتا اور کبھی دفتر سے اسے گھر تک چھوڑنے چلا جاتا۔ ایک روز برسات کا موسم تھا اور بارش سے لدے ہوئے سیاہ بادل مال والے درختوں کے بالکل اوپر جھک آئے تھے اور خنک ہوا چل رہی تھی کہ میں یونہی دفتر سے اٹھ کر پھرتا پھراتا ڈانسنگ سکول میں جا پہنچا۔

دو روز پہلے میں نے آلیو کو لیزا کے ہاتھ پنک کلر کا ایک خوبصورت ریشمی سکارف بھجوایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آلیو وہی سکارف گلے میں ڈالے، اسی ایجنٹ کے ساتھ ایک طرف بیٹھی کافی پی رہی ہے۔ میں چپکے سے ایک کونے میں بید کی کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے منگوالی۔ آلیو نے مجھے نہ دیکھا تھا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں ذرا اندھیرا تھا اور دوسرے آلیو کا چہرہ میری طرف نہ تھا۔ ہال میں ایک دم ریڈیو گرام پر ناچ کی موسیقی شروع ہو گئی اور آلیو نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے ایجنٹ دوست کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ میرا سکارف اس کے بھورے بالوں سے لپٹ کر لہرانے لگا اور وہ خوشبوؤں کے دائرے بناتی فلور پر اڑتے ہوئے پھول کی طرح چکر کھانے لگی۔ ایجنٹ کا بازو اس کی آغوش میں تنگ ہوتا جا رہا تھا اور وہ آلیو کو میووں کی لدی ہوئی، جھکی ہوئی شاخ کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کا پردہ پرے ہٹا کر ایک پٹ کھول دیا اور باہر جھانکنے لگا پہلی بارش کی دو تین گرم بوندیں میرے ہاتھ پر گریں اور پھر بڑے زور کا مینہ برسا، بادل گرجا، اور بجلی چمکی اور میں اسی موسلا دھار بارش میں وہاں سے چل پڑا اور واپس شوروم میں آ گیا اور کرنے والی الماریوں کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور ہمہ تن گوش ہو کر کھلے ہال کی چھت پر گرتی بارش کے شور کو سنتا رہا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا

جیسے میں کسی بہت بڑے درخت کے نیچے بیٹھا ہوں اور شوروم کی ساری الماریاں، کتابیں، رسالے، آدمی، عورتیں،---- اوپر سے آتے ہوئے تند اور پر شور پہاڑی نالے کی طوفانی لہروں میں بہی جا رہی ہیں اور لاکھوں صورتیں، لاکھوں آوازیں آپس میں گھل مل کر ایک ہی صورت، ایک ہی آواز میں ڈھل رہی ہیں جو پہچانی نہیں جا رہی، سنائی نہیں دے رہی، پھر جیسے اچانک گالزوردی کے سیب کے درخت والے پُرسکون، سوئے ہوئے گاؤں میں آ گیا ہوں اور بلیو بلز کے پھولوں کے پاس کھیت میں بیٹھا ہوں اور میگن ٹوکری ہاتھ میں لئے سامنے کی ڈھلان سے اتر کر میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی ہے اور اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان پر شفاف سورج چمک رہا ہے اور سیب کے شگوفوں میں سے میٹھی رس دار گرم خوشبو اٹھ رہی ہے اور میگن کا چہرہ ملائم گرمی میں دمک رہا ہے اور ہونٹوں پر پسینے کے موتی جھلملا رہے ہیں۔ اور میں اس سے پوچھ رہا ہوں، کیا یہاں تھوڑی سی رات بسر کرنے کو تھوڑی سے عمر بسر کرنے کو جگہ مل جائے گی؟---- جگہ مل جائے گی؟-----

پھر ایک گنجے سر والے گاہک نے جھک کر پوچھا:

"ڈمی ڈیکٹو کا تازہ پرچہ آ گیا کیا؟"

اور میں ایک دم چونک اٹھا میرا سگریٹ میرے ہاتھ میں ہی بجھ چکا تھا، اور چھت پر بارش کا شور اسی طرح گونج رہا تھا۔ اس گنجے گاہک کی طرف دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ زندگی سیب کے درختوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

مارچ کے پہلے ہفتے آلیو نے اپنی سالگرہ منائی۔ لیزا کے ہاتھ اس نے مجھے بھی دعوت نامہ بھجوایا۔ وہاں جانے کو میرا دل نہ مانا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش پوش ایجنٹ وہاں ضرور موجود ہو گا۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ چلو آلیو کے درشن تو ہو جائیں گے۔ میں لیزا کے ہمراہ آلیو کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے سالگرہ کے تحفے کے لئے فارول سینٹ کی ایک بڑی شیشی اور چائنا سلک کا پیازی رومال خرید لیا تھا۔ آلیو کا گھر ریلوے کالونی میں کیتھولک چرچ کے پاس ہی تھا۔ ہرے بھرے باغیچے والا چھوٹا سا کاٹیج نما گھر تھا جس کے دروازے پر جنگلی گلاب کی جھاڑیوں نے محراب سی بنا رکھی تھی۔ شام ہو رہی تھی کہ ہم اس محراب کے نیچے سے گزر کر آلیو کے گھر میں داخل ہوئے۔ باغیچے میں سبزے کی وجہ سے خنکی تھی اور اندر کمرے کی فضا نیم گرم تھی مجھے لگا جیسے میں نے ٹھنڈا ہاتھ کسی لڑکی کے گرم کوٹ کی جیب میں ڈال دیا ہو۔

آلیو نے ہلکے سبز رنگ کا خوبصورت ریشمی فراک پہن رکھا تھا اور اس کا رنگ پہلے سے بہیر زیادہ نکھر گیا تھا۔ وہ اسی خوش پوش ایجنٹ اور اپنے گھنی مونچھوں والے سخت مزاج چچا کے ساتھ کھڑی مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ سبھوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے گرم اور ملائم پروں والی فاختہ مٹھی میں لے لی ہو۔

کمرے میں لمبے رخ پر میزیں جوڑ کر ان پر چائے کا سامان چن دیا گیا تھا۔ کچھ مہمان دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ ٹولیوں میں بٹے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے دیوار پر ایک چھوٹی سی صلیب لگی ہوئی تھی جس پر یسوع مسیح کو مصلوب دکھایا گیا تھا۔ آتشدان پر چند ایک گھریلو تصویروں کے ساتھ عیسائی راہبوں کی تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سنہری جلد والی مقدس بائیبل پڑی ہوئی تھی۔ داہنی جانب پارٹیشن کی دیوار کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور اندر سے کپڑوں والی الماری، آدھی مسہری اور ایک پھٹا ہوا بھدا صوفہ دکھائی دے رہا تھا۔ مہمانوں میں ہر قسم کے کرسچین، ہندو اور پاکستانی لوگ تھے۔ ان میں ساڑھیاں، گون، شلواریں اور فینائل کی بو چھوڑتی اچکنیں، پرانی مگر محنت سے استری کی ہوئی پتلونیں، خوب رگڑ کر شیو کئے ہوئے چہرے، کریم پاؤڈر، سینٹ اور لپ اسٹک کی خوشبوئیں، میلے پائپ اور سگاروں کے دھوئیں، چوڑے تکونی کالر، تنی ہوئی سوکھی گردنیں بھڑکیلی ٹائیاں، ترچھی آنکھیں، کالے رنگ، منڈھی ہوئی بھنویں اور بے وجہ کھلی ہوئی بتیسیاں اور تازہ تازہ کی ہوئی حجامتیں تھیں جن کی وجہ سے سر گردنوں سے الگ معلوم ہو رہے تھے۔ میز کے عین بیچ میں گلدانوں میں خوب کھلے ہوئے گلاب رکھے تھے۔ کمرے کی فضا، تمباکو، پھولوں، ریشمی لباس سینٹ اور لوگوں کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھی۔ کیک کٹنے کے بعد چائے میزوں کے ارد گرد گھوم پھر کر پی گئی۔ مہمانوں نے بڑی فراخ دلی سے انڈے، کریم ملی کھجوریں، مارمیریلڈ والے بسکٹ اور تازہ کیک کھائے، جن پر زعفران چھڑکا گیا تھا۔ آلیو کا گھنی مونچھوں والا چچا بار بار مہمانوں کے آگے کیک والی پلیٹ پیش کرتا اور پھر بھنویں سکیڑ کر ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھتا کہ مہمان کی جرأت نہ ہوتی کہ ٹکڑا اٹھا لے۔ ایک دیو ہیکل موٹا بھدا انجن ڈرائیور بئیر پی کر آگیا تھا اور اب کالے رنگ کا میلا پائپ جبڑوں میں لئے جھوم جھوم کر اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا منحنی سا مسکین صورت ساتھی پیالی ہاتھ میں لئے دانتوں سے ناخن کاٹ رہا تھا اور اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔

اس اثنا میں وہ خوش پوش ایجنٹ سارا وقت آلیو کے ساتھ رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آلیو بھی اس سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ چائے کے بعد ساتھ والے کمرے میں جہاں سالگرہ کے تحفے ایک میز پر سجے ہوئے تھے گراموفون پر ناچ کی دھن کے ریکارڈ لگائے گئے اور جوڑوں نے ہنسی مذاق اور قہقہوں کے شور میں ناچنا شروع کر دیا تھا آلیو ناچنا نہ چاہتی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں وہاں موجود تھا۔ شاید! ----- لیکن اس خوش پوش ایجنٹ کے اصرار پر کچھ شرما کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے ساتھ لگ کر ہولے ہولے رقص کرنے لگی۔ مختلف قسم کی خوشبوؤں، جسم کی گرماہٹ، چاندی ایسی روشنی کی تیز جگمگاہٹ، مسکراتے چمکدار چہروں اور گونجتی ہوئی موسیقی کے باوجود وہاں ایک دم ویرانی سی چھا گئی اور ہر چیز دھندلی ہوتے ہوتے نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی۔ لیزا گراموفون کے پاس صوفے کے بازو پر بیٹھی منہ سے موسیقی کی نقل اتار رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر چپکے سے اس کے پاس گیا۔ آلیو کے تحفوں والا پیکٹ اس کے حوالے کیا اور اسے کچھ حیران سا چھوڑ کر دیوار والی یسوع مسیح کی مصلوب شبیہ کو عقیدت سے ہاتھ جوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرے میں کھلے پھولوں کی اداس خوشبوؤں میں کیتھولک چرچ کا تاریک مینار زنگ آلود، بے نور آسمان کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں وہاں سے چپ چاپ گزرتا سڑک پر آگیا۔ آلیو کے گھر سے آنے والی موسیقی اب مدھم ہو گئی تھی اور مجھے اپنے آپ پر ایک ایسے جہاز کا گمان ہو رہا تھا جس کے سینے میں سمندر کی کسی چھپی ہوئی چٹان سے ٹکر کھا کر گہرا شگاف پڑ گیا ہو اور جو اپنے ڈیک پر ڈوبنے والے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی فلک شگاف چیخوں کے باوجود گہرے پانیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو ---- ڈوبتا جا رہا ہو ----

دو مہینے بعد مئی کی ایک گرم شام کو میں نے پہلی بار اور آخری بار آلیو کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی، وہ مجھے لیزا کے ساتھ لارنس کے اوپن ائیر کیفے میں مل گئی۔ اس نے ہلکے وائٹ رنگ کی ریشمی فراک کے ساتھ بالوں میں گلاب کے سفید پھول لگا رکھے تھے۔ لیزا نے مجھے وہاں دیکھ کر پاس بلا لیا۔ آلیو نے آنکھیں جھکا لیں۔ وہ کچھ اُداس معلوم ہو رہی تھی یا شاید میں اسے دیکھ کر اداس ہو گیا تھا۔ لیزا بھی کچھ پریشان سی تھی اور مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ آئس کریم کھا رہی تھی اور آلیو چائے پی رہی تھی۔ لیزا نے چائے کی دوسری پیالی بنا کر میرے آگے رکھی اور جیسے کسی بڑے اہم موضوع کو ٹالنے کے لئے یونہی موسم کی باتیں

کرنے لگی۔ میں چائے پیتے ہوئے آلیو کی جھکی ہوئی پلکیں اور خمیدہ ہونٹوں کے سبک خم دیکھتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ مئی کی یہ گرم شام اپنے دہکتے ہوئے طشت میں سفید پھولوں کے ڈھیر لے کر بھی آسکتی ہے۔ ہوا گرم تھی اور آلیو کی طرف سے جو ہلکا سا جھونکا آتا اس میں فارول کی اداس خوشبو بھی ملی ہوئی ہوتی۔ ابھی پہلا جھونکا ہی میرے ہونٹوں کو چھو کر گزرا تھا کہ لیزا نے رک رک کر اپنی طرف سے بڑی بے نیازی سے بتایا کہ پرسوں آلیو کی منگنی ہو رہی ہے اور لڑکا ایک فرم میں ایجنٹ ہے-----

چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور سامنے والے گھاس کے میدان میں درختوں کے پیچھے سرخ رنگ کا خون آلود گول چاند ابھرتا چلا آرہا تھا۔ ارد گرد اس قدر گہری خاموشی چھا گئی کہ میں نے سرخ چاندنی کو کان لگا کر سنا اور آلیو کے بالوں میں لگے ہوئے سفید پھولوں کی خوشبو کو چھو کر دیکھا۔ ان پھولوں پر اب سرخ چاندنی نے خون ایسے رنگ کے چھینٹے پھینک دیئے تھے۔ میں نے پیالی میز پر رکھ دی اور آلیو کا ننھا سا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے آہستہ سے کہا۔ آلیو! آلیو! منگنی، شادی، بیاہ، موت، یہ کسی اور ہی ملک کی زبان ہے۔ میں اس زبان سے ناواقف ہوں۔ میں صرف غم کی زبان بولتا ہوں اور محبت کی بولی سمجھتا ہوں، جس طرح کوئی خار دار بیل ننھے سے پودے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اسی طرح تمھاری محبت نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ کئی روشنیوں کے اندھیرے بیتے کہ پہلی بار اندھے تاریک بیکراں خلاؤں میں نور کی ایک پھلجھڑی چھوٹی تھی اور میں تمھارے شعلے سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا اور کئی روشنیوں کے، اندھیروں کے اور جگ بیتیں گے کہ میں ہمیشہ کے لئے اسی شعلے میں آکر مل جاؤں گا۔ میں نے ہمیشہ تم سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ اس لئے کہ محبت کی سلطنت پر جادو بھری خاموشی کا راج ہے۔ اس آسیب زدہ قلعے میں جو کوئی بھی ہے مہر بہ لب ہے۔ تم بار بار بچھڑ کر ایک بار پھر بچھڑ رہی ہو۔ وقت پرانی یادوں کے چشموں کو پتوں اور خود رو جھاڑیوں سے ڈھانپ ضرور سکتا ہے۔ انھیں خشک نہیں کر سکتا۔ میں نے زندگی کے تمام خود رو غموں اور دکھوں کے جھاڑ جھنکاڑ میں گھر کر بھی تمھیں نہ بھلا سکوں گا۔ تم نے اپنی پراسرار مسکراہٹوں کے اتنے پھول کھلا دیئے ہیں کہ میرے دونوں ہاتھ پھولوں سے بھر گئے ہیں۔ میں گزر جاؤں گا اور ایک کبھی طلوع نہ ہونے والے دن اور کبھی غروب نہ ہونے والی شام کی تاریک دھند اور نورانی

اندھیروں کے درمیان، کسی انوکھے، ان دیکھے سبز دریا کے کنارے نیلم کے پتھروں میں بیٹھا دامن میں سفید پھول لئے تمھارا انتظار کروں گا۔ تمھاری راہ دیکھوں گا، کیا تم آؤ گی؟ تم آؤ گی؟-----

پھر میں آہستہ سے اٹھا، آلیو کے بالوں میں سے ایک سفید پھول نکالا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور گھاس کے میدان میں اس طرف چل پڑا جدھر سرخ چاند، زرد چاند طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے ایک پل کے لئے بھی مڑ کر نہ دیکھا کہ آلیو مجھے کن نظروں سے دیکھ رہی تھی، کیسے دیکھ رہی تھی۔ اب میرا چہرا ابلتے ہوئے گہرے سرخ چاند کی جانب تھا جس میں صدیوں کی محبتوں کا خون چھلک رہا تھا اور ان گنت روتی ہوئی لال لال آنکھیں میری طرف ٹکٹکی لگائے تک رہی تھیں۔

کرسمس کی شام آگئی۔

آلیو کی اس خوش پوش ایجنٹ سے منگنی ہو چکی تھی۔ میں کچھ کچھ گوشہ نشین سا ہو چلا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اپنے چچا کے پاس چلا جاؤں اور باقی زندگی وہیں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے گزار دوں۔ مگر حالات کی نزاکت مجھے اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ہمارے ہاں حالات عورتوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ دو، سوا دو سو روپوں کی نوکری کرو۔ دس میل روزانہ سائیکل چلاؤ۔ پونے دو سو روپے لا کر گھر کے اخراجات کے لئے دو اور باقیوں میں جس طرح بھی ہو اپنا گزارہ کرو، اور اگر اس کے باوجود کسی سے محبت ہو جائے، کسی چھپی ہوئی چٹان سے جہاز ٹکرا جائے اور سینہ شق ہو جائے تو خاموشی سے اپنے ڈیک پر بلند ہوتی ہوئی چیخوں کو سنتے رہو اور آہستہ آہستہ تاریک گہرے پانیوں میں اترتے جاؤ ----- اترتے جاؤ ----- خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ تو زندگی کی ساتھ ساتھ ہی چلیں گی۔ میں تمھیں کہہ رہا تھا کہ کرسمس کی شام آگئی۔

میں نے آلیو کے لئے ایک چھوٹا سا کیک بنوایا، ایک خوبصورت کرسمس کارڈ خریدا اور شام کو ان کے گھر کی جانب چل پڑا کارڈ بڑا خوبصورت تھا۔ اس پر زیتون کی ایک شاخ بنی تھی۔ جس کے ساتھ قندیل جل رہی تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی اور بازاروں میں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ آلیو مجھے اپنے مکان کی عقبی گلی میں مل گئی۔ وہ احاطے میں کچی دیوار کے ساتھ، جس پر انگور کی خشک بیل چڑھی ہوئی تھی مرغیوں کے ڈربے میں سے انڈے نکال رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ وہاں اس وقت کوئی نہ تھا۔ ذرا پرے مکان کی دیوار کے ساتھ دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا۔ آلیو نے ہلکی اونی شال اوڑھ رکھی تھی اور سردی میں کانپ سی رہی تھی۔ اس کے بال گیلے تھے، چہرہ شگفتہ تھا اور جسم میں سے خوشبودار صابن کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی اور کسی شاندار پارٹی میں شامل ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ میں نے کہا کرسمس مبارک ہو آلیو! وہ کچھ نہ بولی اور دیوار کے ساتھ سمٹ سی گئی۔ میں نے کیک کا پیکٹ اور کارڈ دیا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے بڑی اداس اور پشیمان سی نظروں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ میں آلیو کے اور قریب ہو گیا۔ میں نے اس کا چہرہ نازک پھول کی طرح اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور فارول کی خوشبو مجھے اپنی غمگین آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھی اور وہ زیتون کی کمزور ٹہنی کی مانند تیز ہوا میں لرز رہی تھی۔ میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور شاخ پر جلنے والی قندیل کے شعلے نے بھڑک کر سارے درخت کو سارے جنگل کو اپنی خون آشام آگ کی لپیٹ میں لے لیا اور آسمان پرندوں کے راگ اور گرجا گھروں کی گھنٹیوں اور مناجات کی صداؤں سے گونج اٹھا اور آلیو جلدی سے مکان کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ اس روز شام کی ٹھٹھرتی، منجمد ویرانی میں مجھے ایک شعلے کی طرح بھڑکتی ہوئی خون رنگ چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ میرے ان بازوؤں سے بلند ہوئی تھی جن کے حلقے میں فارول کی گرم لہریں آلیو کا سانس بن کر سمٹ آئی تھیں۔ پھر میں کئی بار آلیو کے مکان کی عقبی گلی میں گزرا اور کچی دیوار پر پھیلی ہوئی انگور کی بیل کے قریب پہنچ کر کئی بار اس وحشی شعلہ فشاں چیخ کو سنا۔ لیکن آلیو کہیں نظر نہ آئی۔ کہیں دکھائی نہ دی اور آج صبح لیزا نے مجھے بتایا کہ کل آلیو کی شادی ہو رہی ہے۔

ہاں ----- کل آلیو کی شادی ہو رہی ہے اور کل ہی دلوں کے پرچم سرنگوں ہوں گے۔ اور سیب کے شگوفے ٹہنیوں پر سے ٹوٹ کر خاک پر گر پڑیں گے اور میرے پیار کی لاش چشمے کے نیلے پانی میں پتھروں پر ملے گی۔ اس نے دلہن کا لباس پہنا ہوگا اور بالوں میں سیب کے پھولوں کی ننھی سی ٹہنی لگا رکھی ہوگی۔ آلیو کے بالوں سے اتارا ہوا سفید گلاب میرے پاس ہے۔ وہ مرجھا گیا ہے اور اس کی پتیاں خشک ہو کر زرد ہو گئی ہیں۔ یہ پھول میرے ساتھ جائے گا اور میرے ساتھ ہی ایک بار پھر زمین کی تاریک تہوں کو چیر کر نمودار ہوگا۔ اب میرے سامنے ایک اور جنم کا انتظار ہے طویل اور دشوار گزار۔

اب آلیو مال کے بس سٹاپ پر سے نہیں اترا کرے گی۔ اب کوئی فارول کی اداس خوشبو اڑاتا، چپ چاپ قدم اٹھاتا فٹ پاتھ پر سے نہیں گزرا کرے گا۔ گرمی میں پیپل کے درخت تلے کھڑا ہو کر اس گھڑی کا انتظار کروں گا جب آلیو وہاں سے اپنے بچے کو لے کر گزرے گی۔ وہ پت جھڑ کا آخری دن ہوگا اور پیپل کے سارے زرد پتے ایک ایک کر کے مجھ پر گر چکے ہوں گے صرف ایک پتا باقی ہوگا کہ آلیو اپنے معصوم بچے کو ساتھ لئے مجھے دیکھے بغیر وہاں سے گزر جائے گی اور وہ پتا اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر چکر کھاتا، سسکیاں بھرتا میرے قدموں میں آن گرے گا۔ پھر میں اسے اٹھا کر اپنے کوٹ کی اندر والی جیب میں چھپا کر شو روم میں واپس آجاؤں گا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاؤں گا۔

آلیو! آلیو! ہم بھی تمہاری محبت میں اسی خشک پتے کی طرح اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر فٹ پاتھ پر گر پڑے ہیں اور وقت کی تیز آندھی ہمیں اڑائے لئے پھر رہی ہے۔ پھر کبھی اس جنگل میں کبھی اس ویرانے میں ----- کل تمہاری شادی ہوگی۔ تم دلہن بنائی جاؤ گی۔ تم پیتم دیس بسانے گھر سے نکلو گی اور ہم گاؤں کنارے بیٹھ کر تمہاری بارات کی شہنائیاں بھی نہ سن سکیں گے۔ جانتی ہو جب ہمارے ہاں دلہن گھر سے نکلتی ہے تو اس کی سہیلیاں کون سا گیت گاتی ہیں؟ وہ ہاتھوں میں حنا آلود ریشمی رومال تھامے ہچکیاں لیتی دلہن کی طرف اپنے سوگوار چہرے اٹھا کر کہتی ہیں:

ہمیں بھلا تو نہ دو گی؟

دلہن!

اور روتی ہوئی دلہن!

اور آلیو! اگر تم دلہن بن کر ہمارے گھر آتیں تو میری بہنیں رات بھر سرخ کپڑے پہن کر ڈھولک پر گیت گاتیں۔ میری ماں مکان کی دہلیز پر سرسوں کا تیل انڈیل کر تمہیں اپنے گلے سے لگا لیتی اور پھر ---- پھر ایک ایک کر کے سب عورتیں آنچل اٹھا اٹھا کر تمہارا مکھڑا دیکھتیں۔ تم شرما جاتیں اور وہ ہنس ہنس کر کہتیں "شرماؤ نہیں دلہن! مسکن! آلیو!

اس کے بعد کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ میرا دوست خاموش تھا، چپ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر جیسے خاک اڑ رہی تھی اور کھڑکی سے باہر پچھلی رات کا زرد چاند ویران کھائی کے بالکل اوپر جھک آیا تھا۔

رات کا داغ

آج پھر شہر سے باہر گھنے سیاہ باغوں میں چاند طلوع ہوا ہے۔

پت جھڑ کے براؤن پتے کی طرح یہ کسی ان دیکھے درخت کی ٹہنی سے جھڑ کر رات کے دامن میں آن گرا ہے۔ اس کی ٹھنڈی آنچ نے تاریک درختوں اور گنجان گلی محلوں کے اوپر دھیمی دھیمی چمک کا غبار سا اڑا دیا ہے۔ اس نیم روشن اجالے میں درختوں، مکانوں مسجدوں کے گنبدوں اور میناروں کے خاکے ابھر آئے ہیں اور شہر سے دور امرود اور ناشپاتی کے باغوں کی جانب سے طوطوں کے شور مچانے کی صدائیں آنے لگی ہیں۔ سردیوں کی شام گلی کوچوں میں سرد مہر تنہائی بن کر اتر آئی ہے۔ یہ اپنے ساتھ مرطوب دھواں اور نم دار دھند لئے لائی ہے۔ یہ پراسرار ٹھنڈے اندھیروں والی رات کی چھوٹی بہن ہے۔ اس کے شہر میں داخل ہوتے ہی گھروں میں آگ روشن ہو جاتی ہے، اندھیری کوٹھڑیوں میں چراغ جھلملانے لگتے ہیں۔ گرم سماوار اور کیتلیوں میں چائے کی پتیاں چھوڑ دی جاتی ہیں اور بچے اپنے اپنے بچھونوں کی طرف چلے آتے ہیں۔ پھر سرخ چونچ والا ایک اداس پرندہ اپنے پر پھیلائے کسی مکان کے آنگن سے اڑتا ہے اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں والے نیم تاریک مکانوں کے اوپر سے ہوتا ہوا گنجان سیاہ باغوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ ان باغوں میں گرم خوشبوئیں اڑانے والے، گرم سانس لینے والے گل مہر، گلاب اور گیندے کے نازک پھول کھلتے ہیں۔ ان کی پنکھڑیوں پر کسی دلہن کے ادھ کھلے شرمیلے ہونٹوں کا گمان ہوتا ہے۔ گرم اور سرخ بوسوں کے یہ مہکیلے نشان سانولی رات کے مکھڑے پر کس نے ثبت کئے ہیں!!

سنسان کالے باغوں کی تنہا رات، حنائی ہتھیلیوں سے طلوع ہوتی ہوئی گرم خوشبو کے سانس لیتی رات رات بھر جاگتی رہتی ہے۔ نیم سرخ افسردہ دل چاند امرود اور ناشپاتی کے درختوں میں سے دبے پاؤں، ننگے پاؤں بلند ہوتا ہے اور دور گندے نالوں کے درمیان گنجان بستیوں کو دھوئیں کے کنڈلوں میں سمٹے ہوئے دیکھتا ہے۔ شب کے سیاہ مخمل پر جہاں وہ اپنے پیروں کے زرد نشان چھوڑ جاتا ہے وہاں منہ اندھیرے زرد گلاب کی پنکھڑیاں اپنی آنکھیں کھولتی ہیں۔

رات ان شگوفوں کو اپنے کانوں میں سجائے، بال کھولے، آم کی گھنیری چھاؤں میں میری راہ دیکھا کرتی ہے اور میں ایک نیم روشن گندی گلی والے مکان کی دوسری منزل میں کھڑکی کے پاس پلنگ پر لیٹا دھوبیوں کی چھوا چھو اور پھیری والوں کی بے ہنگم صدائیں سنتا رہتا ہوں۔ میرے سامنے میز پر بیئر کی بوتل میں کاغذی پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ پڑا ہے۔ بیئر کی بوتل میری ہے اور کاغذ کے پھول میرا ایک کاغذی دوست دے گیا ہے۔ نہ بوتل میں بیئر ہے اور نہ پھولوں میں خوشبو ----- پھر بھی یہ ایک دوسرے سے بغل گیر رہتے ہیں جس طرح میں اپنے دوست سے! -----

یہ محلہ شہر کے عام محلوں کی طرح گندہ، گنجان، تاریک اور پر شور ہے۔

یہاں موچی، دھوبی، نانبائی، مستری، گوجر، کلرک اور سبزیوں کے آڑھتی آباد ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندو اور سکھ رہا کرتے تھے اور وہ کبھی کبھار مکانوں کی سفیدیاں اور چھوٹی موٹی مرمتیں کروا لیا کرتے تھے۔ لیکن پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنے والے شاہین بچوں نے ان مکانوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میرے بازو والے گھر میں میرٹھ کے ایک حکیم صاحب رہتے ہیں۔ ایک رات انھیں پان کی حاجت ہوئی۔ پوٹلی کھولی تو معلوم ہوا کہ چونا غائب ہے بڑے پریشان ہوئے پان بھی برابر کا کھاتے ہیں۔ فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ چمچ کی مدد سے دیوار کی سفیدی کو ایک جگہ سے کھرچا اور بیڑے میں رکھ کر کھا گئے۔ خدا نہ کرے کبھی ان کے ہاں فاقہ آ جائے، کوئی عجب نہیں کہ حکیم صاحب مکان کی منڈیریں ہی کھانا شروع کر دیں۔ آپ کے بڑے لڑکے کو گانے کا بہت شوق ہے۔ دن میں کئی بار یہ مرض اس پر حملہ کرتا ہے۔ جب کبھی میں کاغذ قلم لے کر کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو ساتھ والے مکان سے ایک دردناک چیخ بلند ہوتی ہے اور لتا یا راج کماری کا بھوت حکیم صاحب کے لڑکے کا گلا دبانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس کے حلق سے عجیب قسم کی ڈراؤنی آوازیں نکلتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا کوئی قصائی کسی داڑھی والے پہاڑی بکرے کو گھسیٹتا ہوا بوچڑ خانے لئے جا رہا ہو۔

میں کاغذ قلم میز پر رکھ کر بکرے کے ذبح ہونے کا انتظار شروع کر دیتا ہوں۔ جب چیخ پکار کے اس بے چین سمندر میں سکون کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ----- سکوت کی ایک ننھی سی گھڑی آتی ہے تو میں قلم اٹھاتا ہوں اور سگریٹ سلگا کر لکھتا ہوں کہ ----- ڈمر ----- ڈمر

----ڈمر----

"کپڑا لے ریشمی ----- سوٹاں، قیمچاں، شلواراں، گھمٹیاں- ویلاں، -----" پھیری والا بزاز اپنا ڈمرو بجاتا گلی میں داخل ہوتا ہے- شاید شوجی مہاراج نے دھرتی کا ناش کرتے سمے اس بے دردی سے ڈمرو نہ بجایا ہو گا جس طرح یہ بزاز بجاتا ہے- پہلا ڈمرو گلی میں داخل ہونے پر بجتا ہے- دوسرا عین میری کھڑکی کے نیچے اور تیسرا گلی کے موڑ پر- پھر وہ "سوٹاں، شلواراں، اور ویلاں" کی تیکھی اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی ہانک لگاتا ہے- جیسے شوجی مہاراج نے اپنا ترشول تھام لیا ہے اور دھرتی کا سینہ چھلنی ہونے لگا ہے- پھر ڈمرو بجتا ہے- ترشول چلتا ہے اور "سوٹاں، شلواراں، ویلاں" اور ستارے، پہاڑ، چٹانیں، کھمبے اور مکان اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگتے ہیں اور ان کے نیچے سب کچھ دب جاتا ہے- وادیاں، چشمے، دریا، پھول اور چشمے اور میرا قلم -----اگر کچھ باقی رہتا ہے تو اللہ کا نام اور بزاز کا ڈمرو ----- ڈمر ----ڈمر-----ڈمر----

گوجروں کے باڑے میں جگہ جگہ گوبر کے ڈھیر پڑے ہیں جہاں مکھیاں اور مچھر بھنبھنایا کرتے ہیں- یہ گوبر تھاپیوں کی صورت میں ان کے مکانوں کی دیواروں پر بھی چڑھ گیا ہے- شام کو جب شہر سے باہر امرود کے باغوں میں گلاب، گل مہر ----- اور گیندے کے کیسری پھول اپنی مہک پنکھڑیوں میں سمیٹ لیتے ہیں تو گلی میں گوبر کی بدبو پھیلنے لگتی ہے- پھر وہاں کوئلیں کوکتی ہیں اور یہاں گائیں بھینسیں ڈکراتی ہیں- وہاں درختوں پر سے پکے ہوئے رنگ دار پھل گرتے ہیں اور یہاں کھرپوں کی مدد سے دیواروں پر سے تھاپیاں گرائی جاتی ہیں- اور دودھ میں پانی ملایا جاتا ہے- پھر ایک بھینس رسی تڑا کر اٹھ بھاگتی ہے اور اسکے ساتھ ہی اس کا مالک بھی دھوتی سنبھالتا بھاگ کھڑا ہوتا ہے- اور محلے میں وہ دھما چوکڑی مچتی ہے کہ بچے ڈر کر گھروں کی ڈیوڑھیوں میں چھپ جاتے ہیں اور ان کی مائیں کھڑکیوں میں لٹک کر انھیں پکارنے لگتی ہیں- "وے شیدے ----- وے شبیر ----- وے بشیر -----" دن بھر یہ گائیں بھینسیں گلی میں ادھر اُدھر بیٹھی جگالی کیا کرتی ہیں کتھئی رنگ کی ایک گائے کو مجھ سے بڑی عقیدت ہے- وہ اپنی دیگر مصروفیات میں سے ایک آدھ گھنٹہ میری کھڑکی کے نیچے ضرور بسر کرتی ہے- چپکے سے آن کر بیٹھ جاتی ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد عبرت انگیز ڈکاریں لیتی رہتی ہے- ایک روز میں پلنگ پر لیٹا، ہملٹ

پڑھ رہا تھا کہ اچانک ----- ڈائیں ----- کی خوفناک آواز بلند ہوئی- "ہملٹ" اپنے باپ کی روح سے ہم کلام تھا- میرے ساتھ وہ بھی ڈر کر سہم گیا- معلوم ہوا کہ میری دوست گائے نے ڈکار مارا تھا- لیکن اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا ----- جیسے برادرم شکسپیئر نے ڈراما لکھتے لکھتے یہ حرکت کی ہو- میں نے کتاب میز پر پھینکی اور ڈکار مار کر سو گیا-

سامنے والے مکان کی بیٹھک میں کچھ موچی کاریگر بیٹھتے ہیں- یہ لوگ پرانی وضع کی کاٹھ کی ایڑیوں والے سینڈل اور سلیپر بناتے ہیں- سارا دن یہ پتھر کی ملائم سلوں پر چمڑا کاٹتے اور کوٹتے رہتے ہیں- دوپہر کو ریڈیو، فل سپیڈ، پر چھوڑ کر سنتے ہیں اور جب ریڈیو بیہوش ہو جاتا ہے تو خود گانا شروع کر دیتے ہیں-

دھوبی گھاٹ بھی محلے ہی میں ہے- ان لوگوں نے اپنے احاطے میں پانی کے حوض بنا رکھے ہیں جن میں کھڑے ہو کر یہ میلے کپڑوں کو پتھروں پر پٹخا کرتے ہیں- ایسا کرتے سے ہر آدمی حلق میں سے اپنی الگ آواز نکالتا ہے- یہ آوازیں خود بخود نکلتی ہیں- اگر ایسا نہ ہو تو وہ بہت جلد تھک کر چور ہو جائیں- ان کی بسم اللہ رات کے پچھلے پہر تین بجے کے قریب ہوتی ہے- آپ بڑے سکون کے ساتھ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں کہ اچانک، شڑاپ، ----- شڑاپ -----، پٹاخ ----- پٹاخ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں- آپ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ کا خواب خرگوش دھوبیوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے بھاری بھاری پتھروں پر پٹخ رہے ہیں- اب آپ سونے کے لاکھ جتن کریں مگر وہ خواب خرگوش پھر قابو میں نہ آئے گا ----- میلے کپڑوں کے گیلے گٹھے دھڑا دھڑ آپ کی چارپائی پر ----- آپ کی پشت پر کوٹے جا رہے ہیں اور آپ کو دھکے مار مار کر اس گھر سے ----- اس گلی سے ----- اس شہر سے باہر نکالا جا رہا ہے- ہفتے میں ایک بار یہ لوگ کپڑوں کا میل کاٹنے کے لئے بھٹی گرم کرتے ہیں- اسے اصطلاح میں بھٹی چڑھانا کہتے ہیں- اس روز گلی میں "ڈیٹول" ایسی تیز بو پھیلی رہتی ہے- آپ جو چیز بھی کھائیں گے، پہنیں گے ----- پڑھیں گے، پئیں گے "ڈیٹول" اس میں ضرور ہو گی-

ایک روز میں تھامسن مان کی کہانی پڑھ رہا تھا کہ دھوبیوں نے بھٹی گرم کرنا شروع کر دی- احاطے کی طرف سے "ڈیٹول" کی تیز بو کے بھبکے آنے لگے- مجھے ایسا لگا جیسے مان صاحب کہانی کا دھندا چھوڑ- کپڑے اتار بھٹی چڑھانے لگے ہوں- میں نے کتاب بند کر دی

اور کپڑوں کی دھلائی کا حساب کتاب کرنے لگا۔ کمزور دل عینک پوش کلرک اپنے بڑے بھائی کے ہاں رہتا ہے۔ اس کی شادی کو زیادہ مدت نہیں گزری۔ بھاوجہ نے ان لوگوں کو مکان کی تیسری منزل میں دیس نکالا دے رکھا ہے۔ یہاں صرف ایک برساتی ہے اور ایک دالان ---- برساتی کے آگے بوریاں ڈال کر اندر پلنگ اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان سجائے یہ دونوں ہنس کھیل کر، لڑجھگڑ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے۔ دونوں کا آپس میں بڑا پیار ہے۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ کلرک کی بھاوجہ دلہن کو طعنے دے رہی ہے۔ دلہن پلو آنکھوں میں ٹھونسے برساتی کے کھم سے لگی سبکیاں بھر رہی ہے اور پریشان خاوند دونوں کو چپ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر بد مزاج جھگڑالو بھاوجہ بولے جا رہی ہے اور دلہن روئے جا رہی ہے۔ مت رو۔ مت رو۔ کم سخن بے زبان گائے مت رو۔ یہاں تیرا کون ہے؟ نہ ماں - نہ باپ۔ نہ بہن نہ بھائی۔ خاوند ہے۔ تو وہ بھائی کے احسانوں تلے دبا ہوا۔ وہ نہ بھاوجہ کے سامنے بول سکتا ہے نہ بھائی سے گلہ کر سکتا ہے۔ اس نے اس لئے شادی کی تھی کہ اسے اس ڈربے میں ایک عورت کی ضرورت تھی اور وہ کہیں باہر جھک نہیں مار سکتا تھا۔ اسے اب معلوم ہوا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ اپنے ڈربے میں جھک مارتا ہے وہ بیوی بھی ہے اور کسی کی بہن اور کسی کی بیٹی بھی ہے اور کچھ دن گزر جانے پر وہ ماں بھی ہو گی۔ اس لئے وہ پریشان ہے اور تمھیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مت رو، مت رو اور اپنے آنسو پونچھ ڈال!

دوسرے روز شام کو میں نے دیکھا کہ کلرک کے ہاتھ میں لفافہ ہے۔ جس میں سے شکر پارے نکال کر اپنی بیوی کے منہ میں ڈال رہا ہے۔ دلہن شرما بھی رہی ہے اور خوشی سے پھولی بھی نہیں سما رہی۔ میں اس وقتی مگر سچی خوشی کا منظر دیکھ کر ہنس پڑا۔ خدا انھیں باہم پیار محبت کی توفیق دے اور وہ دن ذرا دیر سے آئے جب اس کلرک کے ہاتھ میں شکر پاروں کی جگہ جوتا ہو---- سبزی ترکاریوں کے آڑھتی کا لونڈا بال سنوار کر اپنے مکان کے باہر بچھی ہوئی کھاٹ پر آن بیٹھتا ہے اور فصل نانبائی کی لونڈیا سے آنکھیں لڑایا کرتا ہے۔ اس لونڈیا کا رنگ کالا مگر نین نقشہ تیکھا ہے۔ وہ بھی داتن سرمہ لگا کر کھڑکی میں آ جاتی ہے اور اپنی سہیلی سے باتیں شروع کر دیتی ہے----

سناؤ داری کیا حال ہے؟ آج تو بڑی لشک رہی ہو---- آڑھتی عاشق بھی اس کا جواب

اپنے کسی دوست کو مخاطب کر کے دیتا ہے-----

تم بھی تو قیامت ہو کالو! چلو پھر آج بکس میں بیٹھ کر "رنگیلی" دیکھیں۔ کیوں؟ پھر ہے صلاح؟

اسی وقت اندر سے بھاری بھرکم بڑے آڑھتی کی آواز آتی ہے:

"اوے مھنے! مھنیا اوئے---- بھنڈی توری کی پرچی کہاں ہے؟"

اور مھنا "آیا میاں جی۔" کہہ کر اندر اٹھ دوڑتا ہے۔

چھٹی کے روز محلے کی رونق اور شور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دن گلی کے لڑکے لنڈے کی نیلی پیلی واہیات پتلونیں پہنے۔ گلے میں بھڑکیلے رنگوں والے مفلر لٹکائے، بالوں میں تیل اور جوتوں پر پالش چمکائے مرغوں کی طرح ادھر ادھر اینڈتے پھرتے ہیں۔ کبھی یہاں کھڑے ہو کر فحش مذاق پر قہقے لگا کر ہنستے ہیں اور کبھی وہاں کھڑے ہو کر راہ چلتی عورتوں پر دبی زبان میں آوازے کستے ہیں اور انھیں سر سے پاؤں تک گھورتے ہیں۔ ان میں کوئی موچی کا لڑکا ہے اور کوئی دھوبی کا۔ کوئی کسی ریٹائرڈ حوالدار کا فرزند ہے تو کوئی کسی پیشہ ور سرکاری گواہ کا۔ کوئی نانبائی ہے تو کوئی خرادیہ اور کوئی گوجر---- کوئی نورجہاں کا عاشق ہے تو کوئی صبیحہ کا شیدائی۔ کوئی ثریا کے عشق میں گرفتار ہے تو کوئی مدھوبالا سے شادی کا خواہش مند ہے۔ کوئی نانبائی کی لڑکی پر فدا ہے اور کوئی کسی دھوبن کی پریم کہانی مزے لے لے کر سناتا ہے۔ کوئی فلم ایکٹر بننے کا شوقین ہے اور کوئی آبادان جا کر خوب روپیہ کمانے کے بعد صبیحہ سے شادی رچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان میں سے ہر دوسرے کی بہن کسی تیسرے سے عشق کرتی ہے۔ یہ دوستیوں کی آڑ میں ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی بہنوں سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی ماں کو گنٹھیا کا مرض ہے، کسی کی بہن دق کی مریض ہے اور کسی کا باپ دمے میں مبتلا ہے سیڑھیوں میں بیٹھا کھانستا رہتا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے مقروض ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خامیوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کسی کا بڑا بھائی پورے کنبے کا بھار اٹھائے ہوئے ہے، کسی کا بہنوئی مہینے بھر کا خرچ دیتا ہے اور کسی کی دائم المریض ماں محلے والوں کے کپڑے سی کر انھیں کھلاتی ہے اور اس قابل بناتی ہے کہ یہ مدھوبالا سے عشق کر سکیں۔ ان میں کوئی چوتھی پاس ہے اور کوئی پانچویں فیل ہے۔ کسی کے بال دلیپ کمار

کٹ کے ہیں اور کسی کا کرتہ بھارت بھوشن کی طرح کا ہے۔ کوئی بالکل ان پڑھ ہے اور خراد والوں کی دوکان پر کام کرتا ہے۔ کوئی قالین بافوں کی مار سے بھاگا ہوا ہے اور کوئی اپنے باپ کے ساتھ شام کو تنور پر بیٹھتا ہے۔ کوئی کسی کارخانے میں اپرنٹس ہے اور کوئی درزی کی دوکان پر ابھی کاج کرنا ہی سیکھ رہا ہے اور کوئی بیکار ہے اور سوائے ماں بہن سے لڑنے جھگڑنے، انھیں گالیاں دینے اور بہنوئی کی روٹیاں توڑنے اور بے غیرتی کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا۔ کوئی راتوں کو بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ باغوں، ہوٹلوں اور سنیما گھروں میں گھومتا ہے اور کوئی جواریوں کی بیٹھک میں جا کر انھیں جوا کھیلتے، ہارتے جیتتے، لڑتے جھگڑتے، شراب پیتے اور خرمستیاں کرتے دیکھا کرتا ہے۔

ابھی جوانی کا آغاز ہے۔ ابھی اس گلی نے انھیں بہت کچھ دینا ہے۔ بہت کچھ سکھانا ہے۔ جب یہ بڑے ہو جائیں گے اور سب کچھ سیکھ جائیں گے تو اس گلی کے نام اپنا سارا قرض بے باق کر دیں گے۔ جو کچھ انھوں نے یہاں سے حاصل کیا ہے وہ بمعہ سود اسے واپس کر دیں گے۔ کوئی کسی ہرے ہوئے کسی جیتے ہوئے جواری کو چاقو گھونپ کر، اس کا چاقو کھا کر مر جائے گا۔ کوئی کسی کی لڑکی اٹھا کر بھاگ جائے گا۔۔۔ اور کسی کی خون آلودہ دم توڑتی ہوئی لاش کو لوگ نالی پر سے اٹھائیں گے۔ کوئی مجمع لگا کر منجن بیچے گا اور کوئی اس مجمع میں لوگوں کی جیبیں کاٹے گا۔۔۔ کوئی حلال کی روزی کماتے کماتے تنگ دستی اور حق کی چھری سے حلال کر دیا جائے گا۔۔۔ اور کوئی مرچوں میں رنگ دار بورا اور چائے میں کیکر کی چھال ملاتے ملاتے لکھ پتی بن جائے گا اور ایک دن پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر حج بیت اللہ کی غرض سے عازمِ حجاز ہو گا۔ اور جب واپس آئے گا تو چہرہ پہلے سے زیادہ منحوس اور بے مہ ہو گیا ہو گا اور جب بڑھاپا آئے گا تو سوجے ہوئے جوڑ لئے کھاٹ پر پڑ جائے گا اور لاڈلی اولا اس کی موت کی دعا مانگ رہی ہو گی۔۔۔ اور کوئی بزازی کے تھان اٹھائے ڈمرو ہاتھ میں لئے گلی گلی گھومتا پھرے گا اور بارہ آنے گز کی ململ تین روپے گز فروخت کرے گا اور ایک رو بیمار پڑ جائے گا۔۔۔ اور جب ڈاکٹر کا نسخہ لے کر دوائیوں کی دوکان پر جائے گا۔۔۔ سوا روپے کا ٹیکہ پندرہ روپے میں ملے گا۔۔۔ پھر کئی ٹیکے لگیں گے۔ کئی پندرہ روپے دیکھتے دیکھتے اڑ جائیں گے اور جب اچھا ہو جائے گا تو پھر ڈمرو لے کر چل پڑے گا اور ہر گز کے پیچھے دو روپے کمائے گا اور ہر سوا روپے کا ٹیکہ پندرہ میں خریدے گا اور یوں ایک اور علی با

۔۔۔۔ چالیس ہزار۔۔۔۔ چالیس لاکھ۔۔۔۔ اور چالیس کروڑ چوروں کے اس ہمہ گیر گروہ میں شامل ہو جائے گا جن کی کمین گاہوں کا سلسلہ مشرق بعید سے مشرق وسطیٰ اور مشرق وسطیٰ سے نئے نئے براعظموں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان میں وہ بے چارہ جو کچھ نہ کر سکے گا۔۔۔ گلی کی نکڑ پر کسی مکان کی سیڑھیوں میں پان سگریٹ کی دوکان کرے گا۔ کسی خوش گل لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک فوٹو کھنچوائے گا۔ اسے فریم کروا کر دوکان میں "آج نقد کل ادھار" کی تختی کے ساتھ لگائے گا اور خدا کا نام لے کر بلیک میں سگریٹ بیچنے شروع کر دے گا۔ اور ایک روز پکڑا جائے گا اور ساٹھ روپے جرمانہ ادا کر کے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کچہری کے احاطے سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گا۔ یہ گلی ان لوگوں کو یہی کچھ دے سکتی ہے اور یہ لوگ بھی اس گلی کو یہی کچھ واپس کر سکتے ہیں۔ یہ ایک کھوٹے سکوں کی ٹکسال ہے جہاں سے نکلا ہوا ہر سکہ ادھر ادھر سے بھٹک کر پھر اسی مشین میں آن گرتا ہے۔

یہاں پر لوگ ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو کر رہتے ہیں۔ پانچ کمروں والے مکان میں دس کنبے آباد ہیں اور ہر کنبہ دوسرے کنبہ سے چوبیس گھنٹے لڑائی پر آمادہ رہتا ہے اور جب یہاں لڑائی چھڑتی ہے کبھی مردوں کی وجہ سے عورتیں میدان جنگ میں کود پڑتی ہیں اور کبھی عورتوں کو برسرِ پیکار دیکھ کر مرد مورچے سنبھال لیتے ہیں۔ پھر عورتیں الگ لڑتی ہیں اور مرد الگ لڑتے ہیں۔ بچے الگ لڑتے ہیں اور مرغیاں مرغ الگ۔ عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کو فحش اور ننگی گالیاں دیتی ہیں اور ایک دوسرے کے کچے چٹھے بیان کرتی ہیں۔ یہ بھید اس وقت کھلتا ہے کہ کون سی دھوبن کس نانبائی کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔ کون سی موچن کس کس کے پاس جاتی ہے اور کون سی عورت اصل میں کس کا بچہ گود میں لئے پھرتی ہے۔ ایسی لڑائیاں یہاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اور میں انھیں بڑے شوق سے چق کے ساتھ لگ کر دیکھا کرتا ہوں۔ میری نظر لڑنے والی عورتوں کے چہروں پر ہوتی ہے جو وحشت۔۔۔ از خود رفتگی اور بے حیائی کے اس مکروہ مظاہرے میں نیلے پیلے ہو کر یوں بگڑے ہوتے ہیں۔ جیسے ان پر مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اس وقت خوش شکل عورتیں بھی بد صورت اور کریہہ المنظر دکھائی دیتی ہیں۔ اور میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر انسان کے ذہن میں سے وہ شے نکال دی جائے جو اسے متوازن اور معتدل رہنا سکھلاتی ہے تو وہ محض اعصاب، پٹھوں۔۔۔ رگوں اور وریدوں کا مجموعہ ہے جن کے سمٹنے۔۔۔ سکڑنے اور پھیل جانے سے وہ دیکھتے دیکھتے

خوبصورت سے بدصورت اور بدصورت سے مکروہ صورت بن جاتا ہے اور اگر یہی عارضی عمل مستقل حیثیت اختیار کر جائے تو ہم انسان کا چہرہ دیکھ کر بتلا سکتے ہیں کہ یہ بے حیا ہے، یہ کمینہ خصلت ہے اور یہ سنگ دل ہے۔ اسی شئے لطیف کے ہونے سے وہ انسان ہے اور اگر یہی نہیں تو وہ حیوان سے بھی کم تر ہے، بد تر ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ شے مجھے اس گلی میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔

ویسے رات کو اس گلی میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور دوکان بڑھا کر یا سنیما دیکھ کر واپس گھروں کو جانے والے لوگ تجربے اور حافظے کی روشنی میں گھر پہنچتے ہیں۔ ادھر سے جانے والا آدمی ادھر سے آنے والے کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ جب وہ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو ان کی طرح گمراہی کے اندھیرے میں ٹاکک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔۔۔ انسانوں کے ساتھ اس محلے کے مرغ بھی طبیعت کے اعتبار سے غیر معتدل اور غیر معتبر ہیں۔ ان میں سے کوئی شام کے سات بجے صبح کی اذان دیتا ہے تو کوئی رات کے نو بجے۔ شاید یہ بھی امریکی گندم کا اثر ہو۔

مگر گلی کی نکڑ والا بوڑھا پھل فروش اس گندم سے بھی محروم رہتا ہے۔ میں نے اسے شائد ہی کبھی روٹی کھاتے دیکھا ہو۔ تنگ سی گندی کوٹھڑی میں وہ چیتھڑوں کے درمیان بیٹھ کاغذ جلا کر ٹین کے ڈبے میں چائے بناتا ہے اور اسے ناریل کے کھوپے میں ڈال کر پیا کرتا ہے۔ ضعیف میلی انگلیوں کی کمزور گرفت میں کھوپا کانپ رہا ہوتا ہے اور بوڑھا ہلتے ہوئے سر کو جھکائے اس شوق اور رغبت سے چائے پیتا ہے جیسے بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پی رہا ہو۔ وہ گندے اور گلے سڑے پھل بیچا کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ پھل میوہ منڈی کے کوڑا کرکٹ سے اٹھا کر لاتا ہے۔ ایک روز داروغہ صفائی نے اس کا سارا ٹوکرا نالی میں پھنکوا دیا۔ بوڑھا کچھ نہ بول سکا۔ دوکان کے پھٹے پر بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھتا رہا جو اس کی محنت کا پھل نالی میں گرا رہے تھے۔ داروغہ صاحب گلی میں کھڑے موٹے آڑھتی سے کہہ رہے تھے!

"بس جی یہی لوگ بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ بھلا ایسے پھل کھا کر کبھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟"

"او داروغہ جی! بھلا ایسے پھل بیچ کر کبھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ پھر بھی یہ بے شرم بڑھاپا زندہ ہے اور دو کھوپا چائے اور تنور کی ایک روٹی کے لئے نیم مفلوج کتے کی مانند گلی گلی، گھر گھر، دربدر گندے پھل لئے پھرتا رہتا ہے اور بیماریاں پھیلاتا رہتا ہے۔ اگلی بار جب آپ بے مقصد آوارہ کتوں کو کھلانے کے لئے زہر کی گولیاں لائیں تو ایک گولی اس بوڑھے کے لئے بھی لیتے آئیں۔ اس لئے کہ یہ بھی آوارہ ہے، بے مقصد ہے، باؤلا ہے۔ اس نے گلی کے ملبے میں سے زندگی کا مرا ہوا سانپ نکال کر کھا لیا ہے اور باؤلا ہو گیا ہے اور محلے والوں ۔۔۔۔۔ شہر والوں کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ دیکھتے نہیں اس کے منہ سے موت کا نیلا جھاگ بہہ نکلا ہے اور اس کے اعصاب اکڑ گئے ہیں اور آنکھیں کھینچ کر آسمان کو ٹکٹکی باندھے تک رہی ہیں۔

اخبار فروش لونڈا سائیکل پر سوار چیختا ہوا گلی میں سے گزر گیا ہے:

"دے دیا۔۔۔ مہر چقندر بخش نے ایک اور بیان دے دیا شاباش مہر چقندر بخش آج تم نے قوم کو ایک اور بیان دیا ہے۔ ایک اور حرامی بچہ عطا کیا ہے۔ خدا تیرے سیاسی معاشقوں کی ناجائز اولادیں محفوظ رکھے۔ تو بیان پر بیان دیئے جا۔۔۔ بچے پر بچہ جنے جا۔۔۔ اور انہیں اپنی تقریروں کے غلیظ پوتڑوں میں لپیٹ کر رات کی سیاہی اور دن کی روشنی میں پھینکے جا۔۔۔ کبھی بھاٹی دروازے کے بدرُو میں۔۔۔ کبھی موچی دروازے کے گندے نالے میں۔۔۔! قوم کو اس وقت تیرے بیانوں کی۔۔۔ تیرے حرامی بچوں کی شدید ضرورت ہے۔ دیکھتے نہیں اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں اور سر ہل رہا ہے اور اس کی محنت کا پھل نالی میں ہے اور وہ لبوں پر موت کا جھاگ اور نحیف انگلیوں میں چائے کا کھوپرا تھامے تیرے بیان کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔!

میں بھی گلے میں دل کا کشکول لٹکائے۔۔۔ میز پر بیئر کی خالی بوتل میں کاغذی پھول سجائے کھلی کھڑکی کے ساتھ لگا سورج کے انتظار میں بیمار رات کے داغ گن رہا ہوں۔ میرے ناریل میں بھی پھیکی چائے ہے اور میری محنت کا پھل بھی میرے سامنے گندی نالی میں گرا پڑا ہے۔ میرا ایک ہاتھ روتی ہوئی آنکھوں پر ہے اور دوسرے ہاتھ سے کانٹوں کی فصل کاٹ رہا ہوں۔ اور کل جہاں دھان کی ہری بھری پنیری بوئی تھی آج وہاں غلاظتوں کے پھٹتے ہوئے بلبلے دیکھ رہا ہوں۔ جہاں اگر بتیوں کے اک تارے سلگائے تھے وہاں مردہ لاشوں کی

انتڑیاں جل رہی ہیں اور جہاں صندل میں بھگوئی ہوئی راکھڑیوں سے برادرانہ محبت کے پیمان باندھے تھے وہاں شمشانوں سے اٹھنے والی بھوتوں کی منحوس آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میرے ایک بازو پر عشق پیچاں کی بیل چڑھ گئی ہے اور دوسرا خاردار تاروں میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ ایک پاؤں اگر سنگ مرمر کے چبوترے پر ہے تو دوسرا دلال نے پکڑ لیا ہے اور میں اندھیرے کنوئیں میں پڑا ان بھائیوں کی یاد میں نوحہ کناں ہوں جو میرا خون آلودہ جامہ لے کر میرے گھر چلے گئے ہیں۔ کل جس دوستی کو میں نے امام ضامن کا تعویذ سمجھ کر اپنے بازو پر باندھا تھا آج وہ سانپ بن کر میری آستین میں پھنکار رہا ہے۔ جس اعتماد کے زہر کو میں نے زعفران کا نام دے کر پی لیا تھا وہ آج سیاہ خون بن کر میرے نتھنوں سے بہہ نکلا ہے۔ جس روشنی کو میں نے چاند سمجھ کر چوم لیا تھا۔ وہ بے نور راتوں کا اندھیرا بن کر میرے چہرے کو داغ دار کر گئی ہے جس ہاتھ کو میں نے پیار سے اپنے دل پر رکھا تھا آج اس کے ناخن میری پسلیوں میں پیوست ہیں۔ کل جس گم کردہ راہ کو میں نے اپنی دہلیز پر چراغ جلا کر پناہ دی تھی آج وہ میرے سامان کو بھرے بازار میں نیلام کر رہا ہے اور جس دوستی، جس بھروسے کو میں نے اپنی چھاتی کا دودھ پلایا تھا آج اسی کا زہر اپنا پھن اٹھائے مجھ پر جھکا ہوا ہے اور کل جن گورکنوں کے منحوس چہروں پر میں نے چشمۂ حیوان کے پانی کا پہلا چھینٹا مارا تھا آج وہ لحد کی تاریکی میں کدال لئے میری لاش کا انتظار کر رہے ہیں اور میرے ناریل کے درخت --- اور گل مہر کے پھول اور دلہنوں کے حنائی ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے ہیں اور میری محنت کا پھل گندی نالی میں ہے اور میرا سیاہ کشکول حیرت زدہ آنکھ کی طرح کھلا میرے گلے میں ہے۔ میرے دل میں ہے ---!

وہ کون سی رات ہو گی جس کے تاروں بھرے سمندر کی آخری لہر واپس جاتے ہوئے میرے کشکول میں چاندنی کے جھاگ کی خیرات ڈال دی جائے گی!

ایک سرخ چونچ والا معصوم پرندہ گنجان گلی محلوں کے اونچے نیچے مکانوں کی ویران چھتوں پر سے اڑتا ہوا میری کھڑکی کے سامنے منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اُس نے اپنی میٹھی بولی میں مجھے بتایا ہے کہ ان بوسیدہ مکانوں والی گندی گلیوں سے دور --- امرود اور ناشپاتی کے باغوں کے ساتھ کسی گھر کا ایک کھلا آنگن ہے --- بیری کے درخت والا آنگن!

چیت بساکھ کے مہینوں میں اس پیڑ پر سے کچے کچے بیر آنگن میں گرا کرتے ہیں

ہرے ہرے طوطے سارا سارا دن اس کی گھنیری شاخوں میں خوشی سے چلایا کرتے ہیں۔ ان دنوں بیری میٹھی میٹھی نیم گرم سی رس دار خوشبو دیا کرتی ہے، جسے سونگھ کر پنجاب کی "شکر دوپہروں" والے اداس گاؤں اور اُن کے ویران تکیئے یاد آ جاتے ہیں۔ یہ غمگین خوشبو آنگن میں پھیلی رہتی ہے۔ اسی آنگن میں پانی والے نل کے پاس ایک لڑکی بالوں میں گیندے کا بسنتی پھول لگائے انگیٹھی کو پنکھا کرتے ہوئے کوئلے سلگا رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں سُرمہ لگا ہے اور گال پر ایک ننھا سا کالا تل ہے۔ ایک رنگ دار شیاما چڑیا نل پر بیٹھی اپنی نازک گردن جھکائے اس لڑکی کو تکتی رہتی ہے اور اس کی چوڑیوں کی چھنکار سنا کرتی ہے۔ یہ لڑکی۔ بھی اس گھر کے آنگن کا ایک تل ہے۔ خوبصورتی --- محنت اور معصومیت کا تل --- نورانی صبح کے گال پر بھٹکی ہوئی رات کا افسردہ بوسہ!

میں کھڑکی کے پٹ سے لگا اپنی خوں رنگ آنکھوں پر ہاتھ رکھے، کبھی رنگ دار شیاما کو دیکھا کرتا ہوں اور کبھی اس لڑکی کو اور کبھی گیندے کے بسنتی پھول کو جو اُس کے سنہری بالوں میں مسکرا رہا ہے۔ ایک روز یہ ہنس مکھ پھول، پتھریلے آنگن میں گر کر مرجھا جائے گا اور دوسرے روز کوڑا کرکٹ کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا جائے گا۔ اُس کا چہرہ پژمردہ ہو گا اور پیلے مکھڑے پر جا بجا خشک آنسوؤں کے داغ ہوں گے۔ اُس روز میں اسی ڈوبے ہوئے سورج کو اُٹھا کر اپنے کشکول میں ڈال لوں گا اور کسی سنسان رات کو کانٹے دار بیری کے نیچے سوئے ہوئے آنگن میں اُس لڑکی کی تلاش میں نکلوں گا جس کے بالوں میں اس پھول کی مہک، اس آفتاب کی دھوپ بکھر کر رہ گئی ہے سیاہ آفتاب کو اپنی آستین میں چھپائے میں اُن اندھیرے سرد غاروں میں صبح کی پہلی کرنوں کا سراغ لینے چلوں گا، جہاں اندھے کافوری اندھیرے جدائی کی راتوں کے سیاہ پھریرے تیار کرتے ہیں، جہاں پتھروں پر بیٹھ کر بین کرتی ہوئی بیوہ شامیں اپنی رنگین چوڑیاں توڑتی ہیں اور اپنی مانگ کا سیندور نوچتی ہیں۔

جھکی ہوئی بیری کے سائے میں نل کے پاس بوڑھے باپ کے کپڑے دھونے اور کوئلے سلگانے والی شیاما! یہ گیندے کا پھول تیرے ہی بالوں میں سجنے کے لئے اپنی ڈال پر کھلا تھا اور اس پیڑ نے تیرے ہی قدم چھونے کے لئے اپنے پھل آنگن میں گرائے تھے۔ تو نے اپنے باپ کی میلی پگڑی پر صابن ملتے ہوئے ہمیں پلکیں اٹھا کر پیار بھری نظروں سے دیکھا

ہے۔ ہم تیرے دل کا بھید پا گئے ہیں اور ہمیں تجھ سے حیا آنے لگی ہے۔ ہم بھوکے ننگوں کو اپنی محبت کا زرتار دوشالہ مت اوڑھا --- ہم ایک نہ ایک دن اسے بیچ کھائیں گے۔ ہمارے ماتھے پر اس مقدس امانت کا تلک نہ لگا۔ ہم آنکھ اوجھل ہوتے ہی اس تلک کو داغ بنا کر دل میں اتارلیں گے اور تجھے بھول جائیں گے اور تجھے یاد کیا کریں گے۔ ہم تیرے بالوں میں پھول لگا کر تجھے پیار نہیں کرسکتے۔ اُس پھول پر تیرا نام لکھ کر تجھے سدا یاد رکھ سکتے ہیں اور جب وہ پھول مرجھا جائے گا تو ہم اسے اپنے کشکول میں سنبھال کر رکھ لیں گے اور جس روز تیرے سنہرے بال چاندی کے تاروں ایسے سفید ہو جائیں گے اور جوانی کے تمام تیکھے اور تنے ہوئے خطوط ڈھلک کر جھریاں بن جائیں گے اور تو کسی دوسرے گھر کے آنگن میں بیٹھی کمزور ہاتھوں سے پشم کات رہی ہو گی تو ہم سرنگوں آوارہ ہواؤں کے ساتھ بھٹکتے پھرتے چپکے سے ایکدن تیرے آنگن میں آن داخل ہوں گے--- اور تیرے پیار کا باسی پھول تیرے سفید بالوں کی چاندنی میں سجا کر واپس چلے جائیں گے اور تجھے خبر بھی نہ ہو گی۔ ہمیں دیکھ دیکھ کر ہم سے شرمانے والی ! ہم تجھے نہ دیکھتے ہوئے بھی تجھ سے شرمندہ ہیں۔ ہمارے دامن میں اپنے آنسو مت گرا۔ ہم ان موتیوں کو محض ایک ڈبیا سگرٹ کے عوض بیچ ڈالیں گے۔ اپنے بالوں میں پھول لگا کر ہماری گلی میں سے نہیں گزرنا۔ ہم تجھے بالوں سے پکڑ کر بازار میں لے جائیں گے۔ تیرا پھول اپنے دنبے کو کھلا دیں گے اور تجھے ایک اٹی سے بھی کم قیمت پر فروخت کردیں گے۔ ہم کسی تماش بین شرابی کا ادھ جلا، ادھ بجھا سگریٹ ہیں اور تو کسی بزرگ کے آستانے پر پڑا ہوا مور چھل ہے۔ ہم بیئر کی بوتلوں کے اُڑے ہوئے گرے ہوئے کاگ ہیں اور تو دودھیا مسجد کے منار کا چمکتا کلس ہے۔ تو وہ مانگ ہے جس میں سندور بھرا جاتا ہے اور ہم وہ لحد ہیں جو مردے نگلتی ہے۔ تیرے صدف کا سینہ تابناک موتیوں سے پُر ہے اور ہماری آنکھیں ایک ایک آنسو کو ترستی ہیں۔ ہمیں اس طرح نہ دیکھ --- جس طرح ہیرا کنکری کو اور سورج زمین کو دیکھتا ہے۔ ہمیں اس روشنی میں اپنے سارے داغ --- سارے دھبے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلے اور ہم سے روشنی کا رشتہ توڑ لے۔ ہماری نظروں سے اپنی نظریں نہ ملا۔ ہمارے پانی میں اپنا دودھ نہ ملا اور ہماری گودڑی میں اپنا لعل نہ چھپا۔ ہمیں پیار بھری نگاہوں سے مت دیکھ۔ شمشان بھومیوں میں گل صد برگ کے بیج بکھیرنے والی ! تجھے ایک روز مردہ ہڈیوں کی فصل

کاٹنا ہو گی۔ ہم سے کوئی ناطہ نہ جوڑ! ۔ ہم تاریک مکانوں کی بند کھڑکیوں سے لگ کر آنسو بہانے اور پچھتانے والوں میں سے ہیں ۔ ہم اپنے ہی دلوں پر چڑھا ہوا زنگ اور اپنے ہی خزانوں پر بیٹھا ہوا سانپ اور اپنے ہی سونے کو راکھ کرنے والے کیمیا گر ہیں۔ ہم نے سینکڑوں ماؤں کے دوپٹے بیچے ہیں۔ ہزاروں بھائیوں کا مردہ گوشت کھایا ہے اور لاکھوں بہنوں کے گریبان پھاڑے ہیں۔

تحقیق کہ ہم اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے ہیں اور ہم اپنی ہی آگ میں بھسم ہوں گے اور اپنے ہی زہر سے ہلاک ہوں گے اور اپنی ہی گلیوں میں قتل ہوں گے۔ ہمارے سینے میں پیوست ہونے والا تیر ہماری اپنی ہی کمان سے نکلے گا، اور ہمارے سر پر ہماری ہی تلوار چمکے گی۔ اور ہمارے پاؤں پر ہمارا ہی کلہاڑا گرے گا۔ --- ہمیں محبت اور عقیدت کی نگاہ سے نہیں --- حقارت ، ہیبت اور عبرت کی آنکھ سے دیکھ---!

فضل نانبائی کی لڑکی کنگھی پٹی کے بعد کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی ہے اور اپنے آڑھتی عاشق کا انتظار کرنے لگی ہے۔ اُس نے ایک ٹانگ کھڑکی کے ڈنڈے پر رکھ دی ہے اور اس کا سرخ ازار بند نیچے لٹکنے لگا ہے۔ آڑھتی عاشق اپنی دوکان کے اندر ہے لیکن کچھ دوسرے عاشق گلی کی نکڑ پر کھمبے کے نیچے جمع ہو گئے ہیں اور عشق بازی شروع ہو گئی ہے۔ ایک عشق کی ٹانگ کھڑکی کے ڈنڈے پر ہے اور دوسرا بجلی کے کھمبے تلے کھڑا ہے۔ پہلے عشق کا ازار بند لٹک رہا ہے اور دوسرے عشق کی زبان لٹک رہی ہے اور تیسرا عشق اپنی دوکان میں باپ کے پاس بیٹھا میتھی پالک کا حساب کتاب لکھ رہا ہے۔ اس گلی میں عشق کرنے کا یہی سبھاؤ ہے۔ یہاں ہر عشق کی ٹانگ کھڑکی کے ڈنڈے پر ہوتی ہے اور اس کا ازار بند لٹک رہا ہوتا ہے اور جس کا ازار بند نہیں لٹکتا اُس کی لاش کوٹھڑی میں لٹکتی ملتی ہے۔

سورج کسی کفن چور کی طرح اس گلی میں سے بے جان پھیکی روشنی سمیٹ کر لے گیا ہے اور اس گلی کا ایک اور دن خود کشی کے بعد دم توڑنے لگا ہے۔ دم توڑ چکا ہے۔ اب شام کا دھواں دبے دبے پھنسے پھنسے مکانوں کے روشن دانوں سے نکل کر گلی میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اور شام کے پھیری والوں اور فقیروں کا تانتا بندھ گیا ہے ۔ گول گپوں اور سوہن حلوے والے، ریوڑیوں اور بھٹوں والے، ردی کاغذ اور خالی بوتلوں والے مچھلی اور سبزی بیچنے والے، کنستروں کے ڈ[illegible] اور تالوں کو کنجیاں لگانے والے اور آنہ ٹکا لے کر اُس کا نفع

خدا سے دلوانے والے اور ان کے بے ہنگم شور میں خاموشی کا کاگ پھک سے اڑ گیا ہے اور وہ منہ زور بھینس کی طرح رسی تڑا کر گلی میں اودھم مچانے لگی ہے یہی وہ گھڑیاں ہوتی ہیں جب میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ گنجان اور گندی گلی اصل میں شور کا ایک بپھرا ہوا دریا ہے اور میں ایک بے گناہ قیدی ہوں جو عبور دریائے شور کی سزا بھگت رہا ہے۔ لیکن اب میں اس شور و غل کا عادی ہو چلا ہوں بلکہ اپنے آپ کو اس چیخ پکار کا ایک حصہ، اس چمڑا کاٹنے والی مشین کا ایک پرزہ سمجھنے لگا ہوں۔ اب میں منہ اندھیرے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہوں اور ہمہ تن گوش ہو کر دھوبی گھاٹ والوں کے ہیبت ناک دھماکے سنتا ہوں۔ جب لتا یا راج کماری کا بھوت حکیم صاحب کے لڑکے کا گلا دبانے لگتا ہے تو میں اُن کے ڈکرانے کی آوازیں بڑے خضوع و خشوع سے سنتا ہوں اور سن سن کر روتا ہوں اور جب پھیری والا بزاز اپنا ڈمرو بجاتا ہے تو میں وجد میں آن کر جھومنے لگتا ہوں۔ ایک ایسا ہی ڈمرو میں نے بھی بنوا کر رکھ لیا ہے۔ جب کبھی کوئی افسانہ لکھنے کا خیال آتا ہے تو میں اُسے نکال کر بجانے لگتا ہوں۔--- جس وقت رات گہری ہو جاتی ہے تو میں کیکر کی چھال والی چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر کھلی کھڑکی میں سے باہر گھٹے گھٹے میلے آسمان پر رات کے داغ دیکھا کرتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے رات کا خون پھٹ گیا ہے اور یہ تارے برص کے چٹاخ بن کر اس کے بدن پر جا بجا پھوٹ نکلے ہیں یہ آتشک زدہ فاحشہ --- گلی کی جھلنگا سی چارپائی پر پڑی ندامت اور اذیت کے پہلو بدلتی رہتی ہے۔

اب چاروں طرف پر اسرار گندہ اور گناہ آلود اندھیرا پھیل گیا ہے اور رات کی طوائفیں ایک ایک کر کے اپنے لیمپ بجھانے اور کھڑکیاں بند کرنے لگی ہیں۔ یہ وہ گھڑی ہے جب شہر سے باہر، بیری والے آنگن میں گیندے کا بسنتی پھول اپنی پنکھڑیاں سمیٹے سو رہا ہو گا اور امرود اور ناشپاتی کے باغوں میں اوس کی پریاں اپنے بالوں کو جھٹک جھٹک کر موتی لٹا رہی ہوں گی اور پھر وہاں سورج --- سرخ، روشن اور دمکتا ہوا سورج طلوع ہو گا اور بڑکے گنجان درختوں میں چڑیاں صبح کے گیت گائیں گی اور یہاں کیچ بھری آنکھوں والے منہ بسورتے بچے، کُرتے اٹھائے گھروں سے نکلیں گے اور گلی میں نالیوں پر آ کر بیٹھ جائیں گے۔ جس طرح اس گلی میں سورج کبھی نہیں آیا اُسی طرح یہاں رات بھی کبھی نہیں آتی--- رات کا سایہ آتا ہے رات کی سیاہ فام ناگن یہاں اپنی کینچلی چھوڑ کر شہر سے دور

گھنے باغوں میں --- گل مہر اور گیندے کے پھولوں میں جا کر چھپ جاتی ہے اور یہاں دھواں بھری شام اپنی آنکھوں پر جھکے ہوئے چھجوں کے بوڑھے ہاتھ رکھے --- سلگتے روشن دانوں میں سے نیم تاریک دھندلی گلیوں کو تکتی رہتی ہے --- تکتی رہتی ہے --- !

یہ گلی بھی ایک ناگن ہے، جس کے اندھیرے نے مجھے ڈس لیا ہے اور جس کا مہلک زہر آہستہ آہستہ میری رگ و پے میں سرائت کر رہا ہے۔ میں اس زہر کا علاج اُس سیاہ فام--- سرخ آنکھوں والی ناگن کے زہر سے کرنا چاہتا ہوں، جس کے بالوں میں پھول مسکرا رہا ہے اور آنکھوں میں سرمہ لگا ہے اور جو گل مہر اور گیندے کے پھولوں میں لیٹی ہوئی ہے۔

کسی رات جب گرم ہوا چل رہی ہو گی اور خشک پتے اڑ رہے ہوں گے میں دبے پاؤں اُس ناگن کے کنج میں جاؤں گا اور چپکے سے اُس کی پھنکارتی ہوئی دو شاخہ زبان پر اپنا گال رکھ دوں گا۔

سورج بھی تماشائی

ایکس رے روم کے برآمدے میں بیٹھا، میں مس ہتھنی داس کا انتظار کر رہا ہوں۔

مس ہتھنی داس شہر کے اس بڑے ہسپتال میں نرس ہے۔ بے چاری بڑی رحم دل ہے۔ بڑی ملنسار ہے۔ بڑی بدصورت ہے۔ کہنے کو ہتھنی ہے مگر دیکھنے کو ننھنی کی طرح دبلی پتلی ہے۔ دل کی گوری ہے مگر رنگ کالا ہے، اتنا کالا کہ جب پہلے روز ملاقات ہوئی تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس کی آواز بھی کالی ہے، باریک اور کالی --- جب بولتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سوئی کے ناکے میں سے کالا دھاگا گزر رہا ہے میں اسے پناہ گیر محبوبہ کہا کرتا ہوں۔ اس لئے کہ جس روز میری اس سے مٹھ بھیڑ ہوئی میں مہاجرین کی آباد کاری کے مسئلے پر غور کرتا ہوا ہسپتال میں سے گزر رہا تھا۔ میری عادت ہے کہ نیلا گنبد سے گوالمنڈی کی طرف جاتے ہوئے عام طور پر ہسپتال میں سے گزرتا ہوں۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ راستہ نسبتاً پر سکون ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ ادھر نرسوں کا ہوسٹل ہے۔ چونکہ میری یہ دیرینہ خواہش ہے کہ کسی نرس سے عشق کروں اس لئے اس ہوسٹل کے پاس پہنچ کر بڑی احتیاط سے کام لیا کرتا ہوں۔ گردن اکڑ جاتی ہے، سینہ باہر نکل آتا ہے، بالوں کی ایک لٹ خدا جانے کیسے ماتھے پر آکر لٹکنے لگتی ہے۔ کبھی سیٹی بجاتا ہوں کبھی دلیپ کمار کی طرح گردن کی رگیں پھلا کر سامنے سے آتی ہوئی نرس کو دیکھتا ہوں۔ کبھی رفیع کی آواز میں گنگناتا ہوں اور کبھی لتا کی آواز میں گاتا ہوں، مگر کہیں سے داد نہیں ملتی۔ کوئی نرس میرے پاس آکر مجھ سے سینما کی دعوت وصول نہیں کرتی۔ خوبصورت نرسوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بھولی بھٹکی ہسپتال میں آ بھی جائے تو اُسے کوئی نہ کوئی بدصورت مرد لے اڑتا ہے۔ لیکن اپنے قریب سے تو بدصورت نرس بھی مدھوبالا کی طرح عجیب شان بے نیازی سے گزر جاتی --- خدا کی شان ہے۔ مگر ایک دن ہماری بھی سنی گئی اور حسن کے جنگل سے مس ہتھنی داس کو ہماری طرف ہانک دیا گیا۔ ٹی بی وارڈ کے قریب میں نے اس وحشی جانور کو پہلی بار دیکھا۔ شام کا وقت تھا۔ مجھے سوائے سفید لباس کے اور کچھ دکھائی نہ دیا لیکن جب وہ مسکرائی تو اُس کے دانت نظر آئے۔ معلوم ہوا نرس ہے مگر کالی ہے۔ دل نے کہا پھر کیا ہوا؟ سرمہ بھی کالا ہوتا ہے مگر آنکھوں میں لگایا جاتا ہے۔ میں فوراً ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آ رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کالا علم سفید کپڑے پہنے چلا آ رہا ہو۔ میرا سر فرطِ تقدس سے خود بخود جھک گیا۔

دوسری ملاقات مردہ خانے کے باہر ہوئی۔ اس نے گردن کو سو سو بل دے کر اپنا نام بتایا۔

"مس کینتھل ہتھنی داس۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کے گلے کو نام باہر نکالتے ہوئے تکلیف ہوئی ہے۔ تیسری ملاقات پر اس نے تحفہ کے طور پر مجھے ٹنکچر کی ایک بوتل دی اور میں نے اسے کیکر کے پھول پیش کئے۔ اس نے خوش ہو کر کہا:

"اتنے پیارے پھول تم کہاں سے لائے ہو ڈیئر چراغ دین؟"

میں نے دونوں ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "ڈیئر ہتھنی داس! تیرا چراغ دین یہ پھول جڑانوالہ سے لایا ہے۔"

مس ہتھنی داس کا سر خوشی سے جھومنے لگا اور میں اسے بھاٹی گیٹ سینما دکھانے لے گیا۔

آج بھی سینما کا پروگرام ہے۔

مگر وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اس ٹھنڈے برآمدے میں لکڑی کے بنچ پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں۔ اب ایکس رے روم کے باہر مریض عورتوں اور مردوں کا ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ ہر مریض کے پاس چھوٹی سی ایک پرچی ہے جسے ہاتھ میں لئے وہ بے جان امید کے ساتھ انتظار کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ پہلے اس بنچ پر میں اکیلا بیٹھا تھا مگر اب یہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ پہلے اس برآمدے کی فضا میں کاربالک صابن کی بو تھی اور اب اس میں گندے جسموں اور گندے چیتھڑوں کی بدبو شامل ہو گئی ہے۔ برآمدے کے باہر سیڑھیوں پر گملے رکھے ہیں جن میں گھاس اگ رہی ہے۔ ان گملوں پر لوگوں نے پان چبا کر تھوکا ہے ناک صاف کی ہے اور سگرٹوں کی خالی ڈبیاں پھینک رکھی ہیں۔ میرے قریب ہی ایک بوڑھی عورت ایک نوجوان لڑکی کو زمین پر لٹائے بیٹھی ہے۔ نوجوان لڑکی کی عمر چودہ پندرہ کے لگ بھگ ہے مگر اس کا رنگ مٹی کی طرح ہے۔ خاکی اور بے نور آنکھیں اندر کو دھنس رہی

ہیں اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکل آئی ہیں۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں اور پو کھلی مردہ آنکھوں سے برآمدے کی چھت کو تک رہی ہے۔ ایکس رے کی پرچی بڑھیا کے میں ہے اور اس کے ہاتھ کی ساری رگیں ابھری ہوئی ہیں۔ میں نے جھک کر اس عورت پوچھا۔

"مائی جی! اسے کیا تکلیف ہے؟"

"جی چک 92 الف سے آئے ہیں۔"

شاید عورت اونچا سنتی ہے۔ میں نے پھر پوچھا

"مائی جی! اس بچی کو کیا بیماری ہے؟"

"جی ہمارا کوئی نہیں رہا۔"

مجھے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ عورت کچھ سننا نہیں بلکہ سنانا چ تھی۔ میں خاموش ہو گیا لیکن وہ عورت بولتی گئی۔

"جی کل سے یہاں پڑے ہیں۔ ڈاکٹر جی نے کہا "سکریں" کراؤ۔ "سکر SCREEN والے نے کہا "عسکرے" کراؤ۔ کل سے یہاں پڑے ہیں۔ یہ عسکرے کی ہے۔ یہاں ہمارا کوئی واقف نہیں بیٹا۔ رات پالے میں یہاں کاٹنی چاہی۔ چوکیدار باغ میں جاؤ۔ باغ میں گئے تو مالی نے کہا سرائے میں جاؤ۔ ایک رات سرائے میں گز دوسری اس باغ میں بسر کی پیسے ختم ہو گئے تھے۔ ہمارا گاؤں بڑی دور ہے۔ عسکرے ہوں گے بیٹا؟"

میں نے کہا "فکر نہ کرو مائی ابھی ہو جائیں گے"

"کب ہو جائیں گے بیٹا! کل سے پڑے ہیں۔ خدا کی ذات کے سوا ہمارا کون ہے

مدقوق لڑکی اس طرح ویران پھٹی پھٹی نگاہوں سے برآمدے کی چھت کو گھور تھی۔ ایکس رے روم کا دروازہ کھلا اور ایک کمپوڈر لمبا سفید کوٹ پہنے باہر نکلا۔ سب کی نگا اس طرف اٹھ گئیں۔ ہم کب بلائے جائیں گے؟ ہماری باری کب آئے گی؟ ہمیں اس مصیبت سے نجات ملے گی؟ ہم کب اپنے گاؤں جائیں گے؟ چک 92 الف! چک الف، جہاں ٹھنڈے پانی والی ندیوں پر گنجان ٹاہلیوں کے سائے ہیں۔ جہاں سورج اندھیرے طلوع ہوتا ہے اور جہاں سنہری دھوپ میں تازہ رس بھرے کماد کو بیلا جاتا ہے

جہاں کچی دیواریں ہماری مفلسی کی نگہبانی کرتی ہیں۔

ایک ٹھگنا سا گنجا آدمی لپک کر کمپوڈر کی طرف بڑھا۔

"اصغر صاحب ایک منٹ۔"

کمپوڈر مسٹر اصغر وہیں رک گئے۔ گنجے آدمی نے جیب سے ایک رقعہ نکال کر انہیں دکھایا انھوں نے پیشانی پر بل ڈال کر رقعہ پڑھا۔ رقعہ ختم ہوا۔ پیشانی کے بل بھی غائب ہو گئے اور اس کے بعد وہ گنجے آدمی کو ساتھ لے کر ایکس رے روم میں غائب ہو گئے۔

لیکن میری پناہ گیر محبوبہ آج کہاں غائب ہو گئی ہے؟

اگرچہ وہ کالا علم نہیں جانتی مگر کالا علم اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ جب چاہے غائب ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے دنوں اس نے مجھے بڑا تنگ کیا تھا۔ شام کے وقت میں ذرا اندھیرے میں کھڑے ہو کر انتظار کر رہا تھا کہ وہ سیاہ لباس پہن کر آئی اور میرے قریب سے گزر گئی اور مجھے بالکل پتہ نہ چلا۔ اس نے دو تین بار ایسا کیا آخر خود ہی ہنس پڑی اور مجھے اندھیرے میں دانت نظر آ گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ تجربہ کار دندان ساز کی طرح میں نے بھی فوراً اسے دانتوں سے دبوچ لیا۔

لیکن اگر اسے دیر کرنا تھی تو مجھے اتنی جلدی کیوں بلایا؟ بہر حال! مس کینتھل ہتھنی ضلع کینتھل! تیرا انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

مگر اب تو اس برآمدے میں دم گھٹنے لگا ہے۔ اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے ہیں؟ کیا اس ہسپتال میں ہر مریض کا ایکس رے کیا جاتا ہے؟ ایکس رے روم کا دروازہ بند ہے۔ خوشامد پسند کمپوڈر اور سفارشی مریض کو اندر نگل کر اس نے اپنا منہ بند کر لیا ہے۔

برآمدے کا فرش مریضوں سے بھر گیا ہے۔ کبھی کبھی کوئی نرس یا ڈاکٹر ادھر سے گزرتا ہے تو اسے بڑی دقت پیش آتی ہے۔ ان مریضوں میں زیادہ تر دیہاتی لوگ ہیں جن کے میلے کچیلے کپڑوں پر پیوند لگے ہیں۔ جن کے سرخ اور زرد کھدر کے چھاپ دار گندے لحافوں کی روئی جگہ جگہ سے باہر جھانک رہی ہے اور جن کے رنگ زرد اور چہرے افلاس زدہ ہیں جیسے وہ کسی ایسے علاقے سے آئے ہیں جہاں کال پڑ گیا ہے۔ ایک دیہاتی عورت پوٹلی میں سے گڑ اور خشک روٹی نکال کر کھانے لگی ہے۔ کھاتے وقت اس کا پورا جبڑا ہل رہا ہے۔ پاس ہی ایک بچے نے فرش پر پیشاب کر دیا ہے اور اب زور زور سے چلا رہا ہے۔ اس کا بوڑھا باپ

پرانے کھیس سے زمین پُونچھ رہا ہے۔

یہاں کچھ شہری مریض بھی ہیں۔ ایک بوڑھا پگڑی اٹھا کر گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا ہے:

"جب مائی نے دم دیا تو میں شاکو کے کالے میں تھا۔"

"مائی کون چاچا؟"

"بھئی مائی وکٹوریہ ملکہ ------ فوراً لاہور پہنچا۔ 12 میل کا تو سفر تھا۔

"چاچا شاکو بارہ میل نہیں سولہ میل ہے"

بارہ میل ہے بھئی میرا بیٹا وہاں کام کرتا ہے سولہ میل کیسے ہوا؟"

"مگر چاچا-----"

دو آدمی برآمدے کی سیڑھی پر کھڑے ہیں ایک آدمی نے زرد بڑا لفافہ بغل میں دبا رکھا ہے اور ایکس رے کی فلم کو روشنی میں کئے اپنے ساتھی کو کچھ دکھلا رہا ہے۔ اس کے ساتھی کا قد چھوٹا ہے۔ وہ ایڑیاں اٹھائے فلم میں سے نظر آنے والے سفید ہڈیوں کے پنجر کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے۔

"مگر خلیفہ! چوتھی پسلی کہاں ہے؟"

ایکس رے والے کمرے کا دروازہ پھر کھلا ہے اور وہ گنجا سفارشی ندامت کے ساتھ نکل کر ایک طرف گھوم گیا ہے جیسے کسی طوائف کے مکان سے نکلا ہو۔ لوگوں نے ایک دم ہلہ بول دیا ہے چوکیدار نے فوراً اپنا ڈنڈا ہوا میں لہرا دیا ہے۔

"گڑبڑ نہ کرو۔ جس کو آواز پڑے وہی اندر جائے۔"

میرے پاس بیٹھی ہوئی چک 92 الف کی بڑھیا گردن اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کی نگاہوں میں رحم کی التجا ہے۔ امید کا ماتم ہے۔ مگر دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ پھر کھلے گا اور پھر بند ہو جائے گا اور اس بڑھیا کو ایک اور رات اس برآمدے میں اس باغ میں یا کسی دوکان کے تختے پر گزارنی پڑے گی۔ نوجوان بیٹی اس کی گود میں ہو گی۔ پھٹا ہوا گندہ لحاف اس کے اوپر ہو گا اور شہر سنسان ہو گا اور کتے بھونک رہے ہوں گے۔

وہ لڑکی بدستور ٹکٹکی باندھے برآمدے کی چھت کو گھور رہی ہے۔ جانے کہاں سے اس کی پژمردہ پلکوں پر دو ننھے سے آنسو آ کر ٹک گئے ہیں۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ مٹیالا اور

خوفناک معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے وہ کسی شدید روحانی کرب میں مبتلا ہے۔ اس کی پتھرائی ہوئی بے نور سی آنکھیں چھت پر ہیں اور وہ ایک آنگن میں دیکھ رہی ہے۔ جس میں نیم کا ایک پیڑ کھڑا ہے پیڑ کے ساتھ ایک بکری بندھی ہے۔ ایک کمسن بچی کیسری دوپٹے کو بار بار سنبھالتی بھاگ کر اندر کوٹھڑی میں چلی جاتی ہے۔ اندر گاؤں کی لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی ہیں۔ آج اس بچی کے بھائی کا بیاہ ہے۔ اس کی ماں آنگن میں ایک طرف دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی۔ اس کا چہرہ سرخ ہے اور کپڑے بھی سرخ ہیں۔ لڑکیاں گا رہی ہیں:

ویرا گھر دھریکاں پھلیاں
ایہناں دھریکاں دی ٹھنڈی چھاں
ویرا تو گھر آوے

اور پھر دھریک کے ان ہی درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے ایک روز اس کے بھائی کی کٹی پھٹی لاش ملتی ہے۔ نہر کے پانی پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ دوسری بار جھگڑا ہو گا تو کسی کھیت میں قاتل کی لاش پڑی ہو گی۔

میرے بھائی! دھریک کی ٹہنیوں پر پھول آ گئے
ان کی چھاؤں ٹھنڈی ہو گئی
اب اپنے گھر آ جا

لیکن اس کا بھائی خاموش ہے اس کے نیلے ہونٹوں پر خون جما ہے اور گردن پر کلہاڑی کے شگاف میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ اب میں نہیں آؤں گا بہن! اب تو سارے رشتے ناطے ختم ہو گئے۔ سب کچے دھاگے ٹوٹ گئے۔ پہلے جوگی والا پھیرا تھا۔ اب یہ بھی نہیں رہا۔ جب ان درختوں پر چھوٹے چھوٹے پھول آئیں تو تم ان کی چھاؤں میں آ کر کھڑی ہو جایا کرنا۔ شاید کسی اداس شام کو میں ایک پھول بن کر تمہارے قدموں میں آن گروں---! بہن رو رہی ہے۔ ماں رو رہی ہے۔ باپ رو رہا ہے۔ کہاں جا رہے ہو؟ پھر کب آؤ گے ہمیں بھی ساتھ لیتے چلو! کوئی جواب نہیں، کوئی آواز نہیں، خاموشی، گہری خاموشی، اور اسی خاموشی میں ایک روز اس کا باپ بھی چل بسا اور پھر زمین بک گئی اور پھر کسی نے کہا بچی کو شہر والے بڑے ہسپتال میں لے جاؤ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ روز بروز سوکھ کر کانٹا ہوئی جا رہی تھی۔ ماں

اسے شہر لے آئی اور وہ بڑے ہسپتال کے برآمدے میں لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ آنگن والے نیم کے پیڑ کو تک رہی تھی۔ دھریک کی ٹہنیوں پر کھِلے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہی تھی اور آنسوؤں کے قطرے اس کی ویران پلکوں پر آ کر حیرت زدہ بچوں کی طرح ٹھٹھک سے گئے تھے۔

نرس کینٹسل ابھی تک نہیں آئی تھی لیکن ایک پہیے والا سٹریچر میرے پاس ہی آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس سٹریچر پر ایک موٹا آدمی لیٹا ہے۔ جس کا پیٹ گیند کی مانند ابھرا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے۔ پاؤں کے ناخن نیلے ہیں اور مونچھیں گھنی ہیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد درد کی شدت سے گھبرا کر ہائے ہائے کر رہا ہے۔ کسی وقت جب درد زیادہ ہو جاتا ہے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر برآمدے کی چھت کی طرف منہ کر کے کہتا ہے:

"مولاجی! بس کرو، مولاجی بس کرو۔"

اس کے قریب ہی ایک سپاہی کھڑا ڈائری میں پینسل سے لکھ رہا ہے۔ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اسے بولے بھی جا رہا ہے۔

"حوالدار صوبہ خان ولد منشاء خان نمبر 2635 قوم راجپوت ساکن حال بھکڑ، تحصیل نارووال، ڈاک خانہ خاص۔ بہ شکایت پتھری مثانہ بغرض ایکس رے۔۔۔۔۔۔۔"

ڈائری کی خانہ پُری کرنے کے بعد سپاہی نے کاپی پینسل جیب میں رکھی پیٹی ذرا کس کر باندھی، ٹوپی کو ذرا ترچھا کیا اور چوکیدار کے سگریٹ سے اپنا بجھا ہوا سگریٹ سلگا کر عقبی گلی والے دراوزے سے ایکس رے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور چوکیدار نے آواز لگائی:

"حوالدار صوبہ خان ولد منشاء خان۔۔۔۔۔"

فوراً سٹریچر برآمدے میں سے گزر کر لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا ایکس رے روم میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد دروازہ پھر بند ہو گیا اور لوگ دیکھتے رہ گئے۔

"خدا جانے ہماری باری کب آئے گی"

چک 92 الف کی بڑھیا ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

تمہاری باری اس وقت آئے گی جب اس پھٹی نگاہوں سے برآمدے کی چھت کو گھورنے والی نوجوان لڑکی کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہوں گی۔ جب تم اسے بلاؤ گی

تو وہ جواب نہ دے سکے گی۔ پھر ایکس رے والے کمرے کا دروازہ کھلے گا اور چوکیدار تمہارا نام لے کر آواز لگائے گا۔ یہاں جیتے جی تمہاری باری کبھی نہیں آئے گی۔ ماں! اپنی مدقوق بیٹی اور پھٹا ہوا لحاف سنبھال کر یہاں سے چلی جا! یہ لوگ تیرے خالص تازہ مکھن میں مونگ پھلی کا نقلی تیل ملا دیں گے۔ یہاں تیرا علاج نہ ہو گا۔ یہاں تیرا کوئی واقف حال نہیں۔ بہتر ہے کہ تم کسی ڈاکٹر کے پاس چلی چلو، ڈاکٹر تمہاری بچی کو اچھی طرح دیکھ سکے گا۔ تم ڈاکٹر خدا بخش کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ وہ بڑا پرانا ڈاکٹر ہے۔ اس نے ابھی ابھی ایک لاکھ روپے کی کوٹھی بنوائی ہے۔ وہ تم سے صرف پینتیس روپے فیس کے لے گا اور نسخہ لکھ دے گا۔ تم نسخہ لے کر انار کلی اور مال روڑ کی دوکانوں پر دھکے کھاتی پھرنا۔ تمہیں وہ ٹیکے کہیں نہ کہیں سے ضرور مل جائیں گے جن میں دوائی کم اور پانی زیادہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے تم ڈاکٹر خدا بخش کی کوٹھی چلی چلو۔ پہلے اس کی کوٹھی دیکھ کر حیران نہ ہونا اور اپنے چک 92 الف کی اندھیری کوٹھڑی کو یاد کرنا اور پھر اس کی بارہ گز لمبی کار کو دیکھنا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے ساٹھ روپے کے نسخے کو دیکھنا اور پھر جب دواؤں کی تلاش میں نکلو تو خدا کی شان دیکھنا۔ یہاں اس بند دروازے کا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ آؤ میرے ساتھ ڈاکٹر خدا بخش کی کوٹھی چلتے ہیں۔

مگر ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ ذرا میری کینٹسل ہتھنی داس کو آ لینے دو۔

آج اس نے بڑا غضب کر دیا ہے۔ مل گئی تو کھرل میں ڈال کر اس کا سرمہ ہی بنا ڈالوں گا۔ کالے علم کی بہن کہیں اندھیرے میں غائب نہ ہو گئی ہو۔ بہر حال میں بھی اس برآمدے میں شام کروں گا۔ آج اپنی پناہ گیر محبوبہ کا بھی ایکس رے کر کے ہی دم لوں گا۔

وہ لڑکی جس کا سیاہ برقع کندھے پر سے پھٹا ہوا ہے اور جو اپنی ماں کے پاس دیر سے برآمدے کے کونے میں کھڑی ہے اب تھک گئی ہے۔ جب وہ آئی تھی تو داہنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ آدھ گھنٹہ بعد اس نے پاؤں بدل لیا۔ اب اس کی دونوں ٹانگیں تھک گئی ہیں۔ مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں اور اگر ہے تو وہ جگہ ایسی نہیں جہاں شیخ علی اکبر کلرک پی ڈبلیو ڈی کی آٹھویں پاس بیٹی بیٹھ سکے۔ اس کی ماں زمین پر بیٹھ چکی ہے۔ مگر بیٹی کونے میں کھڑی ہے۔ اس کا سارا جسم نقاب میں چھپا ہے۔ صرف دو ہاتھ باہر ہیں۔ دو زرد اور بے جان سے دبلے پتلے ہاتھ۔۔۔۔ یہ دو بیمار ہاتھ اس کی زندگی کی پوری داستان بیان کر رہے ہیں۔ ان

ہاتھوں نے مٹی کے کھلونوں سے جی بہلایا۔ انھوں نے پہلے سیپارے کی ورق گردانی کی انھوں نے وضو کے مقدس پانی کا پہلا چلو اٹھایا اور بچوں کی طرح سینے کے ساتھ لگ کر خدا کی عظمت کا اعتراف کیا۔ انھوں نے آٹے کی پوری پرات گوندھی اور بھائی کے بیاہ کی خوشی میں سگن کی مہندی رچائی اور تھالی تھام کر خوشی سے کانپتے ہوئے دل کے ساتھ گھوڑے کو دا چرائی اور اب یہی ہاتھ زرد ہیں، بے جان ہیں اور پھیپھڑوں کے ایکس رے کی پرچی تھامے اندر کو سمٹے ہوئے ہیں ----- ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ لڑکی کو پہاڑ پر لے جانا چاہیے۔ وہاں کی آب و ہوا اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالے گی اور شیخ علی اکبر کلرک پی ڈبلیو ڈی نے پہاڑوں کا حال جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ جب اسے پتہ چلا کہ پہاڑوں پر صرف آب و ہوا ہی نہیں ہوتی بلکہ ہوٹل بھی ہوتا ہے۔ جہاں کمرے کا ایک روز کا کرایہ دس روپے ہوتا ہے تو اس نے عینک بند کر کے ڈبیا میں بند کر لی اور اخبار تہہ کر کے حقہ گڑگڑانے لگا۔

یہاں بھی ضرور کوئی حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ برآمدے میں یہ دھواں حقے کا ہی ہو سکتا ہے اب تو یہاں لوگوں کا اتنا ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ آخر یہ مریض ا ایک جگہ پر، اسی ایک نقطے پر کیوں جمع ہو گئے ہیں۔؟ یہاں سے تھوڑے سے ہی فاصلے پر ا ہسپتال کے اندر ایک جگہ ایکس رے کی بڑی مشینیں نصب ہیں۔ یہ لوگ وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں ڈاکٹر کا کمپوڈر مریض کو لوہے کی اونچی سی تھڑی پر کھڑا کر دیتا ہے ایکسرے والی مشین کا منہ سینے کی طرف پھیرتا ہے۔ چمڑے کے پٹے کی مدد سے ایک مو سٹارٹ کرتا ہے اور دوسرے ہی سیکنڈ موٹر بند کر کے آپ کو نیچے اتار دیتا ہے۔ بس یہا کام ہو گیا۔ نہ انتظار کی بک بک اور نہ چوکیدار کی خوشامد ----- صرف بیس روپے یعنی د دس کے دو نوٹ کمپوڈر کو دے دیں اور ایکسرے کی فلم آدھ گھنٹے بعد وصول کر لیں --- یہ لوگ اسی چمڑے کے پٹے والے ڈاکٹر کے ہاں کیوں نہیں جاتے،؟ کیا ان کے پاس د دس کے دو نوٹ بھی نہیں ہیں؟ اگر ایسی ہی بات تھی تو بیمار کس برتے پر ہوئے تھے۔؟

میرے ساتھ ہی بنچ پر ایک ادھیڑ عمر کا کمزور سا آدمی دیر سے چپ چاپ بیٹھا ہے کسی وقت وہ بڑے خوفناک انداز میں کھانسنے لگتا ہے۔ اس کی سفید داڑھی خشخشی ہے اور سوکھے ہوئے چہرے کی کھال خشک ہو کر اڑنے لگی ہے۔ آنکھوں کے بال جھڑ چکے ہیں اور ان سے پانی بہہ رہا ہے۔ میل سے بھرے ہوئے بوریا نما کمبل میں وہ سمٹ سمٹا کر بیٹھا ہے ا

ہر آنے جانے والے کو بے معنی اور غیر دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے کمبل میں ہلدی کی بو آ رہی ہے۔ نہ تو وہ ایکسرے روم کے دروازہ کھلنے پر بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور نہ اس کے بند ہو جانے پر افسردہ دکھائی دیتا ہے۔ دلدل میں پھنسے ہوئے بوڑھے ہاتھی کی طرح اسے اپنی یقینی موت کا علم ہو چکا ہے اور اب بڑی نرمی، بڑی آہستگی کے ساتھ وہ اس کی کھلی ہوئی آغوش میں نیچے ہی نیچے اترتا چلا جا رہا ہے۔

میں نے پوچھا:

"آپ بھی ایکس رے کروانے آئے ہیں؟"

میرے سوال کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف اپنی غیر دلچسپ نگاہوں سے دیکھا اور سرخ آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے کسی دور دراز کی گہری سوچ میں گم ہو گیا ہو۔ پھر آہستہ سے آنکھیں کھول دیں اور خشک آواز میں بولا:

"اکبری منڈی میں کام کرتا ہوں۔ چکی پر کام کرتا ہوں۔ صبح سے شام تک ہلدی اور سرخ مرچیں پیستا ہوں۔ کبھی کبھی رات کو بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ رات کو سو روپیہ الگ ملتا ہے۔ کھانسی بہت رہنے لگی تھی۔ حکیم موج دین کی گولیوں نے بھی آرام نہیں دیا۔ زیادہ کھانسی کی وجہ سے کام بھی نہیں ہوتا۔ مالکوں کا نقصان ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ہے اپنا "عکسرے" کراؤ، اب عکسرے ہو جائے تو کام کرنے والا بنوں۔ روٹی کا آسرا یہی چکی ہے ----"

اس کے بعد وہ پھر بوریا نما کمبل کے اندر منہ چھپا کر کھانسنے لگا اور اس کا سارا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز اس کا سینہ پھاڑ کر باہر نکلنا چاہتی ہے اور وہ اسے پوری طاقت سے اندر دھکیل رہا ہے۔ یہی جدوجہد اس کی زندگی تھی۔ اس کش مکش میں اس کی امیدیں، آرزوئیں اور خواب پوشیدہ تھے۔ جس روز اپنے سینے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑے گا اور پھر کبھی نہیں اٹھے گا۔

ایک آواز ---- زندگی سے بھرپور آواز!۔

ہسپتال کی ڈیوڑھی میں کوئی فلک شگاف قہقہہ ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح اپنے پیچھے گونج کا مسرت انگیز نورانی ارتعاش چھوڑ کر فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ اب ہر چہرہ ایک دوسرے کو یوں ایک قسم کی خفیف سی شرمندگی کے ساتھ دیکھ رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو میں تو

نہیں ہنسا تھا۔ بھلا میں کیسے ہنس سکتا ہوں۔

کمرے کا دروازہ پھر کھلا ہے۔

حوالدار صوبہ خان ولد منشا خان کا سٹریچر باہر نکالا جا رہا ہے اس کا پیٹ اسی طرح گیند کی مانند پھولا ہوا ہے اور دونوں ہاتھ چھاتی پر ہیں اور وہ سر کو دائیں بائیں مارتے ہوئے بڑبڑا رہا ہے۔

"مولا بس کر----- مولا بس کر"

ہسپتال کے سفید پوش ملازم اس کا سٹریچر برآمدے میں سے گزار کر پرلی طرف لے گئے ہیں۔ دروازے پر پھر مریضوں کا جمگھٹا ہو گیا ہے اور چوکیدار نے اپنا ڈنڈا فضا میں لہرایا ہے۔

"پیچھے ہٹ جاؤ بھائی پیچھے ہٹ جاؤ۔ غضب خدا کا مسلمان ہو کر تم لوگ پیچھے نہیں ہٹتے۔ قطار بناؤ جس کا نام بولا جائے گا وہی اندر جائے گا۔"

اس کے بعد اس نے اکٹھے دو نام بولے اور ساتھ ہی دو نسبتاً خوش پوش آدمی ایکسرے روم کی طرف بڑھے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا گیا۔

برآمدے کے ایک طرف کوڑا کرکٹ پھینکنے والا سبز ڈرم پڑا ہے۔

ایک بوڑھا دیہاتی اس ڈرم سے ٹیک لگائے سستا رہا ہے۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں پاؤں سے لے کر گھٹنوں تک سوجی ہوئی ہیں۔ اس نے ہسپتال کی ڈیوڑھی سے یہاں تک کا راستہ دونوں ہتھیلیوں کے سہارے فرش پر رینگ کر طے کیا ہے۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں چوڑی ہیں اور باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ سر پر میل سے بھری پگڑی ہے اور پیٹ کے ساتھ بھورا فوجی کمبل کس کر بندھا ہوا ہے۔ پاس ہی بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر کی دیہاتی عورت نے اسے روٹی اور گڑ دیا ہے جسے وہ بڑی مشکل سے چبا چبا کر نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبڑے کے ساتھ اس کی گردن کی ایک ایک رگ ہلتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی ہے۔ گھنے سفید ابروؤں کے نیچے ڈوبی ہوئی دھندلی حیرت زدہ آنکھیں یوں کھلی ہیں۔ گویا کسی کی راہ تکتے تکتے پتھرا گئی ہوں اور اب سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھ رہی ہوں۔

دیہاتی عورت اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کچھ پوچھ رہی ہے جس کے جواب میں بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے پہلے اپنی پگڑی اور پھر پنڈلیوں کے ورم کی طرف اشارہ کیا۔

شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ڈاکٹر کی پرچی پگڑی میں باندھ رکھی ہے اور پنڈلیوں کا ایکسرے کروانا ہے۔ عورت نے جھک کر کچھ اور پوچھا ہے۔

"کیا؟" بوڑھے کو کچھ سنائی نہیں دیا

"ہاں اپنا گھر؟ اپنا گھر پیچھے تھا ضلع فتح گڑھ---- فتح گڑھ چوڑیاں-----"

بوڑھے کی آواز اس کی کھال کی طرح ادھڑی ہوئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی اندھیری کوٹھڑی سے نکل رہی ہو۔ کبھی اس آواز میں جادو تھا۔ کبھی یہ شانوں کی جھکی ہوئی ہڈیاں لوہے کی لٹھ کی طرح مضبوط تھیں۔ کبھی یہ پچکے ہوئے زرد گال سرخ تھے۔ تانبے کی طرح دمکتے تھے۔ کبھی وہ سب کچھ تھا جو اب نہیں ہے۔ کبھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میٹھے پانی کا رہٹ تھا اور اب اپاہج ٹانگیں اور ہسپتال کا برآمدہ ہے اور کوڑا کرکٹ پھینکنے والا ڈرم ہے۔ کبھی محبت کرنے والی بیوی تھی، بچے تھے، بہنیں تھیں اور اب کیا ہے؟ باجرے کی خشک روٹی اکڑی ہوئی ضعیف رگیں اور سوجی ہوئی ٹانگیں ---- جس ماں نے ٹانگوں کو جاڑوں میں اپنے ساتھ لگا کر گرم کیا تھا وہ آج کہاں ہے؟

بوڑھا اپاہج اس عورت سے کہہ رہا ہے:

"ہاں --- اپنے گھر --- پیچھے زمینیں تھیں --- سنا ہے پاکستان بھی زمین دے گا۔ ہوں۔--- درخواش دی ہے --- دو کلے مل جائیں --- زمین مل جائے"

زمین ضرور ملے گی۔ میرے پیارے بوڑھے! مگر دو کلے نہیں بلکہ دو گرہ --- اور وہاں چاہے ہل جوتنا اور چاہے آرام کرنا۔ اتنی زمین بھی غنیمت ہے۔ بابا! دلی کے بادشاہ کو اتنی بھی نہ ملی تھی۔ فکر نہ کرو تمہیں ضرور مل جائے گی۔ پھر تمہیں اس لاچار زندگی سے نجات مل جائے گی جو تجھے دربدر گھسیٹے پھر رہی ہے۔ پھر وقت کے تمام پردے اٹھ جائیں گے۔ نہ ماضی ہو گا نہ حال ہو گا اور نہ مستقبل!

پھر تم خواب میں بھی اس گاؤں کو نہ دیکھ سکو گے جو ضلع فتح گڑھ چوڑیاں میں نہر کنارے آباد ہے اور جس کی پرانی حویلیوں، کھلے کھیتوں اور بڑ کے گنجان درختوں تلے اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیل کود کر تم نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ جہاں پیپل کے درختوں کے نیچے تمہاری سفید سفید بھیڑ بکریاں چرا کرتی تھیں۔ جہاں تو کسی کی یاد میں راتوں کو اٹھ کر الغوزے بجایا کرتا تھا۔ جہاں ایک نورانی صبح کو تو مشعلوں کی روشنی اور ڈھول تاشوں کے شور میں ایک

شرمیلی دلھن بیاہ کر لایا تھا اور جہاں ایک بھولی بھالی لڑکی نے تیرے گھوڑے کی لگام تھامی تھی اور ایک بوڑھی عورت نے تجھے گھوڑے سے نیچے اتارتے ہوئے اپنے کلیجے سے لگا لیا تھا۔ پھر وہ کچی دیواروں والی خاک اڑاتی چپ چاپ گلیاں کہاں ملیں گی جہاں تیرے بچے تیری ٹانگوں سے لپٹ جایا کرتے تھے؟

میرے پاس پیارے بابا! شائد کسی رات --- میں دل پر ہاتھ رکھے چپکے سے کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاؤں اور تیری دردانگیز تصویر کو کاغذ پر اتارنے کی کوشش کروں۔ اس وقت تو نہ جانے کہاں ہوگا! شاید تو کسی سنیما ہال یا مسجد کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا ہر گزرنے والے کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بھیک مانگ رہا ہوگا اور یا شاید تجھے تیرے حصے کی زمین مل گئی ہو گی اور تو آنکھیں بند کئے سو رہا ہوگا۔ گہری اور ابدی نیند!

اور میں سوچوں گا کیا تیرا چلچلاتی دھوپ میں بنجر زمین پر نقش و نگار بنانا اکارت چلا گیا؟ کیا وہ جھریاں اور بڑھاپا جو تو نے اپنے بچوں کو دیا تھا انھیں بھی سوائے جھریوں اور بڑھاپے کے اور کچھ نہ دے گا؟ کیا تیری جھولی میں کبھی پھل نہ گرے گا؟ تیرے مشرق میں کبھی سورج طلوع نہ ہوگا؟ دھرتی کے لال! تیری حالت تو اس رسی باٹنے والے کی طرح ہے جو بٹتی ہوئی تازہ رسی کو تو آگے بڑھاتا ہے لیکن خود پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے---! اس رات میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ میں تیرے ذاتی مسائل سے بے خبر ہوں۔ دھان کی بوائی کب ہوتی ہے اور باجرے کو پانی کم ملتا ہے اور کماد کی فصل کب پکتی ہے میں نہیں جانتا۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں نے تمھیں بے کسی اور لاچاری کے عالم میں دیوار کی طرف منہ کئے سوکھی روٹی کے ٹکڑے چباتے اور ہسپتال کے برآمدے میں اپاہج ٹانگیں پھیلائے کتوں کی طرح رینگتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایکس رے روم کا دروازہ ابھی تک بند ہے۔

اور پریشان مریض منہ لٹکائے برآمدے میں بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ نرس کینتھل بھی ابھی تک نہیں آئی۔ میرا دل یہاں گھبرانے لگا ہے۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا ہوں۔ سورج ہسپتال کی سڑک والے درختوں کے پیچھے چھپنے لگا ہے۔ اس کی کرنیں جو ذرا ذرا سنہری ہو گئی ہیں ترچھی ہو کر عمارت کی دوسری منزل کے روشندانوں کو جگمگا رہی ہیں۔ ایک سنگ دل تماشائی کی طرح یہ سنہری آنکھ ہر صبح طلوع ہوتی ہے اور ہر شام آنسوؤں کا

ایک قطرہ بہائے بغیر غروب ہو جاتی ہے۔

اگر آج نرس کینتھل مل جاتی تو میں اس سے بہت سی باتیں کرتا۔ میں اسے کہتا میری پیاری محبوبہ آج تیری محبت کی جانماز پر میں نے ایک مدقوق انسان کو صبح سے شام تک چکی پر ہلدی پیستے، بے جان زرد ہاتھوں والی لڑکی کو خون اگلتے اور مقدس بڑھاپے کو ناانصافی کی سولی پر لٹکتے ہوئے دیکھا ہے اور میں نے ڈر کر نماز توڑ دی۔ اب اس محراب میں میرا سجدہ، خوش حالی، عزت اور صحت مندی کا سجدہ ہوگا۔ جہاں پی ڈبلیو ڈی کا کلرک اپنی پیاری بیٹی کا علاج نہ کروا سکتا ہو، جہاں چک 92 الف کی ایک ماں اپنی بچی کو گود میں اٹھائے موت کا انتظار کر رہی ہو اور جہاں کنواریوں کی زرد ہتھیلیوں میں مہندی کی بجائے ایکس رے کی پرچیاں ہوں اور جہاں دھرتی کے بیٹوں کے ساتھ دو کلے زمین کی بجائے دو گز زمین کا سودا طے ہو رہا ہو وہاں میں تمھاری بغل میں بازو ڈال کر تمھارا منہ نہیں چوم سکتا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میرے گھر کے اندر میرے ماں باپ کی لاشیں پڑی ہیں۔

میں تمھارے سامنے کسی نئے مذہب کا پرچار نہیں کر رہا۔ میں تمھیں عجائب گھر کے پرانے مجسمے اور رنگین تصویریں نہیں دکھا رہا بلکہ اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا رہا ہوں۔ اپنے باپ کی پھٹی ہوئی آنکھیں، اپنی ماں کا ویران چہرہ اور اپنی بہن کا ننگا سر دکھا رہا ہوں۔

لیکن آج نرس کینتھل سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

اب رات گہری ہو گئی ہے۔ چاند شہر کے سیاہ آسمان پر خاموش ہے۔ جانے وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ وہ زرد ہاتھوں والی، وہ بوڑھا دیہاتی اور وہ عورت جس کی بیٹی برآمدے کی چھت کو ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھی اور جس کی پلکوں پر آنسوؤں کے موتی تھے۔ شاید وہ بغیر ٹکٹ ہی ریل میں سوار ہو گئی ہو اور ٹکٹ چیکر نے ان دونوں کو کسی گمنام سٹیشن پر اُتار دیا ہو اور وہ اپنی بچی کو گود میں لئے سرد پلیٹ فارم پر ٹھٹھر رہی ہو اور رو رہی ہو۔ مجھے اس سنسان رات میں دبی دبی سسکیوں اور رونے کی آواز آ رہی ہے۔ کاش یہ رونے کی آواز ہوتی۔

آواز کا رونا نہ ہوتا۔

ویران گلیوں میں بارش

شہر کے اندر کی ایک تنگ اور بوسیدہ گلی ----

دونوں جانب پرانے مکانوں کے جھکے ہوئے بھاری بھرکم چھجے قدیم مغلئی طرز کے ہیں ان کا رنگ بارش اور دھوپ کی مار سے اڑ گیا ہے۔ زیادہ تر مکان نانک شاہی اینٹوں کے بنے ہوئے ہیں اور محراب دار کھڑکیوں پر پھول پتی کا کام بھی کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ان کھڑکیوں کے بغل میں اونچے لمبے جالی دار جھروکے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ گلی کا بینگا ٹیڑھا فرش نشیبی ہے اور اس کے بیچوں بیچ نالی کا پانی بڑی تیزی سے بازار کی طرف بہہ رہا ہے۔ اس گلی میں کشمیریوں اور غیر کشمیریوں کے ملے جلے گھرانے آباد ہیں۔ سالہا سال سے ایک ہی محلے کی رہت سہت نے ان کے میل برتاؤ میں ایک ہی گھرانے والی یگانگت اور بھائی چارہ پیدا کر دیا ہے۔ اس کے باوجود کانگڑیاں، سماوار اور شب دیگ آپ کو کشمیری گھروں میں ہی ملے گی۔ اسی گلی کے ایک اونچے لمبے بھرے سے مکان میں آج بہت چہل پہل نظر آ رہی ہے۔ رات کا پہلا پہر گزر گیا ہے اور ادھر اُدھر مکانوں میں لوگ سو بھی گئے ہیں لیکن اس مکان میں چھوٹے بچوں کے سوا سبھی جاگ رہے ہیں۔ جالی دار محرابی جھروکوں میں سے بجلی کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی ہے۔ اندر بوجھل دیواروں اور جھکی ہوئی چھت والے کمروں میں پرانی طرز کی گلاس نما بتیاں روشن ہیں۔ یہاں وہاں حنائی ہتھیلیوں اور گوٹ لگے سرخ کپڑوں والی، ہلکی پھلکی لڑکیاں دلہن کے انتظار میں ایک دوسری سے ہنسی مذاق کر رہی ہیں۔ کوئی نئی سہیلیوں میں کھل کر بات کرتے ہوئے گھبرا رہی ہے اور کوئی بڑی خود اعتمادی سے گردن اٹھائے پلکیں جھپکائے جھپکائے دلہن کا ناک نقشہ بیان کر رہی ہے۔ کوئی اس امید پر بار بار کان کھڑے کر دیتی ہے کہ شاید کہیں سے برات کے باجے کی آواز سنائی دے جائے۔ کسی نے سویٹ کریپ کی قمیص پر عنابی جھالر لٹکا رکھی ہے تو کسی نے شیفون کے دوپٹے پر سرخ کرن کی گوٹ سجائی ہوئی ہے۔ جن کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا وہ بھاری کامدار جوڑوں اور زیوروں سے لدی ہوئی ہیں۔ ایک لڑکی نے رات بڑے چاؤ سے ہاتھوں پر مہندی رچائی تھی مگر سوتے میں ایک ہاتھ گال سے چھو گیا۔ چنانچہ منہ پر بائیں جانب مہندی کا حنائی

دھبہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ موٹے بدن کی ایک ٹھگنی سی لڑکی کونے میں لکڑی کے صندوق پر بیٹھی سبز چائے میں روغنی نان ڈبو کر کھا رہی ہے۔ ایک ہنس مکھ لڑکی کہیں سے ڈھولک اٹھا لائی ہے اور اب اپنی سہیلیوں کے بیچ میں بیٹھی گردن ہلا ہلا کر گا رہی ہے:

بازارو کیندی اے نکڑی
میں تاں سُک سُک ہوئی لکڑی
تیریاں غماں وچ جیویں ڈھولا
دفعہ کر نوکری
کٹالے ناںواں

کتنی بھولی ہے یہ شربتی آنکھوں والی لڑکی! اتنا بھی نہیں جانتی کہ اگر اس کا ڈھولا نوکری سے نام کٹوا کر واپس آ گیا تو وہ سوکھ کر زیادہ لکڑی ہو جائے گی۔ پھر بازار میں نہ لکڑی بکے گی اور نہ گھر میں ڈھول کی آواز سنائی دے گی۔ نکڑی ٹوٹ جائے گی اور ڈھول پھٹ جائے گا۔ لیکن بے وقوف لڑکی اسی لَے میں گائے جا رہی ہے۔ اچھا---- اگر ایسی بات ہے تو پھر گائے جا بے علم گائے! تو اپنے گھر میں نہیں، بیاہ والے گھر میں ہے اور بیاہ والے گھر میں تو ایسے گیت رات گئے تک گونجا کرتے ہیں۔ جب اپنے گھر میں آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ ابھی----

-----دفعہ کر نوکری
کٹالے ناںواں

دوسرے کمرے میں ادھیڑ عمر کی کچھ عورتیں بچوں کو ساتھ لئے سو رہی تھیں۔ ایک عورت کا بچہ خواب میں بلبلا اٹھا ہے اور وہ اسے کوٹنے لگی ہے۔

"تینوں نیندر نئیں آوندی اُلو دیا پترا۔"

دالان میں نلکے پر دلہا کی چچی لکس صابن سے منہ دھو رہی ہے۔ کچھ لڑکیاں مکان کی چھت پر گھوم پھر رہی ہیں اور سٹیشن کی دور سے دکھائی دینے والی روشنیوں کا نظارہ کر رہی ہیں۔ دو سہیلیاں پلنگڑی پر بیٹھی چائے کے پیالے ہاتھوں میں لئے باتیں کر رہی ہیں۔

"صغرا کو میں نے شنیل کا جوڑا دیا تھا"

"اور میں نے سونے کی انگوٹھی دی تھی مگر برا ہوا اس کے خاوند کا سارا گہنا لتا سنبھال کر

بیچاری کو گھر سے نکال باہر کیا۔"

"ہاں بے چاری بد قسمت نکلی ----- سنا ہے آج کل "کراچی" میں ہے۔"

"وہیں اپنے بھائی کے پاس ہے جاہ میں نمک اونچا ہے"۔

"خیر سے وزیر خالہ جو چولہے کے پاس بیٹھی ہے۔"

مکان کی بڑی ڈیوڑھی میں نائی دیگیں، مچولے اور مسالے کی پڑیاں اور پیاز لہسن لیے بیٹھا ہے اور ولیمے کی دعوت کا بندوبست کر رہا ہے۔ بیاہ والے گھر سے لے کر بازار تک گلی کو کیلے اور آم کے پتوں سے خوب سجایا گیا ہے۔ گلی کے موڑ پر کیلے کے دو بڑے بڑے درختوں کو اوپر سے ملا کر محرابی دروازہ بنا دیا گیا ہے۔ درمیان میں سرخ اور نیلے بلب روشن ہیں۔ ایک لڑکا کیلے کا تنا ذرا سا کاٹ کر اس میں سے جھلی دار سفید ریشم نکال رہا ہے۔ ابھی رات بہت باقی ہے۔ ابھی دن چڑھنے اور گلی والی مسجد میں اذان ہونے میں کافی دیر ہے۔ ڈیوڑھی میں چارپائی پر دو بچے سو رہے ہیں۔ ایک گھنگھریالے بالوں اور پتلی ناک والا لڑکا کرسی پر ٹانگیں پسارے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے مگر وہ سونا نہیں چاہتا بلکہ دانتوں میں دیاسلائی سے خلال کرتے ہوئے اوپر کھڑکی کیطرف دیکھ رہا ہے جہاں ایک لڑکی جامنی رنگ کے سوٹ میں ملبوس چق کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ کمرے میں روشنی ہونے کی وجہ سے اس لڑکی کے چھریرے جسم کا خاکہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ چنا ہوا دوپٹہ ڈھلک کر اس کے بازوؤں پر آن گرا ہے۔ ایک دل آویز دبلی سی مانگ لکیر کی صورت میں سر کے بالوں کے درمیان سے گزر گئی ہے اور وہ کچھ اس انداز سے کھڑی ہے کہ اس کی گردن میں ایک لطیف سا خم پیدا ہو گیا ہے جیسے کسی کی بات پورے دھیان سے سن رہی ہو۔ وہ اس کمرے میں اکیلی ہے۔ صرف ایک کمسن بچہ دیوار والے پلنگ پر سو رہا ہے۔ کمرے میں کہیں باسمتی کی بوریاں لگی ہیں اور کہیں صندوقوں پر لحافوں، گدیلوں اور پشمینے کی کترنوں سے بنی ہوئی گرم دریوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ یہ لڑکی دیر سے یہاں کھڑی ہے اور ایک انگلی سے چق کو اپنی طرف کھینچے باہر جھانک رہی تھی۔ اس کی نسواری رنگ کی آنکھوں تلے گہرے حلقے پڑے ہیں، جنھیں پاؤڈر میں چھپانے کی پوری کوشش کی گئی ہے ----- رخساروں کی ہڈیوں کے ابھر آنے سے چہرہ جو کبھی خوبانی ایسا گول ہو گا اب لمبوترا ہو گیا ہے۔ فاصلے پر چہرہ بے داغ اور دل کش دکھائی دیتا ہے مگر قریب سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ سفید

رنگ بھوسلہ ہو رہا ہے اور رخساروں پر چھائیوں کے نشان ہیں۔ باریک ہونٹوں پر لپ سٹک ہے مگر ان کا کھردرا پن یہاں بھی نہیں چھپ سکا۔ بائیں جانب رخسار پر ایک کالا تل ہے جو کبھی گرم اندھیری راتوں میں موتیئے کا پھول بن کر مہکتا ہو گا لیکن اب کسی ویران غار کے تاریک دہانے کی طرح بے نور ہے، خاموش ہے کبھی سرما کی ٹھٹھرتی بارش والی راتوں کو گرم کمرے میں ان سنی کہانیاں سناتا ہو گا اور آج راستہ بھولے ہوئے حبشی بچے کی طرح زرد رخسار کے چاندنی چوک میں حیران کھڑا ہے اور گزرنے والے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہا ہے ---- ہلکی کاسنی رنگ کی چوڑیوں کے نیچے کلائی کی نیلی رگیں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ کھڑکی پر جسم کے جھکاؤ میں ایک ایسی بے نیازی ہے اور کاہل سی لاپروائی ہے جو شادی شدہ لڑکیوں میں خود بخود آجاتی ہے -----

اس لڑکی کا نام عطیہ بانو ہے۔ میٹرک کے سرٹیفکیٹ پر اس کا نام عطیہ بانو بٹ لکھا ہے مگر گھر والے اسے عطی کے نام سے پکارتے ہیں۔ عطی کی شادی کو تین سال ہو گئے ہیں اور اس دوران اس نے اپنے خاوند کو دو بچے دیئے ہیں۔ ایک لڑکی اور دوسرا لڑکا۔ لڑکی گھر پر اپنی نانی کو سونے نہیں دے رہی ہے اور لڑکا عطی کے عقب میں پلنگ پر سو رہا ہے۔

ڈیوڑھی میں مزدور نے گرم مسالہ کوٹنا شروع کر دیا ہے اور کرسی پر نیم دراز گھنگھریالے بالوں والے لڑکے نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا ہے۔ وہ اس بات پر فخر محسوس کرنے لگا ہے۔ لیکن یہ لڑکی جس کا نام عطیہ بانو ہے اور جس کے رخسار پر ایک تل ہے اس لڑکے کی موجودگی سے بے نیاز ہے ----- بڑی گہری اور محویت کے عالم میں ڈیوڑھی کے دروازے پر کیلے کے ان درختوں کو تک رہی ہے جن میں نیلی پیلی روشنیاں جگمگا رہی ہیں ---- شروع اکتوبر کی رات میں ---- ٹاہلیوں کی گھنی چھاؤں ایسی خوشگوار ٹھنڈک ہے، مگر نیچے صحن میں جلتی ہوئی لکڑیوں اور ابلتے پانی کی بھاپ کے باعث فضا میں گرمی پیدا ہو رہی ہے اور عطی کے اوپر والے ہونٹ پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے ہیں۔ اب موتیئے کی ٹھنڈی مہک میں گرم مسالوں کی تیز خوشبو مخلوط ہونے لگی ہے۔ کیلے کے پتوں کی تازگی اور شادابی پژمردہ ہو رہی ہے۔ ان کے چوڑے چوڑے ہاتھ مرجھا کر سرنگوں ہو گئے ہیں اور وہ گنجان شہر کی اس تنگ گلی میں سمندر کنارے کے ان جنگلوں کو یاد کر رہے ہیں جہاں برسات کی سیاہ کالی راتوں کو موسلادھار بارشیں ہوا کرتی ہیں۔ جہاں آم کے گھنیرے

جھنڈوں میں رات رات بھر دل جلی کوئلیں بولتی رہتی ہیں اور پچھلے پہر سمندر کی وحشی ہوائیں بھوری چٹانوں سے لپٹ کر شور مچایا کرتی ہیں۔ عطی کو یوں لگا جیسے وہ کیلے کے سبز پتوں پر موتیے کے دودھیا پھول رکھے ان پُراسرار گھنے جنگلوں میں سے گزر رہی ہے اور تیز ہوا میں اس کے سیاہ بال اڑ رہے ہیں اور سمندر کی سمت سے آنے والی شوریدہ سر غضب ناک ہواؤں میں تاڑ اور ناریل کے درخت دہرے ہوئے جا رہے ہیں اور کیچڑ بھرے گدلے تالابوں میں اُگے ہوئے نازک کنول، بانس پر چڑھی ہوئی بیلوں میں چھپ گئے ہیں۔۔۔۔ اری او لڑکی! تو کیلے کے پتوں پر موتیے کے پھول رکھے اس طوفان میں کہاں آنکلی ہے؟ کس سے ملنے جارہی ہے؟

عطی۔۔۔۔ عطی!

اور عطی نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ وہ اپنے گلی والے مکان میں نیچے نل کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی ہے۔۔۔۔۔۔

ٹونٹی کے منہ سے لمبی کترن بندھی ہے اور پانی ہلکی ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ بالٹی میں گر رہا ہے۔ وہ آستین کہنیوں تک چڑھائے چوکی پر بیٹھی صابن سے مل مل کر اکبر ماموں کی واسکٹ دھو رہی ہے۔ بالوں کی ایک لٹ پھسل کر اس کے منہ پر آن گری ہے اور جھولنے لگی ہے۔ چہرے کی گوری رنگت دمک کر سرخی مائل ہو رہی ہے اور اوپر والے ہونٹ پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے ہیں۔ وہ کپڑے بھی دھو رہی ہے اور دھیرے دھیرے گنگنا بھی رہی ہے۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلتا ہے اور پہلے دنبہ اور پھر اس کا پہلوان بھائی بنی اندر داخل ہوتا ہے۔ دنبے کے گلے میں موتیے کے ہار ہیں اور بنی نے نیلے تہمد کے اوپر جالی دار کروشیے کی بنیان پہن رکھی ہے اور ململ کا کرتہ کندھے پر ہے۔ عطی نے دنبے کو دیکھ کر کہا:

"آج تو پریم ناتھ دولھا بنا ہوا ہے بھائی"

بنی نے بڑے فخر سے دنبے کے سر پر ہاتھ پھیرا، اسے تخت پوش کے پائے سے باندھا، نیچے سے چنے کی دال والی کڑاہی کھینچ کر آگے رکھی اور بڑے پیار سے بولا:

"پیئے جا میرے پریم ناتھا"

ایک بار پھر دنبے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہی ہاتھ اپنے سر پر پھیرا۔ کرتہ کھونٹی پر

لٹکایا۔ دیوار کی طرف منہ کر کے دھوتی کھول کر جھاڑی، اسے کس کر باندھا اور تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آج صمدو کی باغیچی میں مزنگ والوں سے ٹکری ہو گئی۔ کہنے لگے بنی کا دنبہ مردار ہے کیا لڑے گا۔ میں بھی تاؤ میں آگیا، فوراً پریم ناتھ کی زنجیر کھول دی۔ پھر کیا تھا پہلے ہی ہاتھ میں مزنگ والوں کا دنبہ اکھاڑے سے باہر تھا۔ پورے سوا دو روپے کے ہار پہنائے ہیں۔"

پھر تو یہ بڑا بہادر ہو گیا ہے۔"

"اری پہلوان ہو گیا ہے، پورا پہلوان، اب اس میں اور بنی میں کوئی فرق نہیں۔"

اس کے بعد بنی نے اپنی بنیان اتار کر نیچے کپڑوں کے ڈھیر میں پھینک دی۔

"ذرا اسے بھی ہاتھ مار دینا۔۔۔۔ اور میں نے کہا عطو! آج پکا کیا ہے؟"

عطی نے ماتھے پر لگا ہوا صابن کا جھاگ کہنی سے پونچھتے ہوئے کہا:

"حلوہ کدو"

"کیا؟"

بنی غصہ میں اٹھا، قمیض کھونٹی پر سے اتار کر سر پر ڈالی اور تہمد اوپر چڑھاتے ہوئے اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

"ان گھر والوں کی ماں کو حلوہ کدو مارا، انھیں حلوہ کدو کے سوا کچھ ملتا ہی نہیں۔"

عطی بنی کی بنیان پر صابن ملتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر ہنسنے لگی۔ وہ اپنے بھائی کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حلوہ کدو کی مخالفت کے باوجود رات کو گاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آئے گا اور حلوہ کدو اور چاول کھا کر اور پانی کا ڈول پورا پی کر بستر پر گرتے ہی سو جائے گا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھے گا اور دنبے کو ساتھ لے کر اکھاڑے میں زور کرنے چل دے گا۔ وہاں سے واپس آکر نلکے کے پاس سردائی گھوٹنے بیٹھ جائے گا۔ سردائی کا پورا ڈول پی کر کونے والی چارپائی پر پڑ کر سو جائے گا۔ دوپہر کو اٹھ کر نہائے گا، روٹی کھائے گا اور پھر سو جائے گا۔ تیسرے پہر اٹھے گا۔ دنبے کو ساتھ لے گا اور اکھاڑے کی طرف چل دے گا۔ جہاں سے شام کو واپس آئے گا۔ بس یہی اس کا معمول تھا۔ کھانا، اکھاڑے میں زور کرنا اور سو جانا۔ مہینے میں ایک آدھ بار اسے دنگل میں کوئی چھوٹی موٹی

کشتی مل جاتی۔ اس کے معاوضے میں جو تھوڑے بہت پیسے ملتے وہ ان کے بادام اور گھی خرید کر اپنے مہینے بھر کا راشن لا کر گھر میں ڈال لیتا۔ نہ اسے سنیما کا شوق تھا نہ پان اور سگریٹ کا۔۔۔ اگر کوئی شوق تھا تو صرف یہی کہ وہ کسی طرح بہت بڑا پہلوان بن جائے۔ گھر میں اس نے یہاں وہاں عطی کی مخالفت کے باوجود پہلوانوں کی فریم کی ہوئی تصویریں لٹکا رکھی تھیں۔ محلے کے مولوی سے ہر ماہ ایک نیا تعویز لے کر بازو پر باندھتا اور کبھی کبھی منہ اندھیرے ہی اکبر ماموں کے پاس تخت پوش پر سر کے بل کھڑا ہو جاتا تھا۔

"یہ نسقہ (نسخہ) ایک جوگی بابا نے دیا ہے۔ کہنے لگے اس طرح تمہارا داغ موٹا ہو جائے گا۔ میں نے کہا باباجی دماغ کو گولی ماریں میری تو گردن موٹی کر دیں۔ بولے گردن بھی موٹی ہو جائے گی بچہ! میں نے کہا ست بچن مہاراج۔"

آخری شلوار دھو کر عطی اسے نچوڑ رہی تھی کہ گلی میں پھیری والے نے آواز لگائی:

"شیتل فالسے۔۔۔۔ ٹھنڈے فالسے۔"

عطی نے نچڑی ہوئی شلوار نل پر لٹکائی اور چھابڑی والے سے ایک آنے کے فالسے لئیے۔ کچھ منہ میں ڈالے اور باقی کاغذ میں پوٹلی بنا کر طاق میں نمک والے ڈبے کے اوپر رکھ دیئے اور کپڑے چھت پر ڈالنے اوپر چلی گئی۔ دوسری منزل پر اوپر تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے جو ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے تھے۔ دو کمروں میں عطی کی دونوں بھاوجیں اپنے بال بچوں اور خاوندوں کے ساتھ رہتی تھیں اور ایک میں اس کا پہلوان بھائی سوتا تھا۔ رسوئی کے ساتھ والی کوٹھڑی میں عطی اپنی امی کے ساتھ سوتی تھی۔ دالان گھٹا ہوا اور تنگ سا تھا۔ جس کے ایک جانب کمرے میں پرانا حمام پڑا تھا۔ حمام کی ٹونٹی کا منہ کپڑے سے بندھا ہوا تھا جس طرح دانت درد کرے تو آدمی باندھ لیتا ہے۔ پھر بھی ٹونٹی سے پانی قطرہ قطرہ ہو کر ٹپک رہا تھا۔ گلی کی جانب تین کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ جن پر خستہ سی میلی چقیں پڑی تھیں۔ پاس ہی عطی کی دبلی پتلی سوکھی سی بوڑھی ماں جست کا تسلہ سامنے رکھے حلوہ کدو چھیر رہی تھی۔ سامنے والے کمرے کے باہر چھوٹے بھائی کی بیوی ایک بچی کو گود میں لئے کھاٹ پر بیٹھی قرآن شریف کے سبز غلاف میں ٹانکے بھر رہی تھی اور اس کی دوسری بچی زمین پر لٹو سے کھیل رہی تھی۔ دوسرے بھائی کے کمرے پر تالا پڑا تھا۔ اس کی بیوی کچھ خرید و فروخت کرنے محلے کی ایک عورت کے ساتھ انار کلی گئی ہوئی تھی۔ پہلوان بھائی کی

کوٹھڑی کے باہر وردی کا پھٹا ہوا ٹکڑا بچھائے میلے سے تکیئے پر اکبر ماموں اکڑوں بیٹھا کسی گاہک کی پتلون رفو کر رہا تھا۔ جس دکان کے تھڑے پر بیٹھ کر وہ رفو گری کا کام کیا کرتا تھا وہ آج بند تھی چنانچہ گھر پر کام کر رہا تھا۔ وہ عینک ناک کی چونچ تک کھسکائے کام میں اس قدر محو تھا کہ اس کا سوکھا ہوا خشک چہرہ پچک کر لمبا ہو گیا تھا۔ کسی زمانے میں اکبر ماموں کا کلکتہ شہر میں پشمینے کی رنگائی دھلائی اور پھیری کا بڑا کام تھا۔ وہ ہزاروں میں کھیلا کرتا تھا۔ دو گھوڑا بوسکی کی قمیض، ٹاسے کی چوخانہ دھوتی اور پٹینٹ کے سیاہ پمپ شو پہنے، سونے کے بٹن لگائے جب وہ رات کو زکریا سٹریٹ کے کشمیری سوداگروں کی بیٹھکوں کے چکر لگانے کو نکلتا تو اس کی سج دھج پر ہر راہگیر کو رشک آیا کرتا۔ انگلیوں میں زمرد کی انگوٹھیاں ہوتیں اور ہاتھ میں کریون اے کا ڈبہ۔ کھانے پینے کا شوق اسے ورثے میں ملا تھا۔ مرغ گھر لا کر ذبح کرتا۔ گشتابے اور ہریسے کے لئے رات رات بھر گوشت کوٹتے رہنا اور قہوے کی خاطر جاپانی بادیان خطائی کی تلاش میں رہنا اور امرتسر سے خالص کھنڈ قلیے اور باقر خانیاں منگوانا اس کے معمولات میں شامل تھا۔ اس کی خوبرو بیوی کھانے کے معاملے میں اس سے بھی دو قدم آگے تھی۔ گوشت کے بغیر اسے بھی چاول ہضم نہ ہوتے تھے اور اگر رات کو میاں ذرا دیر کر دیتے تو اس کے حصہ کی بوٹیاں بھی خود ہی ہضم کر جاتی۔ شادی کو آٹھ سال ہو گذرے تھے مگر خدا نے اولاد کا منہ نہ دکھایا تھا۔ اکبر ماموں دوسرے تیسرے دن ٹیکسی میں جامع دار، طوس، دُھسے اور پشمینے کا دوسرا قیمتی مال لاد کر ایڈورڈز روڈ، دھرم تلہ اور محمد علی پارک کے امیر بنگالیوں اور غیر ملکی سفارتی نمائندوں کی کوٹھیوں کا ایک چکر لگاتے اور اپنی پختہ زبانی، تجربہ کاری اور خوداعتمادی کی بدولت پچاس کا مال سو میں اور سو کا مال دو سو میں بیچ کر بڑے مزے سے واپس آجاتے فردوں کی رنگائی اور دھلائی کے لئے انھوں نے کشمیری ہاتو اور امرتسری رنگریز ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ کھلی آمدنی، اعلیٰ خوراک اور بے فکری نے انھیں چالیس کے پیٹے میں بھی جوان رکھا ہوا تھا اور چہرہ تو انار کی طرح دمکا کرتا۔ دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے کہ جاپان اور امریکہ کی جنگ چھڑ گئی اور ایک روز کلکتہ کے شام بازار میں اچانک دھاڑم دھاڑ جاپانی بم آن گرے۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ ان لوگوں نے بم کبھی نہ دیکھے تھے۔ کاروبار ایک دم ٹھپ ہو گیا۔ مارکیٹیں بند ہو گئیں اور پشمینے کے تاجروں نے دھڑا دھڑ پنجاب کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ اکبر ماموں کلکتہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر

اس کی بیوی بہت گھبرا رہی تھی۔ اس نے سوچا بیوی کو گھر چھوڑ آنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ اسے ساتھ لے کر لاہور آ گیا۔ واپس جانے لگا تو بیوی کو اچانک دورہ پڑ گیا۔ ہسپتال میں آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب رہا مگر گھر آ کر دوسرے ہی روز وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اکبر ماموں تو حیران سا رہ گیا۔ یہ اچانک صدمہ اسے گھونسے کی طرح آ کر لگا۔ زندگی میں پہلی بار غم نے اپنا بھرپور وار کیا تھا۔ دو ہی دن میں وہ ادھ مرا سا ہو گیا۔ رات گئے تک بیوی کی قبر پر بیٹھ کر رویا کرتا۔ بوسکی اور ٹاسا قبرستان کی خاک میں مل گیا۔ آخر بہن نے دم دلاسا دیا اور سمجھا بجھا کر پھر کلکتہ روانہ کر دیا کہ کسی طرح اس کا جی دوسری طرف لگ جائے۔ لیکن اب کلکتہ میں کیا رکھا تھا؟ زکریا سٹریٹ کے سوداگروں کی بیٹھکوں پر تالے پڑے تھے۔ دھلائی کی دکانوں کے باہر خالی ناب دان الٹے پڑے تھے۔ واپس جانا بھی بیکار تھا۔ وہیں اپنی بیٹھک پر تھوڑا بہت کام شروع کر دیا۔ بمشکل ڈیڑھ دو سال گزرے ہوں گے کہ ہندو مسلم فسادات کے خونی شعلے بھڑک اٹھے۔ اب اکبر ماموں کو ہمشیہ کے لئے کلکتہ کو خیرباد کہہ کر لاہور آنا پڑا۔

لاہور جل رہا تھا بلکہ سارا پنجاب جل رہا تھا۔ اکبر ماموں کراچی چلا گیا اور وہیں پھیری کا کام شروع کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کلکتے اور کراچی میں بڑا فرق تھا۔ یہاں لوگ قیمتی دوہری پتی وار شالوں کو یوں الٹ پلٹ کر دیکھتے جیسے گدیلے کے لئے ابرہ خرید رہے ہوں۔ اکبر ماموں کی حالت بڑی پتلی ہو گئی۔ ساری جمع پونجی خرچ ہو گئی اور نوبت فاقوں تک پہنچی۔ اس نے ایسے تاریک دن زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ آخر پیٹ کی آگ بھی بجھانی تھی۔ اس کے صندوق میں شادی کا پرانے زمانے کا بیل بوٹوں والا نکاح نامہ پڑا تھا اسے نکال کر تہہ کر کے جیب میں رکھا اور ایک امریکی نوادر پسند افسر کی کوٹھی پر آ کر گھنٹی بجائی۔ نکاح نامہ پر چاروں طرف رنگ برنگ پھول پتوں کا حاشیہ تھا اور درمیان میں نسواری روشنائی سے ایجاب و قبول کی عبارت لکھی تھی۔ امریکی افسر سگار منہ میں دبائے اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"ویل! یہ کیا ہے ماسٹر صاحب؟"

اگرچہ بھوک نے اکبر ماموں کی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو دبا رکھا تھا۔ اس میں زیادہ بولنے کا یارا نہ تھا مگر اس لمحہ اس کی پرانی چرب زبانی اور خود اعتمادی عود کر آئی۔ اس نے دو منٹ کی گفتگو میں ہی یہ ثابت کر دیا کہ وہ نکاح نامہ اصل میں مغل بادشاہ اورنگ زیب اور

والئی مارواڑ سردار درگا داس راٹھور کے درمیان طے پانے والا عہد نامہ ہے جو 1681ء میں جودھ پور کے مقام پر گھمسان کی لڑائی کے بعد لکھا گیا تھا اور جس کی رو سے مرہٹوں نے چوتھ کا ٹیکس ادا کرنا منظور کر لیا تھا۔ امریکی افسر تو حیران رہ گیا کہ ایسا نادر شاہکار کتنی آسانی سے ہاتھ آ گیا۔ حالانکہ اس نے نکاح نامہ الٹا پکڑ رکھا تھا۔ فوراً ایک ہزار کا چیک کاٹ دیا اور اکبر ماموں اگلے ہی روز بوریا بستر اٹھائے لاہور آ گئے۔ لاہور آ کر اس نے میکلوڈ روڈ پر ایک دکان الاٹ کروائی مگر بارشوں میں اس کی چھت بیٹھ گئی۔ مرمت کروائی۔ بعد میں اس کا ایک اور دعوے دار پیدا ہو گیا۔ مقدمہ بازی شروع ہونے ہی والی تھی کہ امن پسند اکبر ماموں بک بک سے خود ہی باہر نکل آیا۔ چنانچہ بعد میں اس نے بیڈن روڈ پر ایک لانڈری کی دوکان کی سیڑھیوں کا ایک حصہ کرائے پر لے لیا اور وہیں بیٹھ کر پتلونیں اور کوٹ وغیرہ رفو کرنے لگا۔ دوکان کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے اسے دس سال بیت گئے تھے۔ پے در پے صدمات اور انقلابات نے اسے دیکھتے دیکھتے بوڑھا کر دیا تھا۔ اس کی حالت اس کمزور پھول کی سی تھی جو ساری بہار پتوں کی ڈھال میں چھپے چھپے بسر کر دے مگر خزاں کے پہلے گرم تھپیڑے میں ہی پتی پتی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اس کا سر سفید ہو گیا تھا۔ گردن کی رگیں ابھر آئی تھیں اور چہرہ سوکھ کر پچک سا گیا تھا۔ لانڈری کی سیڑھیوں پر سارا سارا دن گردن نیہوڑائے ناک کی چونچ پر عینک کھسکائے گاہک کی پتلون گھٹنے پر رکھے وہ بڑے انہماک سے تار کشی کیا کرتا اور رات کو نسبت روڈ پر کلکتہ کے اپنے ایک پرانے کشمیری ساتھی کی دکان میں چرخوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور گزرے ہوئے دنوں کی باتیں کرنے لگتا۔ سماوار میں چائے کی پتیاں چھوڑ کر آگ سلگا دی جاتی اور اکبر ماموں بگلے کے سگریٹ کا گل جھاڑ کر کہا کرتا۔

"تمہیں یاد ہے خواجہ کلکتے میں میرے پاس ایک بار دو ہزار کا طوس آیا تھا جسے میں نے ایک فوجی کرنل کے پاس چار ہزار میں بیچ دیا تھا۔ بس یہ انہی دنوں کی بات ہے........"

مگر یہ سب ان ہی دنوں کی باتیں تھیں اور ان دنوں کی بات یہ تھی کہ اکبر ماموں کے پاس ہر ماہ دوکان کی سیڑھیوں کا کرایہ دے کر جو تھوڑا بہت بچتا تھا اس میں سے تیس روپے ہر حالت میں اپنی روٹی کے لئے بہن کو دے دیتا اور باقی جو دس بیس بچتے ان میں سے ان کا پہلوان بھانجہ اپنے باداموں اور یخنی کے لئے تھوڑا بہت بٹور لیتا۔ اس سے جو کوئی مانگتا اسے دے دیتا اور خود چپکا ہو کر بیٹھ رہتا۔ گھر میں اس نے کسی سے کبھی زیادہ بات نہ کی تھی ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماضی کی سنسان خاموشی سے ہم کلام ہے جو اسے ہر لمحے بڑی دل آویز اور من موہنی تصویریں دکھایا کرتی ہے۔ گھر میں بھی اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ شادی شدہ بھانجوں نے اسے ایک بوجھ سمجھ رکھا تھا۔ جو تیس روپے دے کر سارا مہینہ ان کی روٹیاں توڑتا رہتا تھا۔ سوائے بھانجی عطی اور اس کی امی کے گھر کا ہر فرد اس سے ایک طرح کی پوشیدہ اور زیر لب چھپی ہوئی بدلحاظی سے مخاطب ہوا کرتا۔ گویا رشتے ناطے کی ایک کمزور سی تنی ہوئی رسی پر کھڑے اکبر ماموں سے ہمکلام ہوں جس پر سے حقارت کے کھڈ میں گر پڑنے کا ہر لمحہ احتمال ہو۔ گرمیوں میں اس کی کھاٹ کا قرعہ چھت پر پاخانے کے پاس نکلتا اور سردیوں میں اسے نچلی منزل میں نل کے پاس تخت پوش پر دیس نکالا مل جاتا۔ وہ اپنا میلا سا بستر تخت پوش پر بچھا دیتا، جہاں منہ اندھیرے اس کا پہلوان بھانجا تیل مالش کے بعد تخت پوش پر ہاتھ جما کر اسے جھکولے دیتا ہونک ہونک کر ڈنڈ لگانے لگتا۔

بی پہلوان نے اپنی کوٹھڑی میں رستم زماں گاماں، حمیدا، گکر سنگھ اور گونگا پہلوان کی تصویروں کے ساتھ ہی ایک اپنی تصویر لٹکا رکھی تھی۔ جس میں وہ خالی لنگوٹ باندھے فلم ایکٹرس نمی کے ساتھ ایک کوچ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ نمی کی گردن میں تھا۔ یہ تصویر مزنگ کے ایک فوٹوگرافر نے اسے دس روپوں میں دن رات کی عرق ریزی کے بعد تیار کر کے دی تھی۔ بی کی ایک تصویر گلی کے پنواڑی کی دوکان پر بھی لگی تھی جس میں وہ محلے کے ایک لونڈے کے ساتھ پردے کے ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا۔

گھر بھر کا خرچ دونوں بھائیوں کے ذمہ تھا۔ ان میں ایک سے تو لوکو شاپ میں فٹر تھا اور دوسرا کسی پریس میں بلاک میکری کا کام کرتا تھا۔ بڑا بھائی ایک مدت سے آبادان جانے کی فکر میں تھا مگر بعض وجوہات کی بناء پر نہ جا سکا تھا۔ دونوں بھائی ہر ماہ بیویوں سے لڑنے جھگڑنے کے بعد اپنی اپنی تنخواہوں میں سے ساٹھ ساٹھ روپے اپنی والدہ کو دیتے جن میں ان کے پورے کنبوں کو روٹی چائے اور دودھ ملتا اور بیویاں میلے کچیلے کپڑے بھی عطی سے دھلوا لیتیں۔

اس کے باوجود یہ عورتیں خرچ کے معاملے میں اپنی ساس کے خلاف اکثر دبی زبان میں بڑبڑایا کرتیں۔ بی پہلوان کا کام گھر کے تمام کمانے والوں سے اپنی پہلوانی کا ٹیکس وصول کرنا تھا۔ اس سے گھر کا ہر آدمی دبتا تھا۔ عزت کوئی بھی نہ کرتا تھا۔ بہن محبت کرتی

تھی اور ماں اس کے ڈھیٹ پنے سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ مگر بوڑھی بڑی کم گو، اذیت کش، عاجز اور نیکی کی مخفی اقدار کی حامل تھی۔

دوسری طرف عطی اس سفید پوش قرضے کے بوجھ تلے دبے ہوئے مگر ظاہری رکھ رکھاؤ پر جان دینے والے کنبے کی لگی دیوار کی کھونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس پر ہر آدمی اپنے اترے ہوئے کپڑے لٹکا دیتا۔ وہ اذان کے وقت اٹھ کر پورے گھر کی صفائی کرتی، مٹکوں میں پانی بھرتی، چولھے میں آگ جلا کر چائے کا پانی رکھتی، سبھوں کا ناشتہ تیار کرتی، چھوٹے بھتیجے بھتیجیوں کے لئے دودھ گرم کرتی، پہلوان بھائی کے سیر بھر بادام چھیلتی، برتنوں کو مانجھ کر بارہ دریوں اور نعمت خانے میں لگاتی، پھر میلے کپڑے دھونے بیٹھ جاتی۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کا دھندا شروع ہو جاتا، ایک بار پھر برتنوں کی منجھائی ہوتی۔ رات کو کھانا پکانے میں ماں کا ہاتھ بٹاتی، بستروں کو جھاڑ پونچھ کر بچھاتی، بھاوجوں کے بچوں کی غلاظتیں صاف کرتی، انہیں گود میں لے کر کھلاتی، انہیں لوریاں دے کر سلاتی، ماں کے پاؤں دابتی اور سب سے آخر میں اپنے بستر پر جا کر گر پڑتی اور بے سدھ ہو کر گہری نیند میں کھو جاتی۔

مصلیوں کی مرغی ساتھ والی چھت پر ٹوکرے کے اندر انڈا دینے کے بعد زور زور سے کڑکڑانے لگی۔ عطی منڈیر پر گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔ لالی مصلن جلدی سے اوپر آئی، ٹوکرا اٹھایا، انڈا ہاتھ میں لے کر مرغی بغل میں دبائی اور نیچے اتر گئی۔ اچانک عطی کے پاس دھپ سے مٹی کا ایک ڈھیلا آن گرا۔ اس نے چونک کر ایک طرف دیکھا۔ گلی پار تیسرے مکان کی چھت پر برساتی میں اسلم کھڑا اسے ہنستے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہا تھا۔ عطی نے کوئی خاص خیال نہ کیا۔ صرف اس کی طرف عام سے انداز میں مسکرائی اسلم عطی کا پھوپھی زاد بھائی تھا جو ابھی ابھی کالج میں داخل ہوا تھا۔ بڑا البیلا اور نٹ کھٹ تھا۔ عطی سے ہر گھڑی چہلیں کیا کرتا اور اپنی محبت جتایا کرتا۔ لیکن یہ محبت ایسی ہی تھی جیسے ہر کالج کے چھوکرے کو اپنی کسی نہ کسی خوش شکل رشتہ دار لڑکی سے ہو جایا کرتی ہے۔ یہ بڑی ضروری ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کے جواب میں لڑکی کا معمولی طریقے سے مسکرا دینا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ عطی نے اسلم کو کبھی اتنی اہمیت نہ دی تھی ایک تو اسے محبت کرنے کی فرصت نہ تھی۔ دوسرے بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہنے سے عطی، اسلم میں وہ جنسی تقابل

اور اجنبیت نہ پاتی تھی جس کی کوکھ سے محبت کے شعلے جنم لیتے ہیں۔ پھر بھی جب کبھی وہ سیڑھیوں وغیرہ میں پیچھے سے عطی کا دوپٹہ کھینچ لیتا یا شرارت سے اسے کبھی گدگدا دیتا تو مشرقی عورت ہونے کے باعث عطی کے جسم میں ایسا بار بار کئے جانے کی شدید خواہش اپنے سوکھے ہوئے کھردرے خشک ہونٹ وا کر دیتی۔ ایک دن وہ نیچے نل کے پاس بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ عطی نے ایک مانوس قسم کی پُر لذت بُوسی محسوس کی۔ اس نے جلدی سے سر جھٹک دیا۔ پیچھے اسلم کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میں پھوپھی سے کہہ کہ جوتے لگواؤں گی تمہیں...... مجھے ایسا مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

"چاہے سو بار کہہ دو، میں بھی کہہ دوں گا، کیا کروں امی مجھے عطی اچھی لگتی ہے"

عطی نے کچھ شرم اور کچھ غصہ سے لال ہو کر کف گیر اٹھایا ہی تھا کہ اسلم ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی بے فکروں ایسی سیٹی کی آواز دیر تک عطی کے پورے خالی اور ویران جسم میں گونجتی رہی۔ وہ برتن مانجھتے ہوئے خود بخود گنگنانے لگی اور سوچنے لگی کہ کہیں اسلم واقعی اس سے اسی طرح محبت تو نہیں کرتا جس طرح عام مرد عورتوں سے کیا کرتے ہیں------ دھڑاک سے دروازہ کھلا اور بی پہلوان دنبے کو ساتھ لئے اندر داخل ہوا۔ دنبے کو پکارتے ہوئے کونے میں باندھ کر وہ سر کو ہاتھ سے جھاڑتا ہوا کھسیانی سی ہنسی ہنستا عطی کے پاس آ کر کھرے کی بینڈھ پر پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور کدو ایسا سر عطی کے پہلو میں گھسیڑتے ہوئے بولا:

"میری مانو بلو! ذری ایک روپیہ تو صندوقچی سے نکال، مالش کا تیل ختم ہو گیا ہے----- اری کل لے لینا، بھلا کوئی بے اعتباری ہے۔ ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہے۔"

عطی بے اختیار ہنس پڑی یہ جانتے ہوئے کہ بی ادھار کبھی واپس نہیں کرتا وہ اٹھ کر اوپر گئی اور ان پیسوں میں سے جو اس نے دو دو آنے کر کے جمع کر رکھے تھے، ایک روپیہ گن کر لے آئی۔ بی پہلوان کو ہمیشہ پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ ضرورت وہ گھر میں ادھر اُدھر سے پوری کر لیتا تھا مگر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلوانی تو کسرت کرنا، ڈنڈ لگانا، خوب ڈٹ کر کھانا اور کھا کر سو جانا مانگتی ہے۔ چنانچہ وہ سیر ڈیڑھ سیر دودھ ایک ہی ڈیک میں پی کر چارپائی پر گر پڑتا اور بڑے بڑے خراٹے لینے لگتا۔ کسی روز بکروں کے دو تین

بھنے ہوئے سر جھولی میں ڈال کر لے آتا اور اندر آتے ہی نعرہ لگاتا:

"کاغانی بکروں کے سر ہیں ماں---- بڑی ہنڈیا چولہے پر چڑھا دو---- بس آج ذرا گھی کی طرف سے ہاتھ کھلا رکھنا۔"

گھر کے معاملات میں اسے بھی کوئی اہمیت حاصل نہ تھی اور اسے بھی کوئی پروا نہ تھی۔ گھر کا خرچ کیسے چل رہا ہے؟ اس کی بوڑھی ماں اور محنتی بہن کو بھاوجوں کی کیسی دل آزار باتیں سننا پڑتی ہیں۔؟ ان باتوں سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مکان میں سے اس نے اپنا حصہ الگ کروا رکھا تھا۔ اس کے حصہ میں نچلا دیوان خانہ ہی آیا تھا۔ چنانچہ جب گھر میں لڑائی جھگڑا ہو پڑتا تو بی پہلوان دنبے کی زنجیر گلے میں ڈال، ڈھیلی دھوتی بار بار کس کر باندھتا، چڑچڑے بلے کی طرح اندر باہر غراتا اور کہنے لگتا:

"تمہارا گھر والوں کا حلوہ کدو مارا---- میں سب کی گردنوں کے منکے توڑ دوں گا، میں اپنا دیوان خانہ کرائے پر چڑھا دوں گا، میں نیچے تنور لگوا دوں گا اور تم لوگوں کا ناک میں دم کر دوں گا۔"

کسی روز ایسا بھی ہوتا کہ وہ تکئے سے بھنگ کا پیالہ چڑھا کر آ جاتا۔ پھر وہ اتنی ساری روٹیاں اکیلے ہی ہڑپ کر جاتا کہ بے چاری عطی اور اس کی ماں کو بھوکوں رہنا پڑتا۔ اس کے بعد وہ نیچے جا کر اکبر ماموں کے پاس تخت پوش پر گاگر لے کر بیٹھ جاتا اور اسے بجاتے ہوئے تکئے کے چرسیوں کے سے ٹھیٹھ انداز میں الٹے سیدھے ٹپے گانے شروع کر دیتا۔ اس کا دنبہ پریم ناتھ کبھی کبھی اس کی طرف منہ کر کے داد دیتے ہوئے زور زور سے ممیا اٹھتا۔ اکبر ماموں بے چارہ کچھ دیر بیٹھا بگلے کا سگریٹ پئے جاتا، پھر اسے کونے میں پھینک لیٹ جاتا اور پہلوان کی چنگھاڑ میں سونے کی کوشش کرتا۔ جب نیند نہ آتی تو کسی وقت تنگ آ کر جھنجھلا اٹھتا:

"بی اب بس بھی کرو اس دُھرپد کو۔"

اور بی بھنگ کی ترنگ میں اکبر ماموں کے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اونچی آواز میں گانے لگتا:

"لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
میری لیلیٰ بسے میرے من میں
ما ما ما پکاروں میں-----"

گرمیوں کی گرد آلود گرم راتوں میں جب میوہ منڈی کی طرف سے میٹھے خربوزوں کی خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ سیف الملوک گانے کی درد انگیز سی آوازیں آنے لگتیں اور کیڑا کھائی جھرجھری بیری کے درخت پر پیلا پیلا مٹ میلا دل گیر چاند نکل آتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد تربوزوں سے لدا ہوا کوئی ٹرک گھرر گھرر کرتا ادھر اُدھر گھومنے لگتا تو عطی اپنے مکان کی چھت پر لیٹی لیٹی اسلم کے متعلق سوچنے لگتی۔ کیسا ہے یہ لڑکا؟ اسے کون سمجھائے کہ کسی کنواری لڑکی سے، جو نل کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی ہو، ہنسی ہنسی میں یہ کہہ دینا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر عطی کو اسلم کے بیوقوفوں ایسے چہرے پر پھیلی ہوئی بچوں ایسی مسکراہٹ یاد آجاتی اور وہ اپنے دل کی کھڑکی تلے جھانک کر دیکھتی کہ نیچے گلی میں اس کے عین نیچے فرش پر گلاب کا ایک سرخ پھول پڑا ہے۔ وہ سب کی نظریں بچا کر اس پھول کو اٹھا لانے کے بارے میں سوچنے لگتی اور سوچتے سوچتے اسے نیند آجاتی اور وہ سو جاتی۔ دن کی روشنی میں اس نے اسلم کے متعلق کبھی اتنی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ ادھر اسلم نے بھی کبھی محبت کا بھرپور والہانہ اظہار نہ کیا تھا بلکہ ہمیشہ ایک طرح کی خوش وقتی اور لاابالی پنے سے کام لیا تھا۔ جس طرح کوئی کالج کا لڑکا پک نک کے پروگرام میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ عطی کا ذہن گھریلو کام کاج کی زیادتی، روزمرہ کی بے روح یکساں محنت اور بھاوجوں کی دبی دبی استہزائیہ ہنسیوں، بے پروائی کے قہقہوں، ظاہرداری کی محبتوں، بھائیوں اور بھاوجوں کے رحم و کرم پر پڑ رہنے کی تکلیف دہ روحانی اذیت اور بوڑھی ماں کے بے بسی کے پریشان کن خیالات کے جال میں اس بری طرح الجھ گیا تھا کہ اسلم اور اس کی محبت کے متعلق سوچتے ہوئے کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ تیز رفتار ریل گاڑی میں بیٹھی کسی اجنبی سے بے معنی اور غیر اہم دیہاتی سٹیشن کو قریب سے گزرتے دیکھ رہی ہو۔ لیکن ایسی بے درد گھڑیاں آتیں جب اس کا میلی سی تنگ انگیا میں جکڑا ہوا بھرا بھرا بدن پکے ہوئے پھل کی طرح اپنی ٹہنی پر لگا لگا ہوا میں کانپتے ہوئے تیز تیز سانس لینے لگتا اور سارے بدن کے روئیں ایک وحشی اذیت کشی کی تمنا میں اپنی سلگتی ہوئی لاتعداد آنکھیں کھول کر چاروں طرف جنگل میں دیکھنے لگتے اور عطی کا جی چاہتا کہ کوئی پیچھے سے آکر اسے اس زور سے بھینچ لے کہ اس کے ہزار ڈرانے دھمکانے اور منت سماجت پر بھی اسے نہ چھوڑے۔ یہی وہ لمحے ہوتے جب اندر ہی اندر دل ہی دل میں وہ اپنا سب کچھ اس پہلے آدمی کو دے ڈالنے پر خود کو تیار پاتی جو ہاتھ

ایک خفیف اشارے سے اسے اپنی طرف بلاتا۔ پھر فوراً ہی اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آجاتا جس کی کمر عمر بھر اپنے مرحوم خاوند، بیٹوں، اور اب بہوؤں کی خدمت کرتے کرتے جھک گئی تھی اور جسے اس پر بھی دن میں دو ایک بار بہوؤں کی دبی دبی جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔ عطی کو ایک دم غصہ آجاتا، پہلے بیویوں کے پیچھے لگے ہوئے بھائیوں پر، پھر نکھٹو بی اور سب سے آخر میں اپنے آپ پر کہ وہ لڑکا کیوں نہ تھی۔ اگر وہ لڑکا ہوتی تو اس کی ماں کی یہ درگت نہ بن رہی ہوتی۔

ایک روز کیا ہوا کہ وہ پھوپھی کے گھر آپا عذرا سے کروشئے کا کوئی نمونہ لینے گئی۔ وہ ڈیوڑھی میں سے گزر کر اوپر چڑھ ہی رہی تھی کہ اوپر سے آتے ہوئے اسلم نے اسے وہیں دبوچ لیا اور چٹاخ پٹاخ بوسے لینے شروع کر دیئے۔ عطی پہلے تو بڑی جھنجھلائی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو اسلم کی آغوش میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح گرا دیا۔ اسلم نے اپنے ہونٹ عطی کے ہونٹوں میں پیوست کر رکھے تھے اور اپنا بدن اسے اپنے آپ ہی کو کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا--- اچانک گلی میں کسی کے قدموں کی آہٹ ڈیوڑھی کی طرف بڑھتی سنائی دی، عطی بجلی کی طرح اسلم کی گرفت سے نکلی اور الٹے ہاتھ سے اپنے ہاتھ پونچھتی برقع سنبھالتی جلدی سے اوپر بھاگ گئی۔ اس رات عطی کا سارا جسم درد کرتا رہا اور پنڈلیاں اکڑی ہوئی سی رہیں اور جب اس نے رات کے کسی لمحے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی درخت کی ایسی تازہ شاخ پر ہاتھ پھیر رہی ہو جس پر بے شمار ننھی کونپلوں نے اپنے سر نکال رکھے ہوں۔

گرمیاں نکل رہی تھیں کہ عطی کی دونوں بھاوجوں کے میکا سے پیٹ رنگ لائے اور دو لڑکیاں مزید ذمہ داریوں، اخراجات اور قرضوں کا بوجھ لادنے کے لئے پیدا ہو گئیں۔ گھر بھر میں سوگ ایسی فضاء طاری ہو گئی۔ دونوں بھائی اپنی اپنی زچہ کو کوٹھڑیوں میں چھوڑ کر ماں کے پاس رسوئی میں آکر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور رت جگے سے آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں اور بال کھچڑی سے ہو گئے تھے۔ بڑا بھائی پہلے ہی ایک ہزار کا مقروض تھا۔ یہ قرض اس نے گاہے گاہے گھر کے بڑھتے ہوئے خرچ کو پورا کرنے، آبادان کی بھرتی کی خاطر ایک ہیڈ مستری کو بے فائدہ رشوت دینے اور اپنی نمائش پسند بیوی کے نت نئے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک ایسے آدمی سے لیا تھا جو اس کی بیوی کا رشتہ دار تھا اور پی

ڈبلیوڈی کی ٹھیکے داری کرتا تھا۔ اس ٹھیکے دار کی پہلی دونوں بیویاں مر چکی تھیں۔ ان میں سے چار بچے تھے اور اب تیسری شادی کی فکر میں تھا شہر کے بااثر لوگوں میں اس کا بڑا رسوخ تھا اور اس نے ٹھیکے داری کی بدولت کافی دولت کما رکھی تھی۔ بچوں کو اپنی ماں کے ذمے سونپ کر وہ خود شہر کے صاف ستھرے علاقے میں ایک فلیٹ میں تنہا رہتا تھا اور ماں کو ہر ماہ تین سو روپے بطور خرچ دے دیتا۔ اس کے فلیٹ میں ہر اتوار کی رات کو چوری چھپے شراب کی محفل گرم رہتی تھی جس میں ٹھیکے دار اور اس کے دوست شراب کے نشے میں دھت ہو کر ایک دوسرے کو فحش گالیاں دیتے، رات بھر کے لئے منگوائی ہوئی عورت کو ننگا کر کے مجرا سنتے اور سالم بھنے ہوئے مرغ اڑاتے۔ بڑے بھائی کی بیوی کو اپنے رشتہ دار ٹھیکے دار کی ان خرمستیوں کا پورا علم تھا۔ بلکہ اس کے دل میں کبھی یہ آرزو پیدا ہوتی کہ وہ ایسی حیا سوز ننگی محفلوں کو چھپ چھپ کر دیکھتی رہے اور مزے لے۔ ان ہی عریاں اور بے شرم کار گزاریوں کی وجہ سے اس عورت کے لئے ٹھیکے دار کی شخصیت بڑی دل کش اور پر کشش ہو گئی تھی۔ بلکہ کچھ رشتہ دار بڑی بوڑھیوں کو تو یقین تھا کہ ان دونوں کے درمیان کچھ ایسے ویسے تعلقات بھی ہیں، مگر رشتہ داروں کا کیا ہے وہ تو یونہی باتیں اڑا دیا کرتے ہیں۔

مصلیوں کی گلی والے اس گھر پر ایک دم اخراجات کا مزید بوجھ آن پڑا اور محدود آمدنی میں گزارہ مشکل سے ہونے لگا۔ بڑے بھائی نے ایک بار پھر آبادان کے لئے ٹرائی دی۔ مگر رشوت نہ دے سکنے کے باعث ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ بیوی کے کہنے اور زور دینے پر اس نے ٹھیکے دار سے ایک بار پھر قرض مانگنے کا فیصلہ کر لیا اور اس غرض کے لئے اسے اپنے گھر دعوت دے ڈالی۔ دیکھتے دیکھتے دو عدد مرغ ذبح ہو گئے اور عطی اور اماں کو رسوئی میں جھونک کر ان کے گرد پکنے والی چیزوں کا انبار لگا دیا گیا۔ ببی پہلوان شام کو گھر آیا تو اس نے دروازے میں ہی تھوتھنی پھلا کر بو سونگھ لی

"ہو نہ ہو یہ مرغ پلاؤ کی مہک ہے۔"

رسوئی میں پہنچ کر جب اس نے انواع و اقسام کی نعمتوں کو مختلف چولھوں پر پکتے دیکھا تو خوشی اور حیرانی سے اپنا خشخشی سر جھاڑنے لگا۔

"اوئے تمھاری ماں کا حلوہ کدو مارا---- کہیں ڈاکہ تو نہیں ڈال دیا تم لوگوں نے؟"

کھانا ابھی پوری طرح تیار بھی نہ ہو پایا تھا کہ پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکے دار صاحب

آدھمکے۔ یہ ناٹے قد کا گول مٹول بھدا سا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ جس کی پھولی ہوئی مونچھوں نے ہونٹوں پر سایہ کر رکھا تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ چمڑے ایسی کھال پر چیچک کے پھیکے پھیلے ہوئے نشان تھے اور لال لال سُتی ہوئی آنکھوں تلے گہرے شرابیوں ایسے حلقے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں بھائیوں اور بھاوجوں نے جو بڑے شوخ کپڑوں میں ملبوس تھیں اور خوب سرخی پاوڈر تھوپ رکھا تھا بڑھ کر مہمان کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ سے وہ ٹوکری تھام لی جس میں پھل ٹھنسے ہوئے تھے۔ بڑی بھاوج نے بڑی احتیاط سے سینے پر سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے لہک کر کہا:

"بھلا اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی؟"

"بھئی یہ تو بچوں کے (کھانس کر) بچوں کے لئے لے آیا۔"

ٹھیکے دار کی آواز پھٹے ہوئے ڈھول ایسی بے روح اور سپاٹ تھی اور بات کرتے ہوئے مونچھوں تلے نچلا ہونٹ بیلچے کی طرح آگے کو لٹک آتا اور پیلے پیلے گندے دانتوں میں ایک چاندی کا دانت اپنی جھلک دکھا جاتا۔ پلنگ پر گاؤ تکئے کے سہارے بیٹھتے ہی اس نے اپنے سونے کے بٹنوں میں سے قمیض کا اوپر والا بٹن کھول دیا اور سونے کی زنجیر والی گھڑی اتار کر اپنے قریب ہی پہلو میں رکھ لی اور ریشمی واسکٹ کی جیب میں سے سرخ رومال نکال کر تماش بینوں کی طرح مونچھوں پر پھیرنے لگا۔ دونوں بھائی باورچی خانے کی طرف دوڑ گئے۔ چھوٹی بھاوج روتے بچے کو لے کر اپنی کوٹھڑی میں سلانے چل دی۔ بڑی بھاوج نے الماری میں سے کیپسٹن کی ڈبی نکال کر ٹھیکے دار کے سامنے رکھ دی۔

"یہ تم پیتی ہو کھُرشید؟"

کوٹھری میں ایک عیاش طبع شرابی کے ساتھ خود کو اکیلا پا کر بڑی بھاوج کا منہ گرم ہو گیا۔ دل دھڑکنے لگا، حلق سوکھ گیا اور ٹانگیں ایک پر لذت تھکن سے اینٹھنے لگیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"نہیں بھاجی ---- یہ تو چھیمی کا ابا----"

ٹھیکے دار نے بڑی بھاوج کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ وہ کانپنے لگی۔ اپنے تئیں پلنگ پر گرا دینے کی خواہش میں اس کا دل شاہ رگ میں منہ کے پاس آ کر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا خاوند ببی کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ ببی

پہلوان کو ٹھیکے دار سے ملوایا گیا تو وہ شرما کر اپنے سر پر الٹے سیدھے ہاتھ پھیرنے اور بغلیں جھانکنے لگا۔ ٹھیکے دار نے واسکٹ کی جیب سے چاندی کا سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا:

"کیوں بھئی یار! کوئی دنگل بھی لڑا ہے کہ نہیں؟"

بنی ایک دم اصلی حالت میں آگیا۔ اس کی گردن اور بازوؤں کے پٹھے لوہے کی لٹھ بن گئے۔

"پھجو کالئے کو ابھی پرسوں چت کیا ہے۔ بھاجی!-----اتوار کو صمدو کی باغیچی میں بجلی پہلوان سے کشتی ہے"۔

"خوب-----خوب۔"

اتنا کہہ کر ٹھیکے دار نے کوچوانوں کی طرح سگریٹ کا لمبا کش کھینچا اور گھوڑے کی طرح کھانسنے لگا۔ اس دوران میں بڑی بھاوج نے اپنے خاوند کو باہر بلوا کر عطی کی پھوپھو کی طرف دوڑایا کہ وہاں سے چینی کی بڑی پلیٹیں اور شیشے کا سرخ بحرین والا جگ لے آئے۔ چھوٹی بہو سالن کا نمک چکھتے ہوئے دبی زبان سے بولی:

"خدا کا شکر ہی رہا، میرا خیال تھا، پلاؤ کا معاملہ ہے کچھ گڑبڑ ضرور ہو گی۔"

ہمیشہ سے دکھ سہنے والی بوڑھی ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف عطی نے اتنا کہا:

"تو پھر بھابی یہاں آکر خود بیٹھ جانا تھا"

"بھلا تو جواب دینے سے کبھی باز رہ سکتی ہے۔"

چھوٹا بھائی فوراً بیچ میں بول اٹھا۔

"اب اس بک بک کو چھوڑو اور پلاؤ والا دیگچہ ادھر کرو، یہ وقت ناٹک دکھانے کا نہیں ہے۔"

بڑی بھاوج کے کمرے میں پلنگ کے پاس ہی فرش پر دری، دری پر سوزنی اور اوپر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا۔ عطی اور اس کی امی کے سوا سبھوں نے مل کر دعوت اڑائی، بنی پہلوان کی تو آج عید ہو گئی تھی۔ پورے تین ماہ ہوئے کہ ایک دوست کی شادی پر پلاؤ کھانے کو ملا تھا۔ وہ تو سر جھکا کر کھانے میں جٹ گیا اور دیکھتے دیکھتے پوری تھالی صفاچٹ کر کے دوسری بھر لی۔ بڑے بھائی نے گھور کر دیکھا مگر بنی جانتا تھا کہ اس وقت وہ اس کا بال

بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بے فکر ہو کر دوسری تھالی پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اس کے عین سامنے بیٹھے ہوئے ٹھیکے دار نے اپنی تھالی پلاؤ سے منہ در منہ بھر کر اس میں شوربہ ساگ، دہی اور چٹنی ---- سب کچھ ملا کر اسے گچل مچل کر دیا تھا۔ وہ پورا پنجہ اس گھانی میں گھسیڑ کر نوالہ اٹھاتا اور بھینسے ایسا منہ کھول، اسے اندر ڈال خچر کی طرح جبڑے چلانے لگتا۔ چاول کا دانہ یا گوشت کا ریزہ مونچھوں میں ضرور پھنس جاتا۔ جسے وہ میلی زبان باہر نکال کر تھوتھنی کے چاروں طرف گھما کر چاٹ لیتا۔ بنی ایک صحت مند وحشی کی طرح کھا رہا تھا۔ جسے پھر مدتوں کھانا ملنے کی امید نہیں تھی۔ اس کے سامنے ٹھیکے دار ایک بوالہوس ریچھ تھا جو محض اس لئے کھا رہا تھا کہ اس کے معدے کا جھولا بھر نہیں پاتا تھا۔ اس کی ساری انگلیاں کھاتے میں چکنائی سے لتھڑ گئیں۔ جنھیں وہ بعد میں ایک ایک کر کے بڑے مزے سے چاٹنے لگا۔ اس کے بعد اس نے چٹخارہ بھر کر بھری ہوئی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زبردست ڈکار لی اور شکر الحمد اللہ کہتا ہوا ابھرے ہوئے سانڈ کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ سبز چائے پلنگ پر بیٹھ کر پی گئی۔ پیٹ کا تنور بھرنے کے بعد ٹھیکے دار تکئے سے ٹیک لگائے آنکھیں نیم وا کئے بھرپور مرغن غذا کے خمار میں ہولے ہولے سگریٹ کے کش لے رہا تھا کہ عطی چائے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ عطی کا بھرا بھرا گورا بدن۔ پھول دار ریشمی قمیض میں ٹھنسا ہوا سا تھا اور وہ ٹرے اٹھائے ذرا آگے کو جھکی ہوئی تھی جس سے اس کا دوپٹہ آگے سے کھسک کر ٹرے پر آن گرا اور سفید سینہ تھوڑا تھوڑا ننگا ہو گیا۔ ٹھیکے دار کو اچانک جیسے کسی کھٹمل نے کاٹ لیا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا اور عطی کو دیکھتے ہوئے منہ لٹکا کر نتھنوں سے خرخر ایسی آوازیں نکالنے لگا۔ عطی نے ٹرے میز پر رکھی اور پلو درست کرتی جلدی سے باہر نکل گئی۔ ٹھیکے دار بت کا بت بنا اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ بڑا بھائی میز پر پیالیاں لگانے لگا اور اس کی طرح دار بیوی کنکھیوں سے ٹھیکے دار کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی، ان میں چائے انڈیلتی۔ ٹھیکے دار دیا سلائی سے دانت کرید رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے رال کی ایک بوند اس کے نچلے گندے ہونٹ سے پھسل کر واسکٹ پر آن گری جسے اس نے فوراً رومال نکال کر صاف کیا اور پیالی اٹھا کر سڑ سڑ چائے پینے لگا۔ اس کے بعد کاروبار کی باتیں شروع ہو گئیں۔ جن میں بڑے بھائی کی بیوی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ٹھیکے دار کی آنکھوں میں عطی کا قمیض میں پھنسا ہوا گورا گورا بدن گھوم رہا تھا۔ اس نے بڑی جوش و خروش سے اعلان کیا کہ وہ بڑے بھائی کو منٹوں میں آبادان بھجوا سکتا ہے۔ بھرتی

افسر اس کا یار غار ہے۔ چھوٹے سے کہنے لگا:

"آخر کب تک نوکری کرو گے میاں ---- میری مانو، اپنی بلاک میکری کی چھوٹی سی دکان کھول لو۔"

"اس کے لئے روپیہ چاہیئے بھاجی! اور یہاں تو آپ سے کیا چوری ہے بمشکل گزارہ ہو رہا ہے"۔

"بھئی روپیہ تم مجھ سے لے کر بھی کام چلا سکتے ہو۔ آخر میں کوئی غیر نہیں ہوں۔ جب پاس ہوں گے دے دینا۔"

بڑی بھاوج کا سر فخر سے تن گیا، چہکتی ہوئی بولی۔

"اپنوں کی مدد اپنے ہی کیا کرتے ہیں نا۔"

دونوں بھائیوں کی تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ تمام پریشانیوں اور چھوٹے موٹے قرضوں کی بوجھل سلیں ایک ایک کر کے کھسکتی نظر آئیں۔ بیویوں کے چہرے بھی ایک دم کھل اُٹھے تھے اور رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑنے لگا تھا۔ جو چیزیں لمحہ بھر پہلے بڑی اہمیت رکھتی تھیں اب بے وقعت ہو کر رہ گئی تھیں، آنکھوں کے سامنے قسم قسم کے ریشمی سوٹ دوپٹے اور غرارے لہرانے لگے، انھوں نے دیکھا کہ وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ لئے انار کلی میں گھوم پھر کر شاپنگ کر رہی ہیں اور پھر لفافوں، بنڈلوں اور ڈبوں سے لدے ہوئے تانگے میں سوار واپس گھر آرہی ہیں۔ طے یہ پایا تھا کہ مزید قرض حاصل کرنے کی بات بڑی بھاوج ہی ٹھیکے دار سے کرے۔ چنانچہ قصداً انہیں کمرے میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ ادھر ادھر کی بے معنی باتوں کے بعد جب اُس نے مطلب کی بات کی تو ٹھیکے دار نے ہنستے ہوئے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور بڑی بھاوج کی ران پر چٹکی بھرتے ہوئے بولا:

"میرا تو سبھی کچھ تمہارا ہے کھرشید۔"

وہ اچک کر پرے ہٹ گئی ٹھیکے دار نے اگلے روز بڑے بھائی کو اپنے ہاں آنے کی ہدایت کی اور ڈکاریں لیتا، بھینسے ایسی گردن جھٹکتا، خرخراتا رخصت ہو گیا۔

اس دعوت میں اکبر ماموں شامل نہ ہوئے تھے۔ ایک تو انھیں بلایا بھی نہیں گیا تھا۔ دوسرے وہ خود بھی شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دعوت کس لئے کی جا رہی ہے اور بڑی بہو کا اصل مقصد کیا ہے مگر خاموش تھے۔ ایک تو انھیں اپنے ماضی کے

خوابوں سے ہی فرصت نہ تھی دوسرے گھر بھر میں اتنی اہمیت حاصل نہ تھی کہ کوئی ان کی بات سنتا۔ گھر کا سب سے بااثر رکن اس چال میں شامل تھا۔ چنانچہ اکبر ماموں اس کی مخالفت کر کے وہ سرائے ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا جہاں اسے تیس روپوں میں دو وقت کا کھانا اور تخت پوش پر لگا ہوا بستر مل جاتا تھا۔ دعوت کا سارا وقت اس نے کام سے فارغ ہو کر نسبت روڈ والی دکان پر گزار دیا، سلگتا سماوار بیچ میں رکھے وہ چائے کی پیالیاں خالی کرتے اور بگلے کے سگریٹ پھونکتے رہے اور اپنے پرانے یار سے کلکتہ کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے ہی دن ٹھیکے دار نے بڑے بھائی کو بغیر رسید کے مزید ایک ہزار روپے بطور قرض دے دیئے اور اسے آبادان کے بھرتی افسر سے بھی ملوا دیا۔ جس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اگلی گرمیوں میں اسے ضرور کمپنی میں ملازم کروا دے گا۔ ایک ہفتہ بعد اُس نے چھوٹے بھائی کو اپنے اثر و رسوخ سے گڑھی شاہو میں ایک دکان دلوا دی اور کاروبار شروع کرنے کے لئے دکان میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا مال بھی ڈلوا دیا دونوں بھائی ٹھیکے دار کو فرشتہ سمجھ کر پوجنے لگے۔ بڑی بھاوج بات بات میں اس کا قصیدہ پڑھنے لگی اور اپنے رشتہ داروں کی تعریف میں زمین و آسمان ملانے لگی۔ دوسری طرف ٹھیکے دار نے ببی پہلوان سے بھی خوب میل ملاقات بڑھالی۔ اس کا خیال تھا کہ کہیں یہ اکھڑ اور منہ پھٹ آدمی اس کے کئے کرائے پر پانی نہ پھیر دے۔ چنانچہ وہ اسے پوری طرح گرفت میں لانا چاہتا تھا اور ببی پہلوان کو رام کرنے میں اسے زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ بیس سیر پکی بادام کی بوری اور دو تین روپے روز کے اڑنگے نے اس ڈھیل منہ زور پہلوان کو چاروں شانے چت گرا دیا۔

عظمی کے گھر اب ہفتہ میں دو ایک بار ٹھیکے دار کا باقاعدہ پھیرا رہنے لگا۔ آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ پھلوں سے بھرا ہوا تھیلا یا مٹھائی کی ٹوکری لانا کبھی نہ بھولتا، کبھی موتیے کے گجرے اُٹھا لاتا جنہیں، بڑی بھاوج جلدی سے بالوں اور کلائیوں میں سجا تتلی بن کر ادھر اُدھر پھدکنے لگتی۔ محلے والے جانتے تھے کہ ٹھیکے دار ان کا رشتہ دار ہے۔ لہٰذا کسی کو ایسا ویسا خیال بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن رشتہ داروں کو خوب معلوم تھا کہ اس کی رشتہ داری کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے باتیں اڑنے لگیں۔ مگر ادھر کسے ان باتوں کی پروا تھی۔ صرف بوڑھی ماں نے بڑے بیٹے سے دبی زبان میں اس بات کا اظہار کیا کہ ٹھیکے دار کا زیادہ آنا جانا اچھا نہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ جس پر بڑے بیٹے نے

چمک کر کہا:

"لوگوں کے ساتھ تمھارا بھی دماغ چل گیا ہے۔ وہ ہمارا رشتہ دار ہے اور ہم اسے نہیں روک سکتے، لوگ باتیں کرتے ہیں تو کرتے پھریں"۔ چنانچہ گھر کے اس محاذ پر مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

دو ایک دفعہ ٹھیکیدار نے عظمی سے بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر عظمی نے اس کی بالکل حوصلہ افزائی نہ کی اور کان لپیٹ کر باہر نکل گئی۔ بعد میں بڑی بھاوج نے اسے ڈانٹا کہ آخر مہمان ہے، کیا کہے گا کہ ان لوگوں کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ لیکن عظمی کو اس بھالو کی آنکھوں میں بے شرمی اور بے حیائی کی کھڑکیوں کے تمام پٹ کھلے نظر آ رہے تھے۔ جس کی چوکھٹ پر وہ اپنے نوکیلے دانت ٹکائے اسے لال لال آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اسے اپنے سامنے پا کر عظمی کو گندے اور تیز ناخنوں والا بالوں بھرا ہاتھ اپنی طرف بڑھتا محسوس ہوتا اور وہ سہم کر وہاں سے بھاگ جاتی۔

اور جب دوسرے ہی مہینے ٹھیکے دار کی موٹی کالی پھپھے کٹنی ماں عظمی کا رشتہ مانگنے گھر میں آدھمکی تو عظمی نے اس مکروہ ہاتھ کے تیز ناخن اپنے سینے میں ڈوبتے، اترتے، پیوست ہوتے محسوس کئے۔ اس کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ گھر بھر میں سناٹا طاری ہو گیا جیسے اچانک دالان میں کسی بکرے کا خون آلود کٹا ہوا سر آن گرے۔ گھر کا ہر فرد سوائے بھاوجوں کے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔ اس رشتے کی سبھوں نے مخالفت کی۔ ہوا کا رخ دیکھ کر مکار بھاوجیں بھی اس مخالفت میں شریک ہو گئیں۔

"غضب ہے خدا کا، اس کی اتنی مجال۔"

بڑا بھائی دم کٹے بلے کی طرح بے چینی سے کمرے میں چکر لگانے لگا۔

"اس نے سمجھ کیا رکھا ہے جو قرض دے کر رشتہ لینے آ گیا۔ میں تو پائی پائی اس کے منہ پر دے ماروں گا۔"

چھوٹا بھائی پریشان سا ہو کر تخت پوش کے کونے پر جا بیٹھا اور پاؤں گھٹنے پر رکھ کر میل اُتارنے لگا۔ وہ پوری طرح جانتا تھا کہ ان کے لئے ٹھیکے دار کی پائی پائی ادا کرنا کس قدر دشوار ہے۔ اسے دہرا صدمہ ہوا تھا۔ پہلا یہ کہ ٹھیکے دار نے ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے شرمناک سودا بازی کرنی چاہی تھی اور دوسرے یہ کہ اب گھر میں ہر

آدمی اس رشتے کی زبردست مخالفت کر رہا تھا اور اسے اپنی نئی نویلی دکان کی چھتیں، دیواریں اور کڑیاں اڑڑدھم زمین پر گرتی ملبے کا ڈھیر بنتی نظر آ رہی تھیں۔ نوکری کو اس نے لات مار دی تھی اور دکان اب اسے لات مار رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ٹھیکے دار کا ہزار ڈیڑھ ہزار واپس کرنا اس کے بس کا روگ نہیں اور ابھی دکان پوری طرح چل نکلنے کے لئے مزید دو چار ہزار کی راس مانگ رہی تھی۔ عظمی کی بوڑھی ماں نے اپنی بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور دونوں گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

پہلوان بھائی کو پتہ چلا تو وہ لنگوٹے سے باہر نکل آیا۔

"اس کی ماں کا حلوہ کدو مارا--- دو بیویوں کو ہضم کر چکا ہے تیسری کے لئے ہمارا گھر ہی رہ گیا ہے۔ میں اس کا ایک ایک بادام اسے واپس کر دوں گا۔ سالے نے سمجھ کیا رکھا ہے۔"

ڈیڑھ ایک مہینہ خاموشی سے گزر گیا۔ گھر میں اس موضوع پر کسی نے کوئی بات نہ کی۔ ٹھیکے دار بھی مصلحتاً خاموش ہو کر بیٹھ رہا اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اس ریچھ کی طرح جو جنگل میں شکار کو خود بخود آہستہ آہستہ اپنی طرف آتا دیکھ کر جھاڑیوں کی اوٹ میں تھوتھنی چھپا کر بیٹھ جائے۔ حقیقت میں دونوں بھائی اندر ہی اندر اس رشتے پر غور کر رہے تھے۔ وہ بے حد پریشان تھے۔ انھوں نے اپنے مستقبل کی جو عالی شان عمارتیں ادھار کے گارے چونے کی لیپا پوتی سے کھڑی کی تھیں ان کی ڈاٹیں کھسکنا شروع ہو گئی تھیں۔ چھوٹے بھائی نے دکان پر تالا ڈال دیا تھا۔ کیونکہ مزید سامان خریدنے کے لئے رقم موجود نہ تھی۔ اس رقم کا وعدہ ٹھیکے دار نے کر رکھا تھا۔ بڑے بھائی کا جہاز آبادان کی طرف لنگر انداز ہونے سے پیشتر ہی کراچی کے سمندر میں ڈوبنے لگا تھا۔ ٹھیکے دار کا وہ بھی تین ایک ہزار کا مقروض ہو چکا تھا۔ ان تمام بے رحم حقائق نے مل کر اس کے سوچنے کی ریل گاڑی کو ایسی پٹڑی پر ڈال دیا جس کے آخری سٹیشن پر ٹھیکے دار سہرا باندھے، پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ خاوندوں کے انداز فکر میں اس قدرتی تبدیلی کو ان کی بیویوں نے فوراً بھانپ لیا اور بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے انھیں اپنے سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔ کیونکہ آندھی کے اس خوفناک طوفان میں ان کاریشمی تھانوں، جوتیوں اور سنگار کی ان گنت چیزوں سے لدا ہوا تانگہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ قلعہ کی دیواریں باہر کی گولہ باری سے پہلے

ہی کمزور ہو رہی تھیں اب جو اندر سے بھی سیندھ لگائی جانے لگی تو اچانک ایک جگہ اچھا خاصا شگاف پیدا ہو گیا۔ بڑی بھاوج نے فوراً ٹھیکے دار کے مکان کی جانب جھنڈی ہلا دی۔ چنانچہ اب کے بار ٹھیکے دار کی طرف سے ایک باریش بزرگ پیامی بن کر بڑے بھائی سے ملے۔

"بیٹا! لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں تو انھیں بیاہنا ہی ہوتا ہے تو پھر اس رشتے میں کیا برائی ہے۔ اسلام کی رو سے یہ بالکل جائز ہے۔ لڑکے کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہیں ہے پھر اکیلا رہتا ہے۔ ہزاروں کی جائداد ہے۔ لڑکی ساری عمر راج کرے گی۔ اس کے علاوہ شرع نے بھی ایسی شادیوں پر زور دیا ہے جن کی مدد سے دو گھروں میں خوش حالی اور فارغ البالی کا کوئی سبب بن سکے۔"

چھوٹا بھائی دل ہی دل میں پہلے ہی دن سے راضی تھا۔ اب جو اس بزرگ نے اسلام اور شرع کا حوالہ دیا تو وہ اس رشتے پر تیار ہو گیا۔ ذہنی طور پر بڑا بھائی بھی اس رشتے کو قبول کر چکا تھا۔ مگر اس کا ضمیر اسے بار بار اس فیصلے پر ملامت کر رہا تھا۔ وہ اس غضب ناک بھوکے اژدھے کے منہ میں کسی معقول دلیل، کسی موزوں بہانے اور وزنی سہارے کا تر لقمہ ڈالنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی یہ قاعدہ ہے کہ ہمیں اپنے ظالمانہ فعل کے لئے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے واسطے اتنی ہی شدید نوعیت کی کوئی دلیل مہیا کرنی پڑتی ہے ورنہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ہمارا کلیجہ اپنے ہی ظلم کے نظارے سے پھٹ جاتے، بڑے بھائی نے اپنے دفاع کے نعمت خانے کی پوری تلاشی لی۔ آخر ایک کونے میں پڑا اسے بھنے ہوئے گوشت کا ایک لذیز ٹکڑا مل گیا۔ پھر کیا تھا۔ اس نے اسی بزرگ کے ہاتھوں ٹھیکے دار کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ شادی کے سلسلے میں ان کی کچھ شرطیں ہوں گی اور شرطیں یہ تھیں۔

1۔ حق مہر پچاس ہزار ہو گا اور عند الطلب ہو گا۔
2۔ لڑکی کا پہلے والے بچوں سے کوئی واسطہ نہ ہو گا۔
3۔ لڑکی ہمیشہ الگ مکان میں رہے گی۔
4۔ وہ ہر ماہ ایک ہفتہ اپنی والدہ کے پاس آ کر رہے گی۔
5۔ بیس ہزار روپے لڑکی کے نام الگ بنک میں جمع کروانے ہوں گے۔

جس وقت ٹھیکے دار کو یہ پیغام ملا وہ اپنے دوستوں کے گھر اپنے فلیٹ کے پیچھے کمرے میں بیٹھا پیٹ بھر کر بیئر پینے کے بعد خمیری روٹیوں کے ساتھ پسندے اڑا رہا تھا۔

روٹیوں کے بھورے اس کی مونچھوں میں اٹکے ہوئے تھے اور انگلیاں شوربے میں چپڑی ہوئی تھیں۔ پیغام سن کر اس کی گردن فتح مندی کے غرور سے تن گئی۔ وہ ایک سانس اس زور سے لئے کہ پھولی ہوئی مونچھوں کے بال کانپنے لگے۔ زبان کی نوک سے منہ کے آگے آیا ہوا خمیری روٹی کا بھورا چاٹا، ڈکار مار کر توند پر ہاتھ پھیرا۔ پیغامبر کے کان میں جھک کر کچھ کہا اور پھر آگے کو جھک ایک پسندا دانتوں میں دبا اسے جانوروں کی طرح چبانے لگا۔

پیغام لانے لے جانے والوں کے تین چار پھیروں کے بعد خوش بہار کے مہینے میں عطیہ بانو کی ٹھیکے دار سے شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ ٹھیکے دار نے ان کی ساری شرطیں منظور کر لی تھیں۔ پہلوان بھائی نے دیوار پر دو ہتڑ ماری اور اپنا گول کدو ایسا سر ہاتھوں میں لے کر بڑے کرب سے بولا:

"تم سب قاتل ہو، پیسوں کی خاطر میری بہن کو اس شرابی سے بیاہ رہے ہو۔"

بڑے بھائی نے غصہ میں اسے ڈانٹا:

"بکواس بند کر ببی۔"

ببی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ تم روپوں کے بھوکے ہو، میرے پاس دولت ہوتی تو میں اپنی بہن کے سر پر وار کر تم کتوں کے آگے ڈال دیتا۔"

بڑے بھائی نے زور سے اسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ ببی کی آنکھوں میں ایک دم خون اُتر آیا۔ ایک خاموش بجلی سی کوندی اور ببی نے دھوتی کے ڈھب سے چاقو نکال لیا۔ بوڑھی ماں چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ عطی ببی کے ہاتھ جوڑنے لگی۔ بڑی بھاوج روتی چلاتی اپنے خاوند پر آن گری۔ ببی نے چاقو فرش پر پھینک دیا۔

"میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ میرا ڈیرہ صمدو کی باغیچی میں ہو گا۔ میں اپنی بہن کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

لیکن گھر سے باہر نکلنے کی بجائے وہ پرکٹے کبوتر کی طرح مکان کے اندر ہی دو تین بار پھڑپھڑایا، چکنے گھڑے میں سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا، دھوتی کے پلو سے ناک صاف کی اور چوکی پر بیٹھ دیوار سے ٹیک لگا آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی حالت اس بھوکے چیتے سے ملتی جلتی تھی جو پنجرے میں بند ہو کر شدید غصے اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں چاروں طرف

غراتا پھرتا ہے۔ لیکن جب پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا ہے تو پنجرے کے احساس سے بے نیاز ہو کر کونے میں لیٹ کر نیند کے جھکولے لینے لگتا ہے۔

عطی بالکل سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا رنگ دنوں ہی میں پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ٹھنڈے بے جان پرزے کی طرح گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ اسے اپنے ساتھ کی جانے والی بے انصافی کا پورا احساس تھا مگر وہ اس گھر میں بے بس تھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ اس کی تقدیر کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کے بھائیوں اور بھاوجوں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مکان کی مٹی پر کھڑی ہو کر اس ظلم کے خلاف واویلا مچانا چاہتی تھی مگر پہلی ہی سیڑھی پر اس کی ہمت جواب دے جاتی اور اس کی ٹانگیں کانپنا شروع کر دیتیں اور ایسا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ جب اس کے ذمہ دار بھائیوں نے مرد ہو کر ہتھیار ڈال دیئے تھے تو وہ میدان جنگ کی سب سے پچھلی قطار میں ننھی کھڑی دشمن کا مقابلہ کیسے کر سکتی تھی اور پھر ایسی حالت میں جب کہ اس کے ہاتھ میں تلوار کی بجائے زخمیوں کو پانی پلانے والا مشکیزہ ہو۔ اکبر ماموں کی پوری ہمدردیاں عطی کے ساتھ تھیں لیکن ہمدردیاں وہ پھاہے تھے جو مرہم کے بغیر ہی زخموں سے چپکائے جا رہے ہوں۔ وہ اس لڑائی کا خاموش تماشائی تھا جو میدان جنگ سے دور ایک بلند ٹیلے پر سماوار گرم کئے، بگلے کا سگریٹ سلگائے بیٹھا ہو اور لڑنے والوں، جیتنے والوں، ہارنے والوں، گر کر اٹھنے والوں، اٹھ اٹھ کر گرنے والوں کو موت ایسی بے حس، سنگین اور دل ہلا دینے والی بے تعلقی اور بے نیازی سے دیکھ رہا ہو۔

وہ عطی سے صرف اتنا ہی کہہ سکا "میں مجبور ہوں بیٹی! یہاں میری کوئی نہیں سنتا۔ ایسے لگتا ہے کہ میں ان لوگوں میں کوئی اجنبی آ گیا ہوں جسے یہ بالکل نہیں جانتے۔ تمھاری حالت دیکھ کر میرا دل خون ہو رہا ہے مگر کر ہی کیا سکتا ہوں۔ تاہم یہ بے انصافی میری برداشت سے باہر ہے۔ شاید میں بھی جلد کلکتے چلا جاؤں اور پھر کبھی اس گھر کا رخ نہ کروں گا ----"

عطی کا زرد، پھیکا، پژمردہ چہرہ جھکا ہوا تھا۔ پھر بھی اکبر ماموں اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ جیسے اس دردناک حادثہ کی کچھ ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہو۔ ایک ایک کر کے ہر اپنا آدمی عطی کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اسے اچانک اسلم کا خیال آ گیا۔ وہ عطی سے محبت کرتا تھا۔ وہ اس کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ وہ ہانپتی کانپتی اسلم کی طرف اٹھ

دوڑی۔ اس نے مایوسی اور گھبراہٹ کے عالم میں طوفانی سمندر کی ہیجان خیز لہروں کی سطح پر تیرنے والے آخری تنکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسلم اپنے کالج کے کرکٹ کے میچ پر جا رہا تھا۔ اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک پاؤں کرسی پر ٹکائے جھک کر سفید بوٹ کے تسمے باندھ رہا تھا۔ اس نے عطی کو اوپر چڑھتے دیکھا تو بڑے لاابالی انداز میں سیٹی مارتے ہوئے مسکرا کر بولا "مبارک ہو بلو--- اری ادھیڑ عمر کا ہے تو کیا ہوا، عمر بھر عیش تو کرے گی --- اچھا بتلاؤ اب تو ہمیں کھلم کھلا ملا کرے گی نا؟" اتنا کہہ کر وہ بڑے مکروہ انداز میں ہنسا، منہ عطی کے پاس لا کر بڑے فحش انداز میں سیٹی بجائی اور گاتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔ اسلم کا بدبودار سانس عطی کے چہرے پر سانپ کی پھنکار بن کر لگا۔ وہ خوف سے زرد پڑ گئی۔ وہ گم سم وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس نے شوریدہ سر، کف اٹھاتے، طوفانی سمندر کے کھولتے، سر پٹختے، گھرے، دہشت ناک وحشی گرداب میں اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا۔ چکراتے، شور مچاتے، گرداب کی پہاڑ ایسی دیواریں اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی تھیں اور وہ نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھی، عطی کا چہرہ خود بخود اوپر اٹھتا گیا۔ اس نے گندے خون میں لتھڑے ہوئے، آگ اگلتے، گھرے سرخ جہنمی آسمان کو آخری مرتبہ دیکھا اور اپنے آپ کو سمندر کی بے رحم غضب ناک لہروں کے حوالے کر دیا۔

ایک ہفتہ بعد وہ دلہن بنا کر ٹھیکے دار کے ساتھ رخصت کر دی گئی۔ ڈولی چلی گئی، گھروں کے دروازے بند ہو گئے، گلی ویران ہو گئی، پھر مٹ میلی سی سسکیاں بھرتی ہوا چل نکلی اور گلی کے فرش پر بجھی ہوئی آگ کی راکھ اڑنے لگی اور پھر بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی اور گلی میں مسلے ہوئے پھول کیچڑ میں لت پت ہو گئے اور پھر-----

فضا میں کسی بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی،

عطی نے گھوم کر دیکھا، اس کا کالا بدصورت بچہ پلنگ پر لیٹے لیٹے ٹانگیں چھت کی طرف اٹھائے، مٹھیاں بھینچے روئے جا رہا تھا۔ وہ کھڑکی چھوڑ کر اس کی طرف بھاگی اور پاس آ کر ایک دم ٹھٹک سی گئی۔ اسے ایکا ایکی یوں لگا جیسے اس کا مکروہ صورت گندہ ریچھ نما شرابی خاوند بچہ بن کر پلنگ پر لیٹا رو رہا ہے۔ وہ اسے ہاتھ لگاتے جھجکنے لگی۔ جیسے اس کے چھوتے ہی اس بدصورتی کا پلپلا سا لوتھڑا بیچ سے پھوٹ جائے گا۔ اس کی ہری ہری بہتی ہوئی غلاظت میں اس کی انگلیاں لتھڑ جائیں گی۔ بچے کے رونے کی مسلسل آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی

تھیں۔ پھر جیسے اپنے آپ ہی اس کے ہاتھ بچے کی طرف بڑھے۔ اس نے بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور خود بھی روتے ہوئے اسے پاگلوں کی طرح چومنا شروع کر دیا۔

نیچے مکان کے صحن میں پتلی ناک اور گھنگھریالے بالوں والا عاشق مزاج لڑکا ابھی تک وہیں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے جب کھڑکی کی چق خالی دیکھی تو بڑی پُر اشتیاق نگاہوں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اب کام بن گیا ہے اور وہ لڑکی اس سے ملنے ضرور نیچے آئے گی۔

عذرا کی واپسی

پیارے ------

امید ہے، تمھیں میرا خط مل گیا ہو گا اور تم نے حسب عادت اپنی نوٹ بک پر لکھ بھی لیا ہو گا کہ فلاں تاریخ کو جواب دو گے۔ تمھارے نسخۂ حیات میں نوٹ بک جزوِ اعظم ہے۔ خدا کرے کبھی یہ کھو جائے اور تمھارے لئے دوستوں کو پہچاننا مشکل ہو جائے۔ میں جو قاصد کے آتے آتے ایک اور خط لکھ رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں جانتا ہوں تم خط کے جواب میں کیا لکھو گے بلکہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں میرے ساتھ ایک عجیب سا حادثہ ہوا ہے جسے میں پوری تفصیل کے ساتھ تمھیں سنانا چاہتا ہوں۔ اسے ایک قصہ ہی سمجھ لو، جس کے تمام واقعات اور کردار بالکل اصلی ہوں گے۔ میں نے صرف نام اور مقامات بدل دئے ہیں۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ادھر کچھ عرصے سے میں فلمی دنیا سے منسلک ہو گیا ہوں مگر شاید یہ نہیں جانتے کہ اس دور کی فلمی دنیا میں ایک انسان کو سستی اور بے بنیاد قسم کی عارضی شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ وہ نیو تھیٹر اور بمبئے ٹاکیز والا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ معاشرے کی بھلائی، ہمارے روزمرہ کے مسائل، مقصدیت، ادب اور جمالیات کی کلاسیکی روایات کی قدریں اپنا بوریا بستر اٹھا کر سٹوڈیوز سے رخصت ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ خوشامد، مطلب براری، خود غرضی، بوالہوسی، زر پرستی، بے راہ روی اور بھانڈوں ایسا ڈھونگ پن جنم لے رہا ہے۔ تم کسی سٹوڈیو میں کسی فلم کے کسی سیٹ پر چلے جاؤ تمھیں وہاں امریکی طرز کے آتش دان، بغدادی چور نامی فلم کی تلواریں، جاسوسی فلموں کے پاکٹ مار، مارلین منرو کے گھٹیا چربے، راج کپور کی چڑھی ہوئی پتلونیں، دلیپ کمار کے ماتھے پر گرے ہوئے واہیات بال اور زربفت و کمخواب کے لبادوں میں لپٹے ہوئے بگڑے دل نواب زادے ملیں گے۔ تمھیں ایک بھی آدمی اپنے صحیح طبقے کی صحیح نمائندگی کرتا نہیں ملے گا۔ تم یہاں کلرک کے گھر میں پیانو، کوچوان کے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل اور قلی کی بیٹی کی بانہوں میں سونے کا چوڑا دیکھو گے۔ تمھیں پنجاب کے ان غیرت مند کسانوں کی جوان بیٹیاں، رنڈیوں کی طرح گاؤں میں ناچتی ملیں گی جن کے مکانوں کے آگے سے تم ننگے سر نہیں گزر سکتے۔ تم

یہاں عورتوں کو مردوں کی طرح تانگہ چلاتے اور مردوں کو عورتوں کی طرح ان کے فراق میں روتا ہوا دیکھو گے۔ یہ تمام حربے لوگوں سے روپیہ بٹورنے، انھیں بیوقوف بنانے اور معاشرے میں جرائم، زنا، اغواء، ڈاکہ اور چوری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ہیں۔ فلم کی افادیت اور ہماری سوسائٹی میں اس کے اہم رول سے انکار کرنا سراسر حماقت ہے۔ فلم اس دور کی بہت بڑی ضرورت اور تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ایک بھی ایسا آدمی آگے نہیں آیا جس نے اس ذریعے کو نیک نیتی سے اپنایا ہو۔

لوگوں میں ---- خاص طور پر نوجوان لڑکیوں میں فلم میں کام کرنے کا شوق اس قدر بڑھ گیا ہے کہ صرف ہمارے دفتر میں ہر روز سینکڑوں خطوط موصول ہوتے ہیں۔ بعض منہ زور قسم کی لڑکیاں خود آن موجود ہوتی ہیں اور دربدر خراب ہوتی پھرتی ہیں۔ اگرچہ اس ماحول میں ہمارے جدید عہد کی پوری خامیاں موجود ہیں پھر بھی یہاں کہیں کہیں ایسے لوگ ضرور مل جاتے ہیں جو ابھی تک شرافت اور اخلاقی وضع داری کے پرانے اصولوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ نئے چہرے ان لوگوں سے بہت کم ملتے ہیں۔

آج کے خط میں، مَیں تمھیں ایسی ہی لڑکی کی داستان سناؤں گا جو ہیروئن بننے کے شوق میں اپنے گھر سے بھاگ کر لاہور آ گئی تھی۔ اس لڑکی کا نام کچھ اور تھا تم عذرا سمجھ لو۔ کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ میں ایک روز حسبِ عادت دوپہر کے بعد اپنے فلمی دفتر گیا تو وہاں کے ماحول میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ پائی۔ میرا ساتھی اپنے مخصوص انداز میں نئی فلم کے سکرین پلے پر کام کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اس کام میں شریک ہو گیا۔ ابھی ہم نے بمشکل دس سین ہی لکھے ہوں گے کہ چپڑاسی نے میرے ساتھی سے کہا:

"جی مس صاحبہ پوچھ رہی ہیں، میں کب تک بیٹھوں؟"

میرے ساتھی نے کہا کہ ان سے کہو ڈائریکٹر صاحب تھوڑی دیر تک آجائیں گے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا "عجیب لڑکی ہے، دو دن سے پیچھے پڑی ہوئی ہے"

معلوم ہوا کہ مس صاحبہ ایکٹرس بننے کے جنوں میں مبتلا ہو کر گھر بار چھوڑ کر دو روز سے کسی معمولی سے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں اور میرے ساتھی کے ذمے یہ کام سونپا ہے کہ وہ اسے ڈائریکٹر سے ملوا دے۔ میں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ میں دن میں ایسی کئی لڑکیوں کو دیکھتا ہوں جو ہیروئن بننے کے شوق میں ایکسٹرا کی فوج میں بھرتی ہوتی ہیں۔

چنانچہ بدستور ہم اپنا کام کرتے رہے۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ لڑکی جس کا فرضی نام میں نے عذرا رکھا ہے انتظار سے تنگ آ کر ہمارے کمرے میں آ گئی۔ میانہ قد، دبلا جسم، سنہرے کٹے ہوئے بال، سرخ و سپید رنگ، ریشمی شلوار قمیص، کندھوں پر ڈھلکا ہوا ریشمی دوپٹہ، مخمور غلافی آنکھیں، پتلے ہونٹ اور ناک تیکھی لیکن ذرا لمبی۔ ---- کہنے لگی:

"میں تو تنگ آ گئی ہوں ---- صاحب! ڈائریکٹر کب آئیں گے؟"

اگرچہ اردو بول رہی تھی مگر لہجہ پنجاب کے شمالی علاقے کا تھا۔ میں نے یونہی اسے چھیڑنے کے لیے کہا:

"اچھا تو آپ ہیروئن بننا چاہتی ہیں؟ خوب؟ آپ کی عمر کتنی ہے؟ تعلیم کہاں تک ہے؟"

لڑکی نے کچھ ایسی سادگی سے میرے سوالوں کا جواب دیا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ لڑکی بیوقوف اور بھولی بھالی ہے اور اس نے ابھی تک زمانے کے گرم سرد نہیں دیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہیروئن بننے کی صلاحیت مفقود تھی۔ جب میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تو کہنے لگی:

"کیوں ---- مجھ میں کونسی خامی ہے، ناک اتنی لمبی تو نہیں۔"

ہم ہنس پڑے ڈائریکٹر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ آپ ہیروئن نہیں بن سکتیں۔ لیکن وہ بڑی ضدی تھی۔ کہنے لگی آپ جھوٹ کہتے ہیں، میں ہیروئن بن سکتی ہوں۔ اور ضرور بنوں گی۔ خیر بات گزر گئی، میں دفتر سے اٹھ کر گھر آ گیا۔ اگلے روز دفتر پہنچا تو عذرا پھر موجود تھی اور پہلے سے زیادہ خوبصورت لباس میں ----!

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے کہا "بابا! تم ایکٹرس نہیں بن سکو گی، خواہ مخواہ خراب ہونے سے کیا فائدہ؟ بہتر ہے فوراً گھر واپس چلی جاؤ" مگر وہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ الٹا بحث کرنے لگی کہ یونہی کوئی خراب نہیں ہوا کرتا۔ کسی کی جرأت ہے کہ میری طرف آنکھ بھی اٹھائے اس نے اتنی لمبی بحث کی کہ میرا سر درد کرنے لگا۔ میں نے رجسٹر بند کر کے الماری میں رکھا اور وہاں سے بھاگ آیا۔

تیسرے روز شام کا ذکر ہے کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ شیزان میں چائے پینے کے لئے داخل ہوا تو دیکھا کہ کونے والی میز پر عذرا بیٹھی ہوئی ہے۔ بالوں کو خوب ربن

وغیرہ سے سجا رکھا ہے۔ پاؤڈر سرخی بھی دمک رہی ہے۔ میری طرف دیکھ کر کچھ اس طرح مسکرائی کہ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے پاس جا کر پوچھا یہاں کیا کر رہی ہو۔ کہنے لگی کسی صاحب نے ایک مشہور فلم ڈائریکٹر سے ملوانے کا وعدہ کیا ہے اور اب وہ یہاں آ رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ عذرا کی وہ زندگی شروع ہو رہی ہے جو اسے انجام کار کسی نہ کسی قحبہ خانے میں لے جائے گی۔ اس کے چہرے پر اب بھی وہی بھول پن تھا جو بے وقوفی سے بڑی مناسبت رکھتا ہے۔ ایکا ایکی جیسے کسی نے میرے کان میں کہا کہ اب اس لڑکی کا ساتھ چھوڑنا مردانگی نہیں۔ میں نے فوراً کہا:

"ارے وہ ڈائریکٹر تو میرا بہت دوست ہے۔ چلو میں تمھیں خود ملوا دیتا ہوں۔"

پہلے تو وہ ہچکچائی پھر اپنا سرخ پرس تھام کر میرے ساتھ باہر نکل آئی۔ اب سوچنے لگا کہ اس مصیبت کو کہاں لے جاؤں۔ ہاں ---- شیزان کے باہر اس کا اپنا ایک نوکر بھی تھا جو پان والے کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ فوراً خیال آیا کہ چوبرجی کوارٹرز میں ابراہیم جلیس اور منیر نیازی رہتے ہیں۔ کیوں نہ اسے وہاں لے جاؤں؟ وہ ضرور اس کی رہنمائی کریں گے۔ خیر بھائی ---- وہاں پہنچا۔ یہ لوگ سٹوڈیوز گئے ہوئے تھے انھیں وہاں سے بلوایا۔ ان سے عذرا کا تعارف کروایا کہ میرے ایک عزیز ہیں ان کی بھانجی ہیں۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔ جلیس اور منیر نے مجھے دوسری طرف لے جا کر کہا کہ یہ لڑکی ایکٹرس بننے سے تو رہی، خواہ مخواہ خراب ہو گی۔ اس ماحول کو تم بھی اچھی طرح سمجھتے ہو۔ بہتر ہے کہ اسے واپس گھر پہنچا دو۔ انھیں سٹوڈیو پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ چلے گئے۔ اس اثنا میں عذرا کا نوکر بھی بھاگ گیا۔ اب وہ بہت گھبرائی۔ اکیلی رہ گئی۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ میرے ساتھ تنہا باہر نہ نکلے۔ میں بھی شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ پُر اسرار آواز بار بار یہی کہے کہ اب اس لڑکی کو اکیلا مت چھوڑنا اب اگر یہ کسی قحبہ خانے میں گئی تو اس کی ساری ذمہ داری تم پر ہو گی۔ خیر صاحب! بڑی مشکل سے میں اسے باہر لایا۔ اب دونوں پیدل ہی چوبرجی سے واپس چل پڑے۔ اس دوران عذرا نے مجھے اپنی تھوڑی سی کہانی سنائی۔

معلوم ہوا کہ پنجاب کے ایک بڑے مشہور اور باعزت گھرانے کی لڑکی ہے۔ باپ فوج میں بڑے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ ماں سوتیلی ہے۔ بڑی بہن کے پاس رہتی ہے جہاں

شادی کرنا چاہتی ہے وہاں رشتہ دار مخالفت کرتے ہیں۔ برادری کا سوال ہے۔ وغیرہ وغیرہ ---- میں نے کہا اب بہتر یہی ہے کہ ہوٹل سے سامان اٹھاؤ اور ساڑھے گیارہ والی گاڑی میں سوار ہو کر واپس چلی جاؤ۔ کہنے لگی۔ اکیلی کیسے جاؤں۔ نوکر دغا دے گیا ہے۔ ہوٹل میں بھی اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں۔ اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا:

"میرے گھر چلی چلو، وہاں میری بیگم بھی ہے۔"

عذرا کو ذرا حوصلہ ہوا۔ اتنے میں ایک خالی تانگہ مل گیا اور میں اسے گھر لے آیا۔ بیگم سے ملوایا۔ رات بھر ہم اسے سمجھاتے رہے کہ وہ فلمی دنیا کا ارادہ ترک کر دے کیونکہ وہ ہیروئن کسی حال میں بھی نہیں بن سکے گی اور ساری عمر کے لئے اپنے آپ کو برباد کر لے گی۔ آخر وہ بڑی مشکل سے اس شرط پر راضی ہوئی کہ اس کی شادی اس کی مرضی کے مطابق کروا دی جائے۔ ہم نے اسے غنیمت جانا اور فوراً مان گئے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ عذرا کو ہر حالت میں کل شام تک اس کی بڑی بہن کے ہاں پہنچا دینا ہو گا۔ اس مقصد کے لئے میں نے عذرا سے اس کی بہن کے خاوند کا نام اور کوٹھی کا نمبر وغیرہ پوچھ کر نوٹ کر لیا۔

ضیاء بھائی کو تو تم جانتے ہی ہو میں نے پو پھٹتے ہی ان کے گھر کی گھنٹی بجائی۔ وہ بھاگا بھاگا نیچے آیا۔ میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ کہنے لگا

"ہم اسے پہنچا تو ضرور آئیں مگر جانے پر ہرگز تیار نہ ہو گی۔" اور مشکل بھی یہی درپیش تھی۔ اگر عذرا کو یہ یقین ہو گیا کہ ہم اسے اس کی بہن کے گھر چھوڑ آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں تو وہ ہمارے ساتھ چلنے کے بجائے میرے گھر سے بھی بھاگ جائے گی۔ حسن اتفاق سے جس ڈاکٹر سے وہ شادی کرنے کی خواہش مند تھی وہ بھی اسی شہر میں رہتا تھا۔ اب پروگرام یہ طے پایا کہ ہم ڈاکٹر سے اس کی شادی صرف اس شرط پر طے کروانے میں مدد دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے ڈاکٹر سے ملے اور ہمیں اطمینان دلائے کہ ڈاکٹر واقعی شادی پر رضامند ہے۔ جب عذرا کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو وہ بڑے فخر سے گردن اٹھا کر بولی:

"وہ کبھی انکار نہیں کر سکتا۔ میں ابھی چلنے کو تیار ہوں۔"

ضیاء بھائی نے اسی وقت کار نکالی۔ عذرا کے ساتھ ہم نے احتیاطاً اپنی بیویوں کو بھی بٹھا لیا۔ یہ تجویز ضیاء بھائی کی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں نیکی برباد اور گناہ لازم نہ ہو جائے۔

بیویاں ساتھ ہوں گی تو ہمیں آوارہ نہیں سمجھا جائے گا اور کم از کم ہماری بات تو سن لی جائے گی۔ اب کار لاہور سے شمال کی طرف شہر ---- کی جانب روانہ ہو گئی، کوئی دو گھنٹے بعد ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ پڑاؤ ایک دوست کے گھر میں کیا۔ عورتوں کو وہاں چھوڑ میں اور ضیاء بھائی عذرا کے بہنوئی کی کوٹھی پر جا پہنچے۔ اپنا کارڈ دیا خادم ایک خوبصورت اور ماڈرن ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ ہر چیز بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھی تھوڑی دیر بعد ایک درمیانہ عمر کا بارعب اور مدبّر قسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔ مصافحے کے بعد اس نے سگریٹ پیش کئے۔ اب ہم اس ادھیڑ بُن میں تھے کہ بات کیوں کر اور کہاں سے شروع کی جائے۔ آخر اللہ کا نام لے کر میں نے سارا واقعہ گوش گزار کر دیا۔ شریف آدمی ندامت سے سرنگوں ہو گیا۔ اب ان کی بیگم صاحبہ بھی آ گئیں تو وہ شدتِ غم سے رونے لگیں۔

جب ہم نے بتایا کہ عذرا ہمارے ساتھ ہے تو ڈھارس بندھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم عذرا کو گاڑی میں بٹھا کر سیدھا ان کے ہاں لے آئیں۔ ہم نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہ راستے میں ہی ادھر آنے سے انکار کر دے پھر کہنے لگے۔ "ہم خود وہاں چلے چلتے ہیں۔"

ضیاء بھائی بولے "مگر وہاں کہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ نہ ہو جائے"

طے یہ پایا کہ ہم عذرا کو لے کر دوسری سڑک پر سے پورے چھ بجے شام کے وقت گزریں گے اس وقت وہ وہاں موجود ہوں۔ اس کے بعد ہم اپنے گھر آ گئے۔ شام کو عذرا اور بیویوں کو لے کر بظاہر اس ڈاکٹر سے ملاقات کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جب کار عذرا کی بہن کے علاقے میں آئی تو عذرا نے شور مچایا ادھر مت جاؤ خدا کے لئے ادھر مت جاؤ۔

ابھی پونے چھ بجے تھے۔ ہم نے چھاؤنی کے دو تین چکر لگائے اور جب پورے چھ بجے تو کار کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک خاص سڑک پر ڈال دیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ عذرا اپنے شہر کے خیال سے پچھلی سیٹ پر سر نیچے کئے بیٹھی تھی۔ دور سے ہم نے اس کی بہن اور بہنوئی کو دیکھا اور کار عین ان کے پاس لے جا کر کھڑی کر دی۔ عذرا نے جب اپنی بہن کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس سے زیادہ حیرت ہماری بیویوں کو ہوئی۔ کیونکہ ہم نے اپنا سارا منصوبہ ان سے پوشیدہ رکھا تھا۔ عذرا کو تو خیر ہم نے اس کے گھر پہنچا دیا اور اس کی بہن کو تاکید بھی کر دی کہ اس کی شادی اس کی مرضی کے مطابق کریں ورنہ وہ پھر گھر سے نکل بھاگے گی اور ان کی خاندانی شرافت کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دے گی۔ واپسی پر سارا راستہ

ہماری بیویاں ہمیں الزام دیتی رہیں کہ ہم نے عذرا کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ عذرا بھی یہی سوچتی ہو گی اور مجھے برا بھلا کہتی ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ ایک روز جب وہ ایک پرسکون گھر کے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی سویٹر بن رہی ہو گی اور اس کا بچہ اسکے پاس گھاس پر کھیل رہا ہو گا اور اس کا خاوند پیار سے اس کا ماتھا چوم کر دفتر جائے گا تو اسے محسوس ہو گا کہ ہم نے اس کے ساتھ دھوکا نہیں کیا تھا۔ ہم نے یہ کام نیکی یا جزا کے خیال سے نہیں کیا اور نہ ہی میں اس بھلائی کے کام کی رشوت میں خدا سے اپنے گناہ بخشوانا چاہتا ہوں بلکہ اس خیال سے کہ "زرد گلاب" اور "جنگل روتے ہیں" لکھنے سے بہتر ہے کہ اس معاشرے میں کسی ریشم یا رضیہ کو برائی سے بچا لیا جائے۔ میں کوئی لیڈر یا مصلح قوم نہیں ہوں بلکہ ایک عام کمزوریوں والا انسان ہوں۔ لیکن میں عذرا اور اس کی سینکڑوں بہنوں کو مخاطب کر کے اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ صبیحہ، مسرت، سنتوش، اور سدھیر کو فلموں میں دیکھ کر جب اپنا گھر چھوڑنے لگتی ہیں تو دہلیز کے باہر قدم رکھنے سے پیشتر اپنی بوڑھی ماں اور باپ کو بھی ایک نظر دیکھ لیا کریں۔ اس لئے کہ آج کے فلمی ماحول میں انھیں میرے اور ضیاء بھائی ایسے بیوقوف بہت کم ملیں گے۔

اے راوی کے پانی

لاہور میوہ منڈی

18 ستمبر

پیارے -----

بھلے مانس میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے کراچی نہ بلواؤ، میرا وہاں جی نہیں لگے گا۔ میں کسی ایسے بڑے شہر میں نہیں رہ سکتا۔ جہاں پتھر دل طویل شاہراہیں، پر ہجوم عدالتیں، سٹاک ایکس چینج مارکیٹیں، پٹرول اور گندے تیل کی بدبو اڑاتی بسیں، کاریں اور پر شور موٹر سائیکلیں تو ہوں لیکن گھنے باغوں کے سایہ دار کنج اور لمبے خوبصورت پارکوں اور پُر سکون خاموش برآمدوں والے کالج اور سڑکوں پر جھکے ہوئے گنجان درخت نہ ہوں۔ میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا۔ جب تم کراچی کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور تم نے کہا تھا، وہاں لاہور کی طرح یہ درختوں کی بک بک نہیں ہے ہر طرف خوب روشنی ہوتی ہے۔ شائد تم نے کبھی اس روشنی کو نہیں دیکھا۔ جو درختوں کی شاخوں میں سے چھن کر آتی ہے۔ لیکن اتنی فرصت کہاں جس وقت سورج دیوتا پیڑوں کے پیچھے سے اپنا کندن جیسا مکھڑا اوپر اُٹھاتا ہے، اس وقت تم اپنے پلنگ پر بے حس شہتیر کی طرح پڑے پڑے ایکسپورٹ امپورٹ کے خواب دیکھ رہے ہوتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کے حلقے زیادہ گہرے ہوگئے ہوتے ہیں۔ ماتھے پر گہری نیند کے باوجود ایک طرح کی اذیت، کرب، بے کلی اور بے چینی کے اثرات ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چہرے پر نحوست برس رہی ہوتی ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جوں جوں تمہارا کاروبار وسیع ہو رہا ہے۔ تمہارا چہرہ بھدا، بد نما، بدوضع اور بے ڈول اور بے حس ہوتا جا رہا ہے۔ ویسے دیکھنے میں تم اچھے خاصے ہو رنگ گورا ہے سرخ بھی ہے خوش لباس اور صحت مند ہو مگر تمہاری خوش لباسی اور صحت مندی لٹھے کے اس کورے تھان کی طرح ہے جسے ابھی ابھی بند پیٹی میں سے نکالا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس روز ہاکس بے والی چاندنی رات کو میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ خوشبو ضرور لگایا کرو، "تمہاری چہل قدمی کار پر ہوتی ہے۔ تم دو فرلانگ پیدل چلو تو دم پھول جاتا ہے۔ ایک ٹوسٹ زیادہ کھالو تو بد ہضمی ہو جاتی ہے۔ رات فروٹ سالٹ نہ پیو تو صبح باتھ روم نہیں جاسکتے ستار کی الاپ سنائی دے جائے تو نیند آنے لگتی ہے۔ کہیں ہرے بھرے دھان کے کھیتوں کا منظر سامنے آجائے تو سر چکرانے لگتا ہے۔ تمہیں یاد ہے ایک بار ہم کہیں جا رہے تھے کہ اچانک کچے مکانوں کے اوپر گرمیوں کا پیلا، گرم، پر اسرار چاند طلوع ہوا۔ میں نے تمہیں اس طرف متوجہ کیا تم نے چاند کی طرف دیکھ کر کہا:

"کمال ہے یار، یہ چاند تو بڑا خوبصورت ہے۔"

اور اس کے بعد تم نے جیب سے رومال نکال کر اتنے زور سے ناک صاف کی کہ میں کانپ اٹھا۔ اس کے باوجود تم مجھے پیارے ہو اور میں تمہاری دوستی سے لطف اٹھاتا ہوں۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ جہاں آم، نیم، سرس اور جامن کے درخت نہ ہوں وہاں ہم لوگ ذرا مشکل ہی سے بسیرا لیتے ہیں۔ جنگل کے ساتھ ہمارا رشتہ ناطہ بڑا پرانا ہے ہم لاکھ مہذب اور محفل باز سہی، پر اپنی خواب گاہ میں بڑے تنہا، اکیلے اور جنگلی ہیں جس دن ہمارے اندر کی یہ چیز مر گئی اس دن ہم میں اور گراموفون کے فنر میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ درخت اُسی پرانے جنگل کے سفیر ہیں اور جس شہر میں جنگلات کا محکمہ تو ہو مگر اس کا سفارت خانہ کوئی نہ ہو۔ وہاں بھوک، گندگی، بیماری، اور پتھروں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ میرے بھائی رفتار کا میں بھی قائل ہوں۔ بشرطیکہ وہ ریل موٹر یا ہوائی جہاز میں ہو جب وہ دماغ کے اندر آجائے تو آدمی سوچ تو سو میل فی گھنٹہ ضرور سکتا ہے لیکن محسوس ایک گز فی سیکنڈ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں ہر کارخانے، فیکٹری اور ہر مل کے باہر گندے اور بوسیدہ کوارٹروں میں مدقوق چہرے ضرور ملیں گے۔ یہ "سوچ" ہی تھی جس نے ناگاساکی پر ایٹم بم گرایا تھا یہ احساس ہی ہے جو ناشپاتی کو ٹہنی پر لگے لگے میٹھا رس عطا کرتا ہے۔ ضرورت سوچنے کی نہیں۔---- سمجھنے اور محسوس کرنے کی ہے تم کہتے ہو یہ شعر و ادب بیکاری کی باتیں ہیں۔ آدمی کو پیسہ کمانا چاہئے کار اور بنگلہ بنانا چاہئے چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں ٹھیک ہے، یہ بھی زندگی گزارنے کا ایک ڈھنگ ہے میں آج سے پیسہ کمانے کی طرف اپنی تمام صلاحیتوں کا رخ موڑتا ہوں۔ بڑے بڑے افسروں کو ڈنر پر بلاتا ہوں۔ بوگس لائسنس ایشوع کرواتا ہوں۔ مال اسٹاک کرتا ہوں، بلیک کرواتا ہوں، پکڑا جاتا ہوں، رشوتیں دیتا ہوں، باعزت بری ہوتا ہوں۔ دن رات لین دین میں جٹا رہتا ہوں۔ سگریٹ، چائے اور شراب عام پینے لگتا ہوں۔ فروٹ سالٹ، ایسپرین اور کیلشیم کیپسولز اور نروز ٹانک کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیتا ہوں۔ اپنے دفتر میں قرآنی آیات کا قطعہ شیشے میں جڑوا کر لگواتا ہوں اور اس کے نیچے بیٹھ

کر ہر گاہک سے الگ الگ جھوٹ بولتا ہوں۔ ہر وزیر کی آمد پر اسے چائے پر بلاتا ہوں۔ نائٹ کلب میں بڑے بڑے افسروں کے ساتھ بیٹھ کر جواء کھیلتا ہوں اور رشوت کے طور پر جان بوجھ کر ہزاروں روپے ہار جاتا ہوں۔ اور ان سے لاکھوں کا فائدہ حاصل کرتا ہوں۔ اب میرے پاس ایک چھوڑ دو کاریں ہیں۔ ایک خوبصورت بنگلہ ہے شعر و ادب رخصت ہو چکے ہیں۔ ہر وقت فائیل بردوش دفتر دفتر کاریں گھومتا ہوں۔ دن میں دس ہزار آدمیوں سے ملتا ہوں۔ دس بارہ ڈبیاں سگریٹ کی پھونکتا ہوں جنھیں ناپسند کرتا ہوں ان کے ساتھ بیٹھ کر شراب بھی پیتا ہوں۔ جہاں ذرا سے ہنسنے کو بھی جی نہیں کرتا وہاں قہقہے لگاتا ہوں۔ بیوی بچوں کے پاس بیٹھا ہوتا ہوں تو دماغ کوئی نہ کوئی کاروباری الجھن حل کر رہا ہوتا ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو بستر پر پڑا شراب آلود خراٹے لے رہا ہوتا ہوں۔ چاند نکلتا ہے تو رومال نکال کر زور سے ناک صاف کرتا ہوں۔ گلاب کی خوشبو آتی ہے تو چھینکنے لگتا ہوں۔ کوئی گانا گائے تو نیند آنے لگتی ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ منہ اندھیرے نیم کی گھنیری شاخوں میں چڑیاں کس کے گیت گاتی ہیں۔ دوپہر کی گرمی میں آم کا پیڑ اور نہر کنارے کی جھاڑیاں کیسی مہک دیتی ہیں اور سردیوں کی نیلی دھوپ میں اڑنے والے سفید براق کبوتر کتنے بھلے لگتے ہیں کبھی اکیلا کسی پہاڑ پر چلا جاؤں تو بور ہو کر واپس آجاتا ہوں۔ دل ہر وقت ایک خوف، اضطراب، اور سراسیمگی میں مبتلا رہتا ہے۔ نوکروں کی تنخواہیں ہیں ان کے مطالبے ہیں، انکم ٹیکس والوں کے تقاضے ہیں۔ بنک والوں کے ریمانڈ آرہے ہیں۔ قیمتیں بڑھ رہی ہیں قیمتیں گھٹ رہی ہیں۔ مارکیٹ اپ ہو رہی ہے مارکیٹ ڈاؤن ہو رہی ہے۔ لاکھوں کا فائدہ ہونے والا ہے۔ لاکھوں کا نقصان ہونے کا ڈر ہے۔ نیند نہیں آرہی، گولیاں کھا رہا ہوں، اعصاب شل ہو رہے ہیں۔ چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ توند باہر نکل آئی ہے۔ چال بگڑ گئی ہے۔ جیب میں 555 کا ڈبہ ہے مگر تمباکو کے فلیور سے بے بہرہ ہو گیا ہوں۔ وہ کسی وقت ایک سگریٹ اور شام کو چائے پینے کا مزہ جاتا رہا ہے۔ بات کسی سے کرتا ہوں منہ کسی کا تکتا ہوں۔ ادھر فون کرتا ہوں اُدھر رجسٹر پر دستخط کرتا ہوں ہر وقت کی بناوٹی ہنسی اور جھوٹ سے خدوخال بگڑ گئے ہیں۔ ہر نقش پھیل کر، سمٹ کر، بدوضع ہو گیا ہے۔ آواز درشت اور لہجہ کرخت ہو گیا ہے۔ وہ نفاست، ذوق، خوشبو اور فلیور جاتا رہا ہے۔ اپنی ہی موٹر کا ایک پرزہ بن گیا ہوں چل رہا ہوں، چل رہا ہوں، چل رہا ہوں ------

نا میرے بھائی! یہ سودا بڑا مہنگا رہے گا۔

تم اپنی لمبی کار لے کر گزر جاؤ۔ مجھے گرتی بارش میں آم کے درختوں تلے پیدل ہی چلنے دو۔ اس طرح کم از کم بھوک لگتی ہے۔ خوشبو تو آتی ہے، نیند تو آتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمھارے کاروبار کو معیوب سمجھتا ہوں۔ اصل میں گاڑی وہاں جا کر رکتی ہے۔ جہاں آدمی پتھروں کی تجارت کرتے کرتے خود بھی پتھر ہو جاتا ہے۔ سوال کاروباری ذہنیت کا ہے جو یقیناً ہماری سوسائٹی کے لئے مضر ہے اور جس نے انسان کو منصف مزاجی، خوش ذوقی، صحت مندی اور انسانی ہمدردی سے محروم کر دیا ہے اور ہمارے ارد گرد مفلسی، بدحالی، خود غرضی اور بے غیرتی کا تعفن پھیلا دیا ہے۔ میرے نزدیک---- یا کم از کم مجھے سوائے تیز بھوک، جفاکش بدن، خشک روٹی، چشمے کے پانی، اور ایک صحت مند بیوی کے اور کچھ نہیں چاہیئے لیکن میری بدقسمتی سمجھ لو کہ میں شہر لاہور کا باشندہ ہوں۔ یہاں صرف خشک روٹی اور چشمے کے پانی میں گزارہ نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود میں اپنی ضروریات کو فطری حد تک محدود کر رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہوں۔ جو پیسہ کار خریدنے کے لئے جمع ہو سکتا ہے اسے میں اپنی بیگم کے ساتھ شیزان یا مرینا میں بیٹھ کر چائے پینے پر خرچ کر دیتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ ہاں ایک چھوٹا سا کاٹج بنانے کی آرزو ضرور ہے۔ اس موضوع پر ذرا آگے چل کر تم سے تبادلۂ خیالات کروں گا۔

بات اصل میں کراچی کی ہو رہی تھی میں تمھیں کہہ رہا تھا کہ کراچی بڑا HOPELESS شہر ہے تم وہاں رہ سکتے ہو مگر بھائی میرے لئے تو وہاں ایک دن بھی گزارنا مشکل ہے۔ رنگون میں کراچی سے زیادہ سڑکیں تھیں، کولمبو میں بھی سٹاک ایکس چینج کی عمارت تھی کلکتہ میں بھی مارکیٹیں اور کارخانے تھے۔ لیکن پیارے وہاں زندگی کا یہی ایک پہلو نہیں تھا۔ ان شہروں میں کارخانے بھی اور گہری سبز ساکن جھیلوں پر کھلے ہوئے تروتازہ کنول کے سرخ، زرد، سفید اور قرمزی پھول بھی تھے۔ سمندر کے کنارے جھکے جھکے مہک اڑاتے ناریل کے درخت ذرا سے ہوا کے جھونکے پر شرمیلی دلہن کی طرح شام سے گھونگھٹ کاڑھ لیتے تھے۔ ہر شہر کی اپنی ایک کلچرل حیثیت اور شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک کلاسیکل بیک گراؤنڈ، مختلف رنگ، خوشبوئیں، اور مدھر سُر ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ کراچی کے پیچھے سوائے کراچی کے اور کچھ نہیں۔

بھلا جس ساحل سمندر پر ناریل کے درخت نہ ہوں وہاں کیا مزا آئے گا۔ ایسا ساحل تو اس آنکھ کی طرح ہے جس کی پلکیں غائب ہوں۔ کراچی کے ننگے اور ویران سمندر کو دیکھ کر

مجھے بیکانیر کے خاک اڑاتے صحرا یاد آجاتے ہیں اور مصیبت یہ ہے کہ اب یہ خاک لاہور میں بھی پہنچ گئی ہے۔ یہاں بھی نئی نئی فلم کمپنیوں، امدادی کمیٹیوں اور امپورٹ ایکس پورٹ کے دفتر کھل گئے ہیں۔ یہاں بھی اب لوگ گھر سے ایک فائل بغل میں دبا کر نکلتے ہیں اور رات کو وہی فائل سرہانے رکھ کر سو جاتے ہیں۔ یہاں بھی عریاں، فحش رسالوں اور جاسوسی ناولوں کی بڑی کھپت ہے اب وہ HOW GREEN WAS MY VALLEY۔ مادام بوواری، اور جوگن جیسی فلموں کے دن ہوا ہو گئے۔ یہاں بھی اب لوگ سینما ہالوں میں نیم عریاں امریکی ایکٹرسوں کے کولہے اور چوری، ڈاکہ اور اغواء کے جدید طریقے دیکھنے جاتے ہیں۔ تم کسی دن اپنی بیوی کے ساتھ گھر سے شیزان تک پیدل چل کر دیکھ لو۔ تمہارے لئے یہ راستہ طے کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہر شخص یوں دیکھے گا جیسے تم اس کی بیوی کو لئے جارہے ہو۔ تم پر بڑے شرمناک آوازے کسے جائیں گے اور کوئی عجب نہیں کہ کسی نہ کسی طرف سے ایک آدھ پتھر بھی آ لگے۔ (ایسے وقت میں مارشل لاء کے دن بہت یاد آتے ہیں) ہمارے ہاں یہ ایک نیا طبقہ حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ یہ لوگ جب لاہور کی سڑکوں پر نکلتے ہیں تو ان کے نزدیک سوائے بوڑھی عورت کے اور کوئی عورت شریف زادی نہیں ہوتی۔ ان کا کام ان بھولی بھالی لڑکیوں کو سینما کے ٹکٹ دلوا دینے کے بہانے خراب کرنا ہوتا ہے جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر سے بہانہ بنا کر دوپہر کا شو دیکھنے آئی ہوتی ہیں میں ان بچیوں کو سینما سے منع نہیں کرتا اس لئے کہ یہ دور ہی سینما کا ہے۔ میں انھیں صرف یہی کہوں گا کہ جب اکیلی گھر سے باہر نکلیں تو بڑی خود اعتمادی کے ساتھ سینما جائیں اور خوش پوش غنڈوں سے چوکنی رہا کریں۔

اب لاہور کی بات چل نکلی ہے تو یہاں کے احوال بھی سن لو۔

میرے بھائی راوی کے اس پر اسرار شہر میں شعر و ادب کا تو مندا ہے، البتہ سیاست کی چاندی کٹ رہی ہے۔ سیاست سے میری مراد عوامی ایکسپلائٹیشن، سیاسی بازی گری اور پارٹی بازیاں اور جماعتی گٹھ جوڑ ہیں۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ میں نے سیاست میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ سیاسی جلسوں کو ہمیشہ تضیع اوقات سمجھتا رہا ہوں اور ان کی بجائے بچوں کو پارک میں کھیلتے ہوئے دیکھنا زیادہ پسند کیا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جن لوگوں کو ہم ووٹ دے کر قومی اسمبلیوں میں بھجواتے ہیں وہ یا تو وہاں پہنچتے ہی ہمیں بھول جاتے ہیں اور یا ذاتی مفادات کی خاطر ایسے ایسے بل منظور کروا دیتے ہیں جو پیر تسمہ پا کی طرح ہماری گردنوں

ڑھ بیٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری سیاست، روٹ پرمٹوں، امپورٹ لائسنسوں، زارتی گدیوں، کارخانوں، سینماؤں اور ہوٹلوں کی الاٹمنٹ کی سیاست ہے۔ اپنی ایک چھوٹی ی جماعت بنائی، اسمبلی کی کسی قرارداد کی حمایت یا مذمت کی، موچی دروازے کے باہر ایک لسہ کیا، دو تین قلابازیاں لگائیں، گلا پھاڑ پھاڑ کر قائد اعظم کے سنہری اصولوں کی یاد دہانی رائی، الفاظ کے کھوٹے سکوں کو اچھالا، اپنی جیب سے منگوائے ہوئے ہار گلے میں ڈالے، پنے ساتھیوں سے دو ایک فلک شگاف نعرے لگوائے اور کار میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ وسرے دن جس کی مخالفت کی تھی۔ اس سے ملے۔ ایک آدھ روٹ پرمٹ یا کسی کارخانے ں شرکت الاٹ کروائی اور مزے سے بیٹھ کر گپ بازی شروع کر دی چھوٹی سی کوٹھی کا پورشن بھی الاٹ ہو گیا، کارخانے میں دونی یا آنے کا حصہ بھی مل گیا۔ بال بچوں کا مستقبل ھی محفوظ ہو گیا، کافی ہاؤس کا خرچ بھی نکل گیا اور لیڈری بھی ہاتھ میں رہی۔

راوی کا یہ انوکھی آن بان والا شہر، جو کبھی علم و فضل کے شہرہ میں اپنا ثانی نہ رکھتا ھا اب رشوت خور افسروں، عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے نوجوانوں، ذخیرہ اندوزوں بلیک مارکیٹ کرنے والوں اور سودا باز سیاست دانوں کا شہر ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو میر ی طرح کوئی نہیں پوچھتا۔ اب یہاں بے عمل جماعتیں، شہرت پسند رہنما، فرقہ بندیاں، کاک ٹیل پارٹیاں اور بیکار کانفرنسیں ہیں۔ میرے نزدیک دھان کے کھیت میں بہنے والے پانی کی سرسراہٹ موچی دروازے کے باہر سٹیج پر چیخنے والے لیڈر کی آواز سے زیادہ خوبصورت اور دیرپا ہے اور کسی دیہاتی ندی پر لکڑی کے تختوں کا چھوٹا سا کمزور پل ان لیڈروں کے بلند بانگ دعووں اور وعدوں سے زیادہ مخلص، مضبوط اور سچا ہے۔

اب اجناس خوردنی کے چھوٹے تاجروں کی سن لو:

ان میں گنتی کے چند لوگ ایسے ہیں جو ایمانداری سے دھندا کرتے ہیں۔ بیشتر تعداد ان حضرات کی ہے جو روپے کے لالچ میں آکر گھی میں وائٹ آئیل، چائے میں کیکر کی چھال، رچوں میں پیسی ہوئی اینٹوں کا چونہ اور ہلدی میں بسنتی سُرمئی ملاتے ہیں۔ دودھ میں پانی ملانا تو عام بات ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں آج کل پانی کی جگہ دودھ ہی پیا کرتا ہوں۔ یہ لوگ بڑی اہمیت کے ساتھ انسانی زندگی سے کھیلتے ہیں۔ کیا ان کے جرائم اتنے سنگین نہیں ہیں کہ ان کے خلاف ارادۂ قتل کے الزام میں مقدمات چلائیں جائیں؟ اس دنیا میں یہ لوگ شائد بچ جائیں، لیکن جب کبھی خدا کی عدالت کا دربار لگا تو وہاں انھیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ وہاں جب

نامۂ ہائے اعمال کھول کر سامنے رکھ دیئے گئے تو خوف و دہشت سے ان کے سیاہ بال سفید ہو جائیں گے، حواس گم ہو جائیں گے اور زبانیں گنگ ہو جائیں گی۔ مگر اس بڑی عدالت کی ابھی کس کو پڑی ہے۔ بھائی! ابھی تو گھی میں مونگ پھلی کا تیل ملاؤ اور گلبرگ کی تمرڈ ایکسٹینشن سکیم میں کوٹھی بنواؤ۔

تم جانتے ہو کہ میرا کام اس ڈھب کا ہے کہ میں لاہور سے دور --- بہت دور اُفق کے اُس پار نہیں جا سکتا۔ ویسے بھی اس شہر سے مجھے محبت ہے اور اب خدا نے مجھے میری پسند کی ایک پیاری ذی فہم بیوی بھی دے دی ہے۔ چاہتا ہوں کہ ان پر شور اور تاریک گلیوں سے نکل کر شہر سے باہر ایک چھوٹا سا بھولا بھالا مکان بنوالوں اور اُس کا نام شانتی نکیتن رکھوں، جہاں شام کو جب میں اس صنعتی شہر کی میکانکی زندگی سے بھاگ کر داخل ہوں تو نیم کے خوشبودار پیڑ اپنی ٹہنیاں ہلا کر اور ننھی منی چڑیاں گیت گا کر میرا خیر مقدم کریں۔ گلبرگ اپنی پہنچ سے باہر ہے اور سمن آباد کی پہنچ میں میں نہیں ہوں۔ ماڈل ٹاؤن کے لئے کار ایک شرط ہے اور مسلم ٹاؤن پر فلمی بادل اڈر ہے ہیں۔ میری پسند کا لاہور میں صرف ایک ہی خطہ ہے اور وہاں ہر سال خیر سے سیلاب آ جاتا ہے۔ یہ علاقہ پسند اس لئے ہے کہ ادھر سے جب سورج نکلتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اُس سامنے والے کھیت کے کنارے سے طلوع ہو رہا ہو۔ اس کے برعکس مسلم ٹاؤن یا ماڈل ٹاؤن میں جب آفتاب نمودار ہوتا ہے تو وہ میکلوڈ روڈ اور گڑھی شاہو عبور کر کے آتا ہے اور اس کی کرنوں میں انجن دھواں اور سڑکوں کی گرد شامل ہوتی ہے۔ ادھر درختوں، کھیتوں اور باغوں کی بھرمار ہے بڑی خاموشی، بڑا سکون، بڑی تنہائی اور نیچرل خوشبوئیں ہیں۔ منہ اندھیرے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے، سہاگہ پھیرتے، دھان بوتے اور رہٹ چلاتے ملتے ہیں۔ شام کو چارہ کا کاٹ کر چھکڑوں میں لادا جا رہا ہوتا ہے۔ آسمان پر غروب آفتاب کی سنہری روشنی پھیلی ہوتی ہے اور طوطوں کی ٹولیاں واپس اپنے گھونسلوں کو جا رہی ہوتی ہیں۔ اپریل دنوں میں ہوا میں پھول پتی کی مہک بس جاتی ہے۔ ناخوں، آلوچوں اور شہتوت کے پیڑ پر ہری ہری کومل کومل پتیاں دھوپ میں مسکرایا کرتی ہیں۔ سر شام لیموں کے جھاڑوں تُرش، خوشبودار اندھیرا پھیل جاتا ہے اور پیپل اور بڑ کے گنجان درخت زیادہ گھنے اور زیادہ وقار محسوس ہونے لگتے ہیں۔ پھر جب سگریٹ سلگا کر کسی ندی کی پلیا پر بیٹھ جاؤ تو نیچر ہیبت ناک عظمت، الوہیت اور ابدیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور دنیا دار

کے جھنجھٹ بڑی بے حقیقت سی شے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہاں آم کے دو ایک درخت ہیں۔ ان سے میرا بڑا دوستانہ ہے۔ جب کبھی جاؤں تو بڑی خوشی سے ملتے ہیں۔ ہماری دوستی کو دس گیارہ سال گزر گئے ہیں اس دوران میں میرے کافی ہاؤس کے کئی دوست بدل گئے ہیں، مگر ان درختوں کی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ اسی جگہ ایک بڑے مختصر سے پرسکون مکان کا نقشہ میرے ذہن میں ہے۔ زمین بھی آسانی سے مل سکتی ہے۔ مگر سیلاب نہیں ٹلتا۔ ہر سال سود خوار پٹھان کی طرح آن حاضر ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں۔ تم انھیں جانتے ہو۔ آج کل نہروں کے پل بنانے کی ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ پچھلے سیلاب کے بعد مجھے ٹی ہاؤس میں ملے تو خیر خیریت پوچھنے کے بعد بولے:

"بھئی فلاں پل بنوا کر آ رہا ہوں۔ کل سے وہاں آمد و رفت شروع ہو رہی ہے۔ ویسے احتیاطاً تم لوگ ابھی ادھر کا سفر نہ کرنا۔"

تیسرے روز معلوم ہوا کہ پل پھر گر پڑا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسے ٹھیکیداروں کی موجودگی میں سیلاب کی بلا کیسے ٹل سکتی ہے اور میں ان پر شور اور گندی گلیوں سے کیونکر چھٹکارا حاصل کر سکتا ہوں۔ لیکن اب دل میں ٹھان لی ہے کہ انھیں درختوں کے پاس جا کر رہوں گا۔ سیلاب آتا ہے تو آئے۔ بقول اقبال ---

عشق خود سیلاب ہے، سیلاب کو لیتا ہے تھام

برسات میں ایک بار سیلاب کا پانی عبور کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ ساری عمر ہجوم سڑکوں کے بے ہنگم شور اور متعفن گلیوں کے جہنم میں بسر کرنے کے بعد ایک صورت، کند ذہن اور اعصابی مریض کی موت مروں۔ اگر حکومت کو ہمارا خیال نہیں، نہ ہی۔ ٹھیکیدار بے ایمان ہیں، ہوں، سیلاب آتا ہے، آئے، لیکن گرمیوں کی دوپہروں میں نیا تو کھلے گا۔ آموں پر میٹھا رس دار بور تو آئے گا۔ لیموں اور شہتوت کی خوشبو تو اُڑے گی۔ سرما کی دھندلی صبحوں میں کچنار کے کھیتوں پر دھند تو پھیلے گی اور صبح دم روشن، سرخ، زیں اور دہکتے سورج سے مصافحہ تو ہو گا اور راتوں کو ٹھنڈے نیلے چاند سے ملاقات تو ہو گی۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلیں گے ہی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بلک سایہ دار شفاف پانی والی ندی بھی تو چلے۔ جب زندگی کے مسائل کا ساتھ دیا ہے تو ان شفاف چمکیلی ندیوں سے کیوں محروم رہیں۔ یہ سچ ہے کہ تم کسی گھر کی چھت اٹھا کر اندر

جھانکو، تمھیں وہاں کم از کم سات ہستیاں ضرور الجھنوں میں گرفتار نظر آئیں گی۔ اس کے ساتھ ہی میں چاہتا ہوں کہ تم کسی گھر کا عقبی دروازہ کھول کر دیکھو تو تمھیں وہاں کم از کم ایک آلوچے کا پیڑ بھی ضرور ملے، جس پر سفید شگوفے پھوٹ رہے ہوں اور جن کی شیریں مہک بھونروں کو اپنی طرف بلا رہی ہو۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہاں مسئلوں کا انبار جمع ہو گیا ہے مگر گلاب کی ایک کلی بھی کہیں نہیں پھوٹتی۔ لوگ اس بے حس، بے رنگ اور تنگ و تاریک زندگی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اگر کبھی ان سے آسم، چنار یا چیڑھ کے درخت کی بات کی جائے تو وہ پوچھتے ہیں:

"کیا آپ محکمہ جنگلات کے دفتر میں ہیں؟"

انھیں بھوک، روزی اور حصول معاش کے ایک ایسے لامتناہی چکر میں پھنسا دیا گیا ہے کہ انھیں اتنا ہوش ہی نہیں کہ وہ اپنے سرد چہروں پر سورج کی کرنوں کو محسوس کر سکیں۔ جو لوگ اس چکر سے بے نیاز ہیں ان میں اتنا ذوق ہی نہیں رہا کہ وہ کاغذی اور اصلی پھولوں میں تمیز کر سکیں۔ ان کے نزدیک عطر حنا کی شیشی اور السی کے تیل کی بوتل میں کوئی فرق نہیں۔ وہ راگ مالکونس کے سروں پر بھی اسی طرح سر ہلائیں گے جس طرح گدھے کی چیخ و پکار پر سر ہلاتے ہیں۔ باقی رہے تھوڑے سے وہ لوگ جو ضرورت کے مطابق روزی بھی کماتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ذوق اور وجدان کی پرورش بھی کرنا چاہتے ہیں۔ سو میرے بھائی! انھیں سیلاب چین نہیں لینے دیتا اور یوں وہ شانتی نکتین کا خواب سینے سے لگائے تاریک گلیوں میں دفن ہیں۔ لیکن شائد وہ دن دور نہیں جب یہ بد نصیب لوگ بھی اپنے تاریک مدفنوں سے باہر نکلیں گے اور دیکھیں گے کہ سورج وسط آسمان میں درخشندہ ہے اور سائے ان کے پاؤں تلے سمٹ آئے ہیں اور ہر طرف ہریاول ہی ہریاول ہے اور آسم کے جھنڈ تلے ایک معصوم صورت بوڑھا چارپائی پر بیٹھا بچوں کو اگلے وقتوں کی داستان سنا رہا ہے۔ اور درخت کی شاخ پر طوطے کا پنجرہ ہے اور رہٹ میں سے پانی ---- شفاف پانی اچھل اچھل کر بنجر زمینوں کو سیراب کر رہا ہے۔ پھر کوئی ٹھیکے دار سائیفن میں سیمنٹ کی جگہ ریت اور پٹ سن کی جگہ پرالی نہیں ڈالے گا۔ کوئی تاجر گھی میں وائٹ آئل اور مرچوں میں سُرخی نہیں ملائے گا اور کبھی کوئی سیلاب نہیں آئے گا وہ محبت، یگانگت، امن اور ملاپ کا دور ہو گا۔ ابھی تو فراق، انتشار اور ویوگ ہی ویوگ ہے بقولِ مولانا روم: بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

اپنا اگلا خط تمھیں اپنے شانتی نکتین سے لکھوں۔

طوفانی رات کے ملّاح

منٹگمری روڈ پر ایک نوجوان چلتے چلتے اچانک گر پڑا۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ ایک آدمی قریب ہی ڈور کو مسالہ لگا رہا تھا وہ بھی دوڑا۔ ہم نے اسے فٹ پاتھ پر سے اٹھایا۔ جس جگہ وہ گرا تھا وہاں پیپل کے زرد پتے بچھے ہوئے تھے۔ اس نوجوان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کمزور چہرے پر نقاہت تھی۔ پرانا سا کوٹ اور ملیشئے کی میلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ بغل میں رجسٹر اور کاپی تھی اور انگلیوں میں سگریٹ کا ٹکڑا جل رہا تھا۔ قمیض کی جیب میں سے کنگ سٹارک کی ڈبی جھانک رہی تھی۔ سر کے بال کہیں کہیں سفید ہو رہے تھے اور پھٹے ہوئے جوتوں پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ کہیں دور سے پیدل آ رہا ہے۔ جسم دبلا تھا اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ ڈور لگانے والے نے کہا۔ "بخار سے بابو کا بدن تپ رہا ہے۔" وہ نوجوان نحیف آواز میں کہنے لگا۔ "میں رام گلی میں رہتا ہوں۔ چکر سا آ گیا تھا۔ آپ لوگوں کو تکلیف ہوئی۔" ہم نے اسے تانگے میں سوار کروایا۔ میں اسے سنبھالا دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگہ میوہ منڈی کی طرف چل پڑا۔

میں اس روز بڑے رومانٹک موڈ میں تھا اور یہ ارادہ کر کے گھر سے نکلا تھا کہ پہلے لارنس میں سویٹ پنیر کے پھولوں کی بہار دیکھیں گے اور پھر اوپن ائیر کے کسی پر سکون گنجان درخت کے سائے میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جس وقت یہ رومانٹک ارادے باندھ رہا تھا ایک دبلا پتلا چھوٹے بہن بھائیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا غم کا مارا ہوا نوجوان نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹکتا، اچھرہ سے رام گلی پیدل چلا آ رہا ہو گا۔ بخار سے اس کا بدن تپ رہا ہو گا۔ سڑکوں کی خاک اڑ اڑ کر اس کے جوتوں پر پڑ رہی ہو گی اور دھوپ میں اس کا کمزور چہرہ مرجھا رہا ہو گا۔ لیکن اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو سوائے اس کے اور کیا کر سکتا تھا کہ اس نوجوان کو اٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آتا۔

چنانچہ میں اسے رام گلی لے گیا۔ وہاں اس کی ماں تھی، جوان چھوٹی بہنیں تھیں اور ایک کم عمر بھائی تھا اور ایک بوسیدہ مکان کا اندھیرا کمرہ تھا۔ جس میں دو چار پائیوں پر گندے مندے بستر ڈھیر تھے۔ چھت کی کڑیاں خستہ حال تھیں اور جالے لٹک رہے تھے۔

ایک بہن ڈیوڑھی میں انگیٹھی رکھے آگ جلا رہی تھی اور کمرے میں دھواں بھرا تھا۔ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بوڑھی عورت نے آنکھوں پر پلو رکھ لیا۔ بہنیں بھائی سے لپٹ گئیں۔ معلوم ہوا رات سے اسے بخار تھا۔ لیکن اچھرہ کی ایک آئس فیکٹری میں نوکری کی امید تھی اور گھر میں کئی دنوں سے کچھ نہ پکا تھا۔ صرف ادھار کے دودھ سے بنی ہوئی چائے اور تنور کی روٹیوں پر گزارہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ بخار کے باوجود اچھرہ کی جانب چل پڑا اور جا کر آئس فیکٹری کے بینچ پر بیٹھ گیا۔ مگر اس سے پہلے مینجر کے سالے کا ایک دوست وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نوجوان نے کنگ سٹارک کا سگریٹ جلایا۔ آدھا بینچ پر بیٹھ کر پیا باقی بجھا کر جیب میں رکھا اور اپنے میٹرک کی سند والا رجسٹر بغل میں دبا وہاں سے پیدل رام گلی کی طرف چل پڑا اور کئی بسوں، کئی تانگوں، کئی کاروں، کئی لوگوں، کئی گدھوں گھوڑوں اور گندے نالوں اور سبز بیلوں میں چھپی ہوئی ٹھنڈی کوٹھیوں کو پیچھے چھوڑتا آہستہ آہستہ چلتا رہا، چلتا رہا--- یہاں تک کہ منٹگمری روڈ پر پہنچ کر گر پڑا۔

ٹھیک اسی وقت اسمبلی ہال کے باہر دس دس فٹ لمبی نئی کاروں کے درمیان سپاہی پہرہ دے رہے تھے اور اندر مطالبات زر پر بحث ہو رہی تھی اور وائی ایم سی اے ہال میں ادبی جمود پر مقالہ پڑھا جا رہا تھا اور ایک کالج کے پنڈال میں کالج کی انجمن کو نئی کاریں خریدنے، نئی کوٹھیاں بنوانے، لائبریری کے لئے جاسوسی ناول خریدنے اور کالج کی مسجد کے گنبدوں پر سونے کا غلاف چڑھانے کے لئے دس لاکھ کی گرانٹ دی جا رہی تھی اور ایک آدمی طرہ نکالے سٹیج پر کھڑا کہہ رہا تھا۔ میں دس لاکھ روپیہ کالج کو دیتا ہوں اور کیپسٹن کی ڈبی پندرہ آنے کی کرتا ہوں اور ٹریٹ کا بلیڈ دو آنے کا کرتا ہوں۔ پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا، طرہ جھوم رہا تھا اور فرط مسرت سے قراقلی کی ٹوپیاں ہوا میں اچھالی جا رہی تھیں۔

میں نے کافی ہاؤس میں بیٹھ کر قوم کی فکر میں چکن سینڈوچز کھانے والے ایک لیڈر سے کہا۔

"کل شام ایک نوجوان سڑک پر چلتے چلتے گر پڑا---"

اس نے سنہری فریم والی موٹی عینک اتار کر میز پر رکھی۔ سگار سلگا کر دانتوں میں دبایا مال روڈ کی لانڈری میں دھلے ہوئے نیلے سوٹ پر سے کافی کے ایک داغ کو رومال سے رگڑا اور سفید بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا:

"کیا کہا؟ کل شام کو؟ ------ خوب اور آج شام ہماری پارٹی موچی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کر رہی ہے۔ اس جلسہ میں ہم یہ قرارداد بھی منظور کروائیں گے کہ حکومت سڑکوں کی دونوں جانب فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ لوہے کے جنگلے لگائے تاکہ اگر کوئی آدمی اچانک چلتے چلتے گر پڑے تو جنگلے اسے تھام لیں۔ کیا خیال ہے؟" میں نے خوش ہو کر لیڈر کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ وہ نوجوان دو روز سے بھوکا تھا اور اسے نوکری نہیں مل رہی اور ------ میرے لیڈر دوست نے فرائڈ فش کا ایک قتلہ کاٹ کر اسے بڑی نفاست سے کانٹے کے ساتھ اٹھا کر پتلے سلائیس پر رکھا اور بولا:

"بھوک ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جب تک زرعی اصلاحات نافذ نہیں ہوتیں یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ایڈم سمتھ نے بھی اپنی کتاب میں ------"

میں نے کہا اور کنگ سٹارک کی ڈبی پہلے ڈھائی آنے میں ملتی تھی اور اب چھ آنے میں ہو گئی ہے اور اس نوجوان کی جیب میں کنگ سٹارک کی ------

لیڈر نے اپنے سگار کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اس کی قیمت بھی دگنی ہو گئی ہے۔ فکر نہ کرو، اگلی اتوار کو موچی دروازے کے باہر مہنگائی پر بھی ایک جلسہ کرا دیں گے۔ ہم تو حکومت کو چین نہیں لینے دیں گے----"

میں نے کہا اور اس نوجوان کی جوان بہنیں ہیں اور زمانہ بڑا نازک ہے اور بھوک بڑی بری بلا ہے۔ لیڈر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے چھری کانٹا پلیٹ میں رکھا۔ جیب سے خوشبودار رومال نکالا اور اسے آنکھوں پر پھیلایا اور سر جھکا کر رونے لگے۔ پھر غسل خانے میں جا کر ناک صاف کی۔ منہ دھویا، بالوں میں کنگھی کی اور میز پر آکر پھر مچھلی کھانے میں مشغول ہو گئے اور کہنے لگے۔

"معاف کرنا دوست! میرا دل بڑا نازک ہے۔ ذرا سا صدمہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پچھلے سال جب میں آل ورلڈ کانفرنس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے منیلا گیا تو وہاں سے ایک ہزار روپے کا کپڑا، پارکر پن، ریشمی پردے، بستر کی سلکی چادریں، اور بڑے بڑے طلسمی رنگوں کے سلیپنگ گاؤن خریدے، خالص چینی مٹی کا ایک پرانا گلدان بھی خریدا، یہ گلدان مجھے بڑا عزیز تھا۔ سنگاپور کے ہوائی اڈے پر اچانک ٹوٹ گیا۔ بس پھر کیا تھا میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور میرے ساتھی مجھے حوصلہ دے رہے تھے کہ فکر نہ کرو۔ اگلی مرتبہ

کانفرنس منیلا میں ہی ہو رہی ہے، پھر خرید لیں گے۔ مگر جانتے ہو میرا دل بڑا نازک ہے اور ---- تم نے کیا کہا تھا اس نوجوان کی جوان بہنیں بھی ہیں؟ اور انھوں نے کل سے کچھ نہیں کھایا؟ آہ!------"

انھوں نے ایک بار پھر جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھا۔ جی بھر کر روئے اور غسل خانے میں ناک صاف کرنے، منہ دھونے اور بالوں میں کنگھی کرنے چلے گئے۔

میں وہاں سے اٹھ کر ایک ایم این اے کے پاس آ گیا۔ ان کے سر پر بڑا سا پگڑ بندھا تھا۔ داڑھی مونچھوں میں مہندی لگی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگا تھا۔ توند میز کے ساتھ لگی تھی، نوکر پاؤں دبا رہا تھا اور آپ اس وقت مرغ پلاؤ کھا رہے تھے۔ میں نے کہا۔

جناب! رام گلی کے ایک گھر میں دو روز سے کچھ نہیں پکا اور جناب وہاں ایک بوڑھی ماں رہتی ہیں اور دو جوان بہنیں اور--

ایم این اے نے مرغ کی ٹانگ خوفناک انداز میں چباتے ہوئے میری طرف سانپ ایسی لال آنکھوں سے دیکھا اور کہا جوان لڑکیوں کو گاؤں ہمارے گھر بھجوا دو، وہاں کام کاج کریں گی اور ہم رام گلی میں دانوں کی بوریاں ڈلوا دیں گے۔ میں نے کہا جناب آپ اسمبلی میں سوال اٹھائیں کہ------

"سوال اٹھائیں؟ میرے سائیں پہلے ہم مہر اللہ بخش کو کرسی پر سے تو اٹھوا لیں۔"

اور اتنا کہہ کر انھوں نے لسی کا جگ اٹھایا اور ڈنگروں کی طرح چڑھا گئے۔ پھر میں نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی اس نے اپنی ٹانگیں کھجلاتے ہوئے ہوا میں ہاتھ ہلا کر اور طوطے کی طرح گردن ماری اور کہا:

"لیکن ہم لکھیں کس پر؟ نیوز پرنٹ کے کوٹے سے تو بمشکل کار کے پٹرول، کوٹھی کی دیکھ بھال، نوکروں کی تنخواہوں اور زہرہ جان رنگ پور والی کے مُجروں کا ہی خرچ چلتا ہے۔ ہاں سردار قلاباز خان اگر وزیر ہو گئے تو پھر انشاء اللہ ایک اخبار آرٹ پیپر پر چھاپیں گے اور پھر مزا آئے گا لکھنے کا۔"

اس کے بعد آپ نے ایک زوردار ڈکار لی۔ رولکس کی سنہری گھڑی میں وقت دیکھا اور بیرے سے کہا "ذرا دیکھو تو وہ الو کا پٹھا گاڑی لے کر آ گیا ہے۔"

ساتھ والی میز پر ایک سابق وزیر تھری کاسل کا ڈبہ سامنے رکھے اپنے ساتھیوں سے ہم

کلام تھے۔ وہ بار بار جوش میں آ کر مکا میز پر مارتے اور کہتے۔ "ذیلی انتخابات کی فہرستیں ہم نے گم کروائیں۔ سلک یارن کا لائسنس لے کر دیا، ٹیکس معاف کروایا، بلیک کا مقدمہ خارج کروایا، نئے روٹ پرمٹ ایشوع کروا کر دیئے، اس کے بھانجے کے لئے سلیکشن کمیٹی کا اجلاس اگلے سال پر ملتوی کروایا تاکہ وہ بھانجہ صاحب ولائت سے ڈگری لے کر آ جائیں یہاں تک کہ اس کی خاطر ایک ایک ووٹر کو پانچ پانچ ہزار کی رقم پلے سے دی، مگر اس احسان فراموش نے کرسی سنبھالتے ہی ہماری ٹانگ کھینچ لی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے بھی کل لابی میں نواب اسفند یار قلاقندی کو کہہ دیا کہ اگر ہماری پارٹی کو کرسی نہ ملی تو اندھیر نگری کا ایک بھی ووٹ انھیں نہ ملے گا-----"

تیسری میز پر مصوری کے جدید ترین بلکہ آنے والے سکول کے پرستار ایک پینٹر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان میز پر کافی کی پیالیوں اور پلیٹوں میں سگرٹوں کے ٹکڑے بجھے ہوئے تھے۔ خالی ڈبیوں پر عجیب عجیب لکیریں بنی ہوئی تھیں پینٹر صاحب مٹی کی پائپ میں دیسی تمباکو پی رہے تھے اور بار بار اسے اپنے میلے کوٹ سے رگڑ رہے تھے۔ میں بھی ان میں جا کر شریک ہو گیا۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے رام گلی والے کنبے کا ذکر چھیڑ دیا۔ پینٹر نے پائپ کوٹ کی آستین سے رگڑ کر کہا۔ "بھوک کا رنگ گرے اور یلو کے امتزاج سے بنتا ہے اور جب اوپر سے ایک خط عمود کی طرح گر کر نیچے کی تکون کو چھوتا ہے تو یہ رنگ گہرا وائیٹ ہو کر ماربڈ ہو جاتا ہے اور اسی طرح ہم بھوکے آدمی کو تین لکیروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی لکیر اس کی خوشبو ہے۔ دوسری کالی چڑیل ہے اور تیسری بجھا ہوا سگریٹ ہے۔ یوں جب اس کی خوشبو اور کالی چڑیل اور بجھا ہوا سگریٹ زمین کی کوکھ سے ہجرت کا تلک لگا کر تجریدی مستطیل کا بے ہنگم سا ثبوت وضع کرتا ہوا کائنات کی ازلی ہیئت اور مادہ کی تشکیلِ عنصری سے گریز کر کے ناخن کے چاند پر سایہ ڈالتا ہوا بچھو کا ڈنک بنتا ہے تو چوتھی لکیر جنم لیتی ہے اور یہ نئی لکیر تیسری چڑیل کے ناک کا بال اکھیڑ کر ایک لال آنکھ بن کر کوئلے کی ہڈی میں پیوست ہو جاتی ہے اور ہڈی کا جادوگر اپنا منتر پھونکتا ہے اور کالی بلی نیلے رنگ کا کبوتر کھا جاتی ہے اور یوں بھوک ایک ساتواں رنگ جنم دیتی ہے۔ جس کی ہیئت کثرتِ استلذاذ سے حواس باختہ ہو کر پھر تکونی مستطیل کا مُربع بناتی ہے اور------"

اور اُس مستطیل کے مربع بنانے سے پہلے ہی میں نے فرطِ عقیدت سے پینٹر صاحب کے سر پر ہاتھ پھیرا، ان کے حق میں دعا مانگی اور باہر نکل آیا۔

وہاں سے میں سیدھا رام گلی والے کنبے کے ہاں پہنچا۔ بوڑھی عورت دروازے کے پاس چپ چاپ بت بنی بیٹھی پھٹے ہوئے بوریئے میں سے باہر تک رہی تھی۔ دونوں جوان بہنیں ایک نمدا سے لحاف کو فرش پر پھیلائے اسے پیوند لگا رہی تھیں اور ان کا دبلا پتلا کمزور سا نوجوان بھائی ایک پرانی کرسی پر بیٹھا موم بتی جلائے رجسٹر پر قلم سے کچھ لکھ رہا تھا۔ شاید کسی اور فیکٹری یا دفتر کے لئے کوئی درخواست۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور منٹگمری روڈ پر پیپل کے اسی درخت کے نیچے آ گیا جس کے سائے میں زرد پتوں پر وہ چکرا کر گر پڑا تھا۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر اسے دیا اور دیا سلائی جلاتے ہوئے کہا میرے بھائی! میں نے تمہاری کہانی ملک طرہ دراز، خان قلاباز خان، مہر اللہ بخش لنگر، شیخ نیوز پرنٹ بلیکی، مسٹر معین الدین منیلا والے اور مسٹر مستطیل محمود عمودی پینٹر سے پوری تفصیل سے بیان کی۔ انھوں نے بڑے انہماک اور بڑی ہمدردی سے اسے سنا اور تمہاری ماں بہنوں کے حال پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ ملک طرہ دراز نے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارے کمرے کا کرایہ بڑھانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ مسٹر منیلا والے نے کہا ہے کہ وہ آج شام کے جلسے میں ایک قرار داد کے ذریعے حکومت پر زور ڈالیں گے کہ وہ سڑکوں کے ساتھ ساتھ جنگلے لگائے مسٹر عمودی پینٹر نے تمہیں تین لکیروں میں تقسیم کرتے ہوئے تمہاری تصویر بنانے کا عہد کیا ہے شیخ نیوز پرنٹ بلیکی نے بڑے اعتماد سے کہا ہے کہ آرٹ پیپر کا کوٹہ ملتے ہی وہ نئی کوٹھی کا سودا کرنے کے بعد بھوک پر ایک اور اداریہ ضرور لکھیں گے اور مہر اللہ بخش نے پیش کش کی ہے کہ تم اپنی دونوں بہنوں کو ان کے گاؤں کام کاج کے لئے بھجوا دو۔ اس کے عوض وہ تمہارے گھر اناج کی دو بوریاں ڈلوا دیں گے۔ ایک اور صاحب کا مشورہ ہے کہ تمہاری دونوں بہنیں جوان ہونے کے علاوہ خوبصورت بھی ہیں ان میں سے ایک بہن کو تم ان کی نئی فلم میں ایکٹریس بننے کے لئے بھجوا دو۔ گاڑی اسے رام گلی سے لے جایا کرے گی اور وہیں چھوڑ آیا کرے گی اور دوسری جو ذرا کم خوبصورت ہے مگر جوان ہے ان کے ہوٹل میں ہفتے میں دو ایک بار شام کو یونہی بھیج دیا کرو اس طرح ایک تو انھیں ذرا تازہ اور کھلی فضا ملے گی اور دوسرے تمہیں بھی کنگ سٹارک کے سگرٹوں اور نوکری کی دربدری سے

نجات مل جائے گی۔ پھر تم آرام سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر گھر میں بیٹھنا۔ بہترین کپڑے پہننا۔ بہترین سگریٹ، کافی، شراب، اور مرغ اڑانا، کاروں میں سیر کرنا، اور بہن کے ساتھ اکڑ اکڑ کر فلموں کے دفتروں اور سٹوڈیوز میں پھرنا۔ پھر کبھی تمہیں اچھرہ آئس فیکٹری سے رام گلی پیدل نہیں آنا پڑے گا۔ پھر کبھی تمہاری جیب میں کنگ سٹارک کی ڈبی نہ ہو گی، پھر کبھی تمہارے جوتوں پر سڑکوں کی مٹی نہ جمے گی۔ پھر کبھی تمہارا سر نہ چکرائے گا اور پھر کبھی تم منٹگمری روڈ پر نہ گرو گے اور پھر -----

دبلے چہرے والے نوجوان کے خشک ہونٹ ذرا سے کپکپائے۔ اس کا سر ایک طرف کو جھکا، ہونٹوں کے پاس ایک گہری عمیق، تاریک، ویران سی خاک اڑانے والی لکیر نمودار ہوئی اور اس کا چہرہ دھندلا ہوتا گیا، دھندلا ہوتا گیا، اور پیچھے ہٹتا گیا، پیچھے ہٹتا گیا، اور غائب ہو گیا اور پھر خشک ہوائیں فٹ پاتھ کے زرد پتوں کو اڑا لے گئیں ----

باغ جناح کی ایک دوپہر

چڑیا گھر کے اندر نیوزی لینڈ کے لُدڑوں اور شیر بنگال کے پنجرے کے عقبی گھاس کے میدان میں لوکاٹ کا ایک اکیلا مسکین صورت پیڑ چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی ہری ہری شاخوں میں سیندوری رنگ کے لوکاٹوں کا ایک گچھا تیسرے پہر کے حبس میں گرم گرم خوشبو چھوڑ رہا تھا۔ اس کے سامنے لکڑی کے تخت جوڑ کر سٹیج بنایا گیا تھا اور آگے گھاس پر دری بچھی تھی اور دری کے کنارے کنارے رنگیلی نواڑ کی جدید آرام کرسیوں کی تین چار قطاریں سج رہی تھیں۔ املتاس کے درختوں تلے آئس کریم سوڈا لیمن، کینڈی اور برف کے بکسے میزوں پر پڑے تھے۔ پاس ہی گیس کی ٹینکی میں سے ایک نوعمر کالا سا لڑکا غبارے بھر رہا تھا۔ تین چار خوش لباس کٹے ہوئے بالوں والی کچھ پنجابی کچھ انگریز، لڑکیاں برش لے کر غباروں پر مسخروں کے ناک نقشے بنا رہی تھیں۔

چڑیا گھر کے باہر لاہور کے انگریزی سکولوں کی ذاتی بسوں میں سے اجلے کپڑوں اور اجلے چہروں والے بچے قطار اندر قطار اتر کر چڑیا گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ بچے اپنے نوکروں اور خاداؤں کے ساتھ کاروں میں آئے تھے۔ وہ کسی ہوئی سفید نیکروں پر رنگ برنگ پٹیاں باندھے، ماتھے پر آئے ہوئے سنہری بالوں کو جھٹک جھٹک کر پیچھے ہٹاتے خوشی سے سیٹیاں بجاتے ایک دوسرے کو بلا رہے تھے۔

چڑیا گھر میں آج لاہور کی "سوشل" خواتین کی جانب سے ان بچوں کو سالانہ تفریحی پروگرام میں مدعو کیا گیا تھا۔ منتظم خواتین اور اونچے طبقے کے سکولوں کی کچھ معمر اُستانیاں لان میں گھوم پھر کر چھوٹے چھوٹے کام جلدی جلدی کر رہی تھیں۔ کوئی مائیکروفون کو پھونک مار کر دیکھتی کہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ کوئی کسی بچی کو نظم یاد کرا رہی تھی۔ تو کسی نے سوڈا لیمن والے بکسوں کی دیکھ بھال کا کام اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ اب بچے بے ترتیب قطاروں میں لان میں داخل ہو کر دری پر بیٹھنے لگے تھے۔ باغ میں گرمی اور حبس سا تھا اور فضا میں گیلی گھاس کی مرطوب بو میں غباروں کی گیس کی بو گھل مل رہی تھی۔ آموں پر بور آرہا تھا۔ چنانچہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد باغ جناح کی طرف سے کسی دل جلی کوئل کی کوک سنائی دے جاتی۔

بچوں نے اب دری اور لان کے گھاس پر اودھم مچانا شروع کر دیا تھا اور اُستانیاں انہیں بڑے پیار سے ڈسپلن میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک گول گپاسی بچی بڑے معصوم اور کسی قدر متفکرانہ انداز میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھی ان کھیل تماشوں کو بے اعتنائی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ یا تو اداس ہے یا پھر گھر سے اتنے لڈو پیڑے کھا کر آئی ہے کہ اب ہلا نہیں جاتا۔ آہنی جنگلے کے اس طرف ایک جمعدار لُدڑوں کے چہ بچے کا گندا پانی نکال رہا تھا۔ اور لُدڑ نوکیلے دانتوں والے چھوٹے چھوٹے منہ کھولے چیخ رہے تھے۔

پانچ بجے کے قریب بچوں کا تفریحی پروگرام شروع ہوا۔ لوکاٹ کے درخت تلے رکھے ہوئے گراموفون پر بچوں کو ایک فلمی ریکارڈ بجا کر سنایا گیا۔

اس دنیا میں سب چور چور
کوئی چھوٹا چور کوئی بڑا چور

چھوٹے بڑے سبھی بچوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر ریکارڈ کا خیر مقدم کیا۔

اب رضیہ آپا گرمی میں ایک ہاتھ سے برابر پنکھا کرتی ہوئی سٹیج کے کونے پر آن بیٹھیں اور مائیک کے پاس منہ لے جا کر انھوں نے ایک نظم گا کر سنائی۔ بچوں نے اس نظم کے ہر بند کو ساتھ ساتھ گایا۔

بچوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ گول گپاسی پیاری بچی ابھی تک کرسی پر بیٹھی تھی۔ جمعداروں کے دو نٹ کھٹ لڑکوں نے جو یہاں یہ کھیل تماشے دیکھے تو حیران رہ گئے۔ بڑے لڑکے نے اپنی پھٹی ہوئی میلی نیکر کو اوپر اٹھاتے ہوئے چھوٹے لڑکے سے کہا:

"شوٹنگ لگا کر گھر جا اور جھنو، منو کو بلا لا۔ کہنا یہاں ڈرامہ ہو رہا ہے۔ بھاگ کے آجاؤ۔"

کالے بھجنگ چھوٹے لڑکے نے صرف میلی لنگوٹی پہن رکھی تھی۔ بڑے بھائی کا آرڈر سن کر اس نے ران پر پہلوانوں کی طرح تھاپی مار کر شوٹنگ لگائی اور چھلاوے کی طرح درختوں میں گم ہو گیا۔

اب سٹیج پر گرین ووڈ کالج کی ایک پیاری بچی ایک فلمی دھن پر ناچ پیش کر رہی تھی۔ وہ خوش رنگ تتلی کی طرح سٹیج پر چہک رہی تھی۔ اس کا ہر نرت لے میں تھا اور پاؤں کی ہر تھاپ تال پر پوری اتر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اس نے یہ رقص بڑی محنت اور شوق سے سیکھا

تھا۔

رقص کے بعد ایک مداری صاحب سٹیج پر تشریف لائے۔ ان کا سیاہ کوٹ تمغوں سے لدا ہوا تھا۔ انھوں نے پہلے ہتھیلی پر چھڑی جمانے کا کھیل دکھایا۔ تاش کے کرتب دکھلائے، پھر ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکے کو سٹیج پر بلایا اور بولے۔

"خدا میرے صاحبوں کا رتبہ بلند کرے۔ کوئی بچہ ---- بڑا کرارا سا بچہ ذرا کھڑا ہو کر ان بابو کا نام تو پوچھے۔"

ایک تمن مُتھنا بچہ پسینے سے بھرا ہوا لال منہ لے کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سبحان اللہ بڑی کراری آواز ہے میرے بابو کی، ہاں ذرا ایک بار پھر پوچھو کسی نے سنا، کسی نے نہیں سنا،"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

سٹیج پر کھڑے لڑکے نے کہا:

"محمود احمد۔"

مداری نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دیئے۔

"ہشت ----- جائے راجہ بھوج اور اس کا بھان متی کا کنبہ۔ رہ جائے شیر افگن میرا ہنچ پیر سچا جس کے نام پر بہے دریا، یا علی مدد! مولا علیؑ مشکل کشا ----"

مداری نے لڑکے کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"فرزریٹ ہو جا اور چل چل چنبیلی باغ میں حلوہ کھلائیں گے۔ لو میرے بابوجی! رتبہ بلند ہو۔ ذرا اب ان سے نام پوچھیں۔"

تمن متھنے لڑکے نے گردن ٹیڑھی کر کے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

اور سٹیج پر کھڑا محمود احمد بولا:

"رام سنگھ"

بچے دم بخود رہ گئے۔ ایک بھولی بھالی بچی بابل کی شہزادیوں کی طرح بال بنا کر آئی تھی وہ ہنس پڑی۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی پر خور گول گپا سی بچی آنکھیں کھول کر ٹکر ٹکر مداری کو

دیکھنے لگی۔ استانیاں حیران اور خوش ہو کر ایک دوسری سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔

"مسمریزم ہے۔"

"ونڈر فل ٹرک۔"

مداری نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہشت - جائے راجہ بھوج اور اس کا بھان متی کا کنبہ - پیر میرا سچا ڈالے مٹی میں جان، کھائے محمود احمد پان - چلا جا رام سنگھ جدھر سے آیا ادھر کو - فرزریٹ - لو میرے بابو اب پوچھو نام -

"تمہارا نام"

"محمود احمد"

لان تالیوں سے گونج اٹھا۔ بچے اور بچیاں مداری کے اس دلچسپ کھیل سے بہت ہی محظوظ ہوئیں۔

اسکول کی ایک مائی دو سفید ساڑھی پوش عیسائی آیاؤں کے پاس بنچ پر بیٹھی تھی۔ ایک آیا نے ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے کہا:

"بنگلور میں ام ایک میم شاب کے پاس تھا ادھر ایک میجک ماشٹر آیا تھا۔ بڑا جبردست کھیل کرتا تھا ایک دم پاکٹ سے خرگوش نکالتا۔

مائی بولی

"خدا کی قدرت ہے بی بی!"

پتلیوں کا تماشا دکھایا جانے لگا تو بچوں میں ہلچل سی مچ گئی ہر بچہ ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر تماشا دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، مگر جلد ہی ایک بڑے میٹھے لہجے والی اُستانی نے مائیکروفون پر انھیں نظم و ضبط سے بیٹھنے کی تلقین کی۔ چنانچہ بچے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ سب سے پچھلی قطار میں ایک طرف ذرا پرے ہٹ کر جمعدار کے کالے بھجنگ بچے بھی کھڑے تھے۔ لنگوٹی پوش کالا چھلاوا شوٹنگ لگا کر اپنے ساتھ جھنو منو کو لے کر موقع پر پہنچ گیا تھا۔ جھنو منو نے گندے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سروں پر بال میل میں جمے ہوئے تھے۔ پاؤں کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پیٹ پھولے ہوئے تھے اور زرد سہمے ہوئے بدصورت چہروں پر پتلیوں کا تماشا دیکھنے کے شوق کے ساتھ وہاں سے نکال دیئے جانے کا خوف بھی تھا۔ کوئین میری کالج اور اس قسم کے دوسرے اعلیٰ انگریزی سکولوں کے خوش لباس اجلے

چمکیلے خوش خوراک خوبصورت بچوں کے سامنے جمعدار کے ان بچوں کی بد صورتی اور کراہت حیرت انگیز حد تک نمایاں ہو رہی تھی۔ وہاں مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ بچے صرف انگریزی کالج ہی کے معصوم اور خوبصورت ہوتے ہیں۔

ایک اُستانی جس کی شکل تبتی عورتوں ایسی روکھی پھیکی تھی بڑے جلے بھنے انداز میں بچوں کو ادھر ادھر اٹھا بٹھلا رہی تھی۔ شیرِ بنگال کے پنجرے کی جانب سے جنگل کے بادشاہ کی ہیبت ناک گرج سنائی دی۔ گول گپا سی مِس نواڑ کی رنگین کرسی پر بیٹھی بیٹھی کانپ اٹھی اور پنکھا کرنے لگی۔ بنگلور کی آیا نے ننھی بے بی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اوئی۔ باپ رے۔۔۔"

پتلیوں کا تماشہ شروع ہو چکا تھا۔ بڑی لڑکیوں نے بڑی کاوش اور چابک دستی سے اس کھیل کا مظاہرہ کیا۔ بچوں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے یہ تماشہ دیکھا اور بے حد پسند کیا۔ چھنو منو اور لنگوٹی پوش کالے بھجنگ چھلاوے کے تو حیرت سے منہ کھلے ہوئے تھے۔ درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ مگر گرمی اور حبس بدستور تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ سانس تک بھی نہیں لے رہی تھی۔ درخت اور سبزہ گرم بُو کے بھپارے چھوڑ رہا تھا۔ شہر کے کچھ آوارہ گرد لونڈے چڑیا گھر کے جنگلے اور درختوں کی ٹہنیوں پر بندروں کی طرح بیٹھے یہ کھیل تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بعد میں پتلیوں نے ایک تھالی کا ٹوٹ بٹوٹ والی نظم سنائی جسے بچوں نے پتلیوں کے ساتھ مل کر گایا۔

آخر میں بچوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔

استانیاں اور منتظم خواتین سوڈا لیمن کینڈی اور آئس کریم کے ڈبوں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں بھولے بھالے خوش پوش بچے بچیاں قطار بنا کر ڈبوں کے پاس آنا شروع ہو گئے۔ بچے کو ایک آئس کریم پف، ایک کینڈی، دو غبارے اور لیمن کی بوتل دی جاتی جسے بڑی مشکل سے سنبھال کر گھاس پر بیٹھ جاتے اور مزے سے اڑانا شروع کر دیتے۔ چھنو منوا جمعدار کے کالے بھجنگ چھلاوے بھی اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہاں قریب آن کھڑے ہوئے۔ اس امید میں کہ آخر وہ بھی بچے ہیں شاید ایک آدھ ٹکڑا ان کی طرف اچھال دیا جائے، مگر انھیں ان گھٹیا گندے اور مکروہ صورت بھنگی کے بچوں کو اس بھنڈار کوئی حصہ نہ مل سکتا تھا۔ اچانک تبتی عورتوں ایسی شکل والی بد مزاج استانی کی ان پر نظر

لتی۔ یہ کالے بھوت کہاں سے آن ٹپکے۔ اُستانی نے بڑی نفرت سے ہاتھ ہلا کر انھیں جھڑک دیا:

"چلو چلو۔ بھاگو یہاں سے:"

جیسے وہ بچے نہ ہوں شہر کے گلی کوچوں میں دکانوں کے تختوں تلے گندی نالیوں میں یٹ کر دوپہریں گزارنے والے آوارہ کتے ہوں گیارہ فٹ لمبا عظیم الشان نسواری دھاریوں والا شیر اپنے پنجرے میں آہنی سلاخوں کے ساتھ منہ لگا کر بڑی اذیت اور کرب سے دھاڑا۔

جمعدار کے بچے اُستانی کی جھڑک سے سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ ذرا دور جا کر درختوں لے جا کھڑے ہوئے اور للچائی ہوئی آنکھوں سے بچوں کو آئس کریم اور کینڈی کھاتے دیکھنے لگے۔

"چلو چلو۔ بھاگو یہاں سے۔ تمھارا ان معصوم صورت بھولے بھالے اجلے اجلے کپڑوں لے کاروں میں سکول سے گھر آنے والے بچوں میں کیا کام۔ تم بچے نہیں ہو۔ اور میں نے ور سے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بچے بالکل نہیں تھے۔ کیچ بھری آنکھیں، پھولے ہوئے بوزا ایسے پیٹ، کیچڑ بھرے پاؤں، پتلی پتلی کالی ٹانگیں، پھٹے ہوئے میلے کرتے، میلی چیکٹ بلا سفید ڈیلوں والی دم بخود آنکھیں۔ زرد، بھوکے، ویران چہرے۔ یہ بچے نہیں ہو سکتے۔ یہ دم کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ شاید یہ چڑیا گھر کے کسی پنجرے سے باہر نکل آئے ہیں یا شاید یہ ڈارون کی گمشدہ کڑی "ہیں اگر یہ بچے ہوتے تو وہ تبتی استانی انھیں کبھی نہ جھڑکتی۔ بچے تو ہیں جو سامنے گھاس پر بیٹھے آئس کریم اور کینڈی کھا رہے ہیں۔ جنھیں انگریزی نظمیں زبر ہیں۔ جو سٹیج پر آ کر فلمی دھنوں پر رقص پیش کر سکتے ہیں اور جو ہر منٹ کے بعد آیا کو واز دے کر تھرمس میں سے گلاس بھر کر ٹھنڈا شربت پیتے ہیں اور جن کی گدیلے دار کاریں ڑیا گھر سے باہر ان کے ایک اشارے کی منتظر کھڑی ہیں۔ یہ بھوکی آنکھوں، کالی ٹانگوں، گے پاؤں والے تو کسی نیم وحشی نسل کے افراد ہیں جو شہر کی ہر گلی ہر بازار ہر کوچے میں دھیری کوٹھڑیوں، ٹھنڈے چولھوں اور ویران اجڑے ہوئے دالانوں میں گول گول پھٹی ائی وحشی، بھوکی آنکھیں کھولے، اندھیرے میں پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھے تکتے جا رہے ں تکتے جا رہے ہیں۔ ان کا تمدن اور ہے، ان کا طرز تکلم اور ہے، ان کی طرز معاشرت اور ہے، زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے۔ یہ اس ملک کے بہت بڑے گڑھے میں اندر

ہی اندر کھولنے والا دودھ ہیں اور لان میں بیٹھے ہوئے انگریزی سکول اور کالج کے چند بچے اس دودھ پر جمی ہوئی بالائی ہیں۔

اے ہر سال بچوں کا میلہ منانے والے معزز خواتین و حضرات آپ ان بچوں کے لئے خوشی تفریح اور فرحت کا سامان پیدا کرتے ہیں، جو ہمارے ملک کی متاعِ عزیز ہیں۔ آپ کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قابلِ تعریف اور قابلِ احترام ہے۔ لیکن خدا کے لئے اجلے بچوں اور میلے بچوں کے درمیان دیوار نہ اٹھائیے۔ بچے صرف بچے ہوتے ہیں۔ وہ لنگوٹی پوش ہوں خواہ بش شرٹ پوش۔ کیا آپ نے کبھی ان گندے مندے کالے کلوٹے جھنو منّو کی توتلی باتیں سنی ہیں؟ یہ "با۔ با بلیک شیپ" کی انگریزی نظم تو نہیں سنا سکتے لیکن یقین کیجیے ان کے پاس کہنے کو بڑی چھوٹی چھوٹی اور بہت سی پیاری پیاری باتیں ہیں جو ہم سے ہمارے دیس سے اور ان گلی کوچوں کی مٹی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ ان بچوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے سے معذور ہیں تو پھر چاندی کا کافی سیٹ سامنے رکھ کر انسانی برادری کی سماجی مساوات پر گفتگو کرنا اور بچوں کے تفریحی دن منانا بیکار ہے، بے معنی ہے۔ پھر آپ کو پورا حق ہے کہ کنپٹیوں پر تھوڑے سے سفید بال لگا، آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا، کھدر کا کرتہ پاجامہ پہن، ہاتھ میں سگار اور بغل میں کتابیں لے کر کسی ہوٹل کی میز پر جا بیٹھیے اور گھنٹوں مسئلہ ہائے وجودیت اور جدلیاتی قدروں پر سر کھپائیے۔ لیکن پھر آپ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ جھنو منّو ایسے میلے کچیلے بچوں کے مسائل پر مگرمچھ کے آنسو بہائیں۔ اگر آپ ایسا کرنے پر عادتاً مجبور ہیں تو پھر میری ایک بات مانیے۔ آج ہی اپنے گھر جا کر معاشرتی مساوات کی خوشنما کتابوں کو مہاگنی کے قیمتی شیلف سے نکال کر باہر سڑک پر پھینک دیجیے تاکہ جب ان گندے مندے بچوں کا ادھر سے گزر ہو تو انھیں اٹھا کر وہ اپنی بوری میں ڈال لیں اور ان کی مائیں انھیں چولہے میں جھونک کر ایک وقت کا کھانا پکا سکیں۔ میں بھی جھنو منّو اور اس کے لنگوٹی پوش بھائی ماں سے، ان کی ہزاروں لاکھوں ماؤں سے ملوں گا اور انھیں کہوں گا کہ وہ بھی بچوں کا ایک ایسا ہی دن منائیں۔ جہاں بچوں کو مداری کا تماشہ دکھانے کے بعد انھیں ہری ہری گھاس اور انگریزی سکولوں کے بچوں کی جھوٹھن کھانے کو دی جائیں۔

پت جھڑ کی نشانیاں

آج سے چودہ پندرہ برس پہلے کا شاہ عالمی بازار!

مغلئی طرز کے ایک پرانے ٹوٹی پھوٹی برجیوں والے تنگ سے دروازے میں سے ہو کر بوسیدہ کوٹھڑی نما دکانوں کے درمیان میں سے گزرتا ہوا تاریک پر پیچ تنگ اور بدنما بازار۔ جھکے ہوئے ٹیڑھے میڑھے مکانوں کے بھدے چھجے، ان چھجوں کے سایوں میں اجناس میں لدی پھندی چھوٹی چھوٹی ڈربہ نما دکانیں۔ اور دکانوں کے میلے دروازوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے زرد رو دکاندار اور گزرنے والوں سودا سلف خریدنے والوں کا ہجوم، لاہور مئی کی چلچلاتی دھوپ اور گرم لُو کے بگولوں میں جھلس رہا ہے مگر یہ تنگ بازار ٹھنڈا ٹھنڈا ہے۔

عطاروں کی دکانوں پر صندل کا شربت اور حلوائیوں کی دکانوں پر فالودے کے گلاس دھڑا دھڑ فروخت ہو رہے ہیں۔ ایک بوڑھا سکھ ڈیوڑھی میں سبز دھاریوں والے بسنتی خربوزوں کا ڈھیر لگائے بیٹھا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کی لالائین بیٹھی بڑی کاوش کے ساتھ خربوزے چھانٹ رہی ہے۔ اس کے پہلو میں سفید دھوتی میں سے چابیوں کا گچھا باہر جھانک رہا ہے۔ پاپڑ بڑیاں بیچنے والا ایک لالہ لٹیا ہاتھ میں لئے دکانوں کے باہر چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ مونج چھابے چنگیریں اور سن کی رسیاں فروخت کرنے والا اپنی دکان کے آگے ٹاٹ کا بنا ہوا سائبان پھیلا رہا ہے ہلدی مرچ مسالہ بیچنے والا ہلدی کی گانٹھ بنا بوریوں کے درمیان بیٹھا ترازو لئے فٹا فٹ سودا تول کر دے رہا ہے۔ ایک ہندو لڑکی اپنی کسی مسلمان برقع پوش سہیلی کے ساتھ کتابیں اٹھائے سکول سے واپس اپنے گھر جا رہی ہے۔ اس کے پاؤں میں کالا سلیپر ہے اور پورا سر کلف لگے اکڑے ہوئے دوپٹے سے ڈھکا ہوا ہے۔ حلوائیوں کی دکانوں پر فالودے والے، چینی کے اوندھے پڑے پیالوں کے درمیان بجلی کا پنکھا پورے زور شور سے چل رہا ہے۔ پنکھے کی جالی کے ساتھ رنگ برنگ کی کاغذی جھالریں بندھی ہیں جو ہوا میں لہرا رہی ہیں۔

ان پھنسی ہوئی، ایک دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی پرانی بوسیدہ دکانوں میں سے قسم قسم کی بوئیں نکل کر بھنچے ہوئے بازار کی ساکن فضا میں پھیل رہی ہیں۔ دکانوں کے درمیان کہیں کہیں پچکے ہوئے مکانوں کی ڈیوڑھیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ مکانوں کے دروازے جہاں

کھیں کھلے ہیں اندر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا باہر آرہی ہے کہیں کہیں ایک آدھ ہندو عورت ڈیوڑھی کے فرش پر بیٹھی چرخے پر پشم کاتتی یا خربوزے کے سوکھے ہوئے بیجوں کے مغز نکالتی دکھائی دے جاتی ہے۔ مکانوں کے پرنالوں سے گندگی بہہ بہہ کر دکانوں کے نیچے ہی نیچے بہنے والے بلکہ آرام کرنے والے گندے نالے میں جمع ہو ہو کر سڑ رہی ہے اور اس کی بدبو بازار کی دوسری بوؤں میں مخلوط ہو کر ایک نئی بو کو جنم دے رہی ہے۔ لیکن لاہور کے زندہ دل لالے ان تمام بدبوؤں سے بے نیاز ہو کر دکانوں پر کھڑے آلو چھولے، دال کلچے، دہی بڑے، کچوریاں، پکوڑے اور پوریاں کھا رہے ہیں۔

قاضی صاحب کوئی حرج نہیں، ایک کچوری آپ بھی اٹھا کر منہ میں ڈال لیجئے۔ اب آنکھیں کھول لیجئے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے اور ہی نقشہ ہے۔ پرانے شاہ عالمی دروازے میں کھڑے ہو کر آپ کو سکھ چرن سنگھ جی مٹھائی والے کی دکان کے بعد شاید ہی بازار کی کوئی دکان پوری طرح دیکھ سکتے۔ لیکن اب آپ چوک میں کھڑے ہیں اور آپ کی نظر پورے شاہ عالمی بازار کو چیر کر سامنے رنگ محل کی عمارتوں سے چھو کر واپس آرہی ہے۔ وسیع و عریض بازار کے بیچوں بیچ درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ دائیں بائیں جدید طرز کی خوبصورت بلند و بالا عظیم الشان عمارتیں کھڑی ہیں۔ سیمنٹ کے ستونوں والے چھتے ہوئے فٹ پاتھوں کے ساتھ ساتھ صاف ستھری ہوادار پختہ دکانیں منیاری، دوائیوں اور بجلی کے سامان سے بھری ہوئی ہیں۔ خزاں کا دور گزر گیا ہے اور بہار نے مستقل طور پر اپنے خیمے گاڑ لئے ہیں۔

لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے ہمیں بہار کے بھرپور خوشبوؤں بھرے رنگین موسم بھی کسی نہ کسی کنج میں سوکھے ہوئے پژمردہ پھول پتوں کے ڈھیر ماضی کی نوحہ خوانی کرتے مل جاتے ہیں۔ اگر آپ پت جھڑ کی ان نوحہ گر نشانیوں کو بچشم خود دیکھنا چاہتے ہیں تو میرے ساتھ ساتھ چپ چاپ چلے آئیے۔ گرمی بہت ہے دھوپ تیز ہے۔ مئی کا سورج۔ لاہور کی دوپہر۔ لیکن یہ سب کچھ آپ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے کہ آپ خزاں کی اجڑی ہوئی بے برگ و بار روشوں پر چل رہے ہیں۔ یہاں آپ کو ہرے بھرے سایہ دار درختوں کی توقع نہیں کرنی چاہیئے۔ اب آپ شاہ عالمی کی عالی شان عمارتوں کے عقب میں آگئے ہیں۔ آپ کے سامنے جلے بجھے گرے پڑے بوسیدہ مکانوں کے کھنڈرات کا ایک سلسلہ ہے جو یہاں وہاں ملبے کی اونچی ڈھیریوں پر آباد ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہاں بھی اونچی لمبی خوبصورت

جدید عمارتیں کھڑی ہوں گی اور خزاں کی یہ نشانیاں بھی وقت کی تاریک گرد میں گم ہو جائیں گی۔ لیکن ابھی یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں آباد ہیں۔ یہ کھنڈر ویران نہیں ہیں۔ لیکن ان میں ہم آپ ایسے زندہ اور زندگی سے پیار کرنے والے انسان رہتے ہیں۔ یہ لوگ دن میں کام کرتے ہیں اور راتوں کو سوتے ہیں۔ لیکن جب بارشوں کا موسم آتا ہے تو رات کو بھی کام کرتے ہیں۔ یہ کام موسلا دھار بارش میں جھکی ہوئی مخدوش چھتوں پر چڑھ کر ان سوراخوں کو اینٹوں اور چولہے کی راکھ سے بھرنا ہوتا ہے جہاں سے بارش کا پانی دھار باندھ کر اندر کوٹھڑیوں میں بہہ رہا ہوتا ہے اور جب کوئی دیوار چھت پر گر کر چھت کو بھی ساتھ لے کر ان کھنڈرات کے مکینوں کو ملبے کے ڈھیر میں چھپا دیتی ہے تو پھر فائر بریگیڈ اور محلے والوں کو بھی کافی کام کرنا پڑتا ہے۔

ان علاقوں میں زیادہ تر ان ہندو دکانداروں کے مکانات تھے جو پائی پائی جوڑ کر زمین میں گاڑ دیتے تھے اور اینٹ اینٹ جوڑ کر کبوتروں کا ڈربہ سا کھڑا کر دیتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی تنگ اندھیری بدبودار کوٹھڑیاں ایک دوسری کے اوپر رکھ کر انہیں باہر سے گارے سے پوت دیا جاتا اور لالہ جی چبوترے پر بیٹھ کر گڑگڑی پینے میں مگن ہو جاتے، پنجابی کا وہ لوک گیت انہی ڈربوں کے بارے میں تو ہے۔

کوٹھے اوتے کوٹھڑا
تے کوٹھے تے تندور بھلا

اور ان کی تنوریاں بھی کوٹھوں پر ہی ہوتی تھیں جن کا کڑوا دھواں چھتوں پر سونے والوں کی آنکھوں کا پانی نکالا کرتا تھا اور جن پر جھک جھک کر بملا کماری یا اس کی ماتا گرم گرم روٹیاں نکالا کرتی تھیں۔ اب وہ تنوریاں تو باقی نہیں رہیں مگر ان کی راکھ ان کھنڈروں میں جابجا اڑ رہی ہے۔ یہ سامنے والا ترچھا مکان جس کی مٹی ڈھے چکی ہے اور آخری منزل کی دیوار کے بہت بڑے شگاف میں سے ویران کمرے کا آتش دان صاف نظر آرہا ہے۔ دھوپ میں سینہ فگار دیوانے کی طرح کھڑا ہمیں اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس آتشدان کے کارنس پر کبھی کوئی بچی سکول سے واپس آکر اپنا بستہ رکھتی ہو گی اور پھر اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ میلی سی دری پر بیٹھ کر کیرم یا لوڈو کھیلتی ہو گی۔ اب اس بوسیدہ مکان کی پہلی منزل پر ایک کوچوان اپنے بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اس مکان میں بڑا خوش ہے۔

صرف بارشوں میں اس مکان سے ڈرا کرتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی اس کھنڈر کا بھوت تیز بارش میں ان کے خاندان پر جھپٹ پڑے۔

اب اس مکان کو دیکھئے۔ یہ جو اپنی کاٹھ جلا کر سیمنٹ کا پنجر لئے یہاں سے گزرنے والوں کے سروں پر موت کی تلوار بنا لٹک رہا ہے اور جس کی کھڑکیوں اور روشن دانوں کے چوکھٹے شعلوں کی تیز زبانوں نے چاٹ لئے ہیں۔ اگر میری یادداشت مجھے دھوکہ نہیں دے رہی تو میرا خیال ہے اس مکان میں ایک بھاری بھرکم پلپلے سے لالہ جی رہا کرتے تھے، جو منہ اندھیرے ایک ہاتھ میں کانسی کا ڈول لئے اور دوسرے سے ڈھیلی ڈھالی دھوتی سنبھالے رام نام کا جاپ کرتے دریائے راوی کی سیر کو نکلا کرتے تھے۔ بڑے نیکدل انسان تھے۔ مجھے یاد ہے محلے کی مسجد کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ہاتھ جوڑ کر احترام میں جھک جایا کرتے تھے۔ فارسی زبان سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ چنانچہ اپنی بچی رتو کو فارسی پڑھانے کے لئے ایک مولوی صاحب کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ رتو کھدر کے سفید کپڑے پہن کر سر بغیر چنے ہوئے دوپٹے میں ڈھانپ ہونٹوں پر اخروٹ کے داتن کا گہرا براؤن رنگ جمائے، نظریں نیچی کئے سکول جایا کرتی تھی۔ ابھی لڑکیوں نے اپنے بالوں کو گھوڑوں کی دم بنانا نہیں سیکھا تھا اور نہ ابھی ریشمی کریپ کی چست قمیضوں اور کشتی نما جوتیوں کا رواج چلا تھا۔ بڑے بھلے سے تھے۔ مسلمان بچیاں بہت کم باہر نکلتی تھیں اور اگر نکلتیں تو عام طور پر سفید سیدھے برقعوں میں۔ ابھی برقعے نے بھی فیشنی لباس اور آرائش کا مقام حاصل نہیں کیا تھا۔ خیر پرانی باتوں کو چھوڑیئے۔ تو قصہ ۔ مختصر --- اب اس مکان میں کوئی نہیں رہتا۔ کیونکہ اس کی ایک بھی کھڑکی دروازہ اور چھت سلامت نہیں ہے۔ اگر کچھ رہتا ہے تو ہر گھڑی اس کے گر پڑنے کا خطرہ اور کسی انجان راہگیر کی موت کا خدشہ!

یہ سامنے والے جلے ہوئے مکان کی ایک ویران منزل میں جو لڑکا سٹول پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے اسے پڑھائی کا بے حد شوق ہے۔ یہ بڑا ہو کر انجینئر بننا چاہتا ہے اور ملک کی ترقی و خوشحالی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتا ہے۔ میرے سوال کے جواب میں بڑے جوش سے بولا:

"میں انجن چلانا چاہتا ہوں۔ ریل گاڑیوں کے پل بنانا چاہتا ہوں مگر پڑھائی کا وقت نہیں ملتا جی! دن کو اخبار بیچتا ہوں اور رات کو گھر پر پڑھتا ہوں۔ آج چھٹی تھی اس لئے

تاب لے کر بیٹھ گیا۔"

اس کا باپ مفلوج ہے۔ ماں مر چکی ہے۔ اکیلا بیٹا ہے جو محنت مزدوری سے چند آنے کما کر باپ کی خدمت کرتا رہتا ہے۔ تن پر پھٹے ہوئے کپڑے ہیں۔ لیکن میں نے اس کے ارادوں اور عزائم میں پہاڑوں ایسی ثابت قدمی اور دریاؤں ایسا وقار دیکھا۔ زندہ باد ننھا انجینئر!

یہ مکان جو ڈبل اینٹ کی طرح سب سے الگ، سب سے جدا کھڑا ہے پہلے اس کی چار منزلیں ہوا کرتی تھیں۔ ساری کی ساری ایک طرف کو جھکی ہوئی جیسے کوئی دبلا پتلا آدمی جھک کر پہاڑی کے نیچے دیکھ رہا ہو۔ اس کی ہر منزل میں ایک ایک کنبہ آباد تھا۔ بارشوں اور زلزلوں کے باعث اس کی ایک ایک منزل گرنا شروع ہو گئی اور ہر منزل کے کنبے کے افراد ڈری ہوئی مرغیوں کی طرح ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ اب اس کی پہلی اور آخری منزل باقی رہ گئی ہے جو اپنے دروازے کی سہمی ہوئی آنکھ سے جولائی کی بارشوں کو قریب آتے دیکھ رہی ہے۔ قریب سے گزرتے ہوئے ہمیں طبلے کے ساتھ گانے کی آواز سنائی دی۔ سبحان اللہ! انسان ہر حال میں خوش رہنا سیکھ گیا ہے۔

میں نے ٹال والے سے پوچھا کہ یہاں تو بڑے زندہ دل لوگ رہتے ہوں گے؟ ٹال والے نے بھیگا ہوا رومال اپنی گنجی کھوپڑی پر جماتے ہوئے تھوک کر کہا:

کیا بتائیں جی! یہاں تو نہار کلیجے ہارمونیئے کے ساتھ طبلہ کھڑکتا ہے۔

سردی، بارش اور رات

کل رات میں نے جاڑے کی رُت کو تمھاری گلی میں سے گزرتے دیکھا۔ سردیوں کی کانپتی، ٹھٹھرتی بارش میں اُس کے ہونٹ نیلے تھے۔ گال کشمیری سیب کی مانند سرخ ہو رہے تھے اور سیاہ کالے ننگے بدن کی کائی زدہ پر اسرار چھاتیوں پر نوکیلے کانٹوں کا جال بچھا تھا۔ گلی کے کچے فرش پر درختوں کے جھڑے ہوئے پتے بکھرے پڑے تھے۔ وہ ان مرجھائے ہوئے زرد پتوں پر اپنے یخ بستہ ٹھنڈے پاؤں رکھتی، ہر گھر کی بند کھڑکیوں سے منہ لگا کر ٹھنڈی آہیں بھرتی، قہوے کی پیالیوں میں خوشبو ڈالتی، آتش دانوں میں آگ تیز کرتی، بچوں کو گرم لحافوں میں دبکاتی، گیلی ٹھنڈی دیواروں سے اپنا تاریک کھردرا جسم مس کرتی، بے برگ و بار درختوں کی ٹنڈ منڈ ٹہنیوں پر اپنا سرد ہاتھ پھیرتی اور اپنے گرم سانس سے ان کی بے جان پالا کھائی ہوئی ٹہنیوں میں چھپے ہوئے غنچوں کو زندگی کا پیام دیتی چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ میں اس کے استقبال کو اپنے گرم کپڑے چھوڑ کر باہر نکل آیا اور گرتی بارش میں تمھاری گلی کے سرے پر آ کر ایک درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

تم یقیناً اسے میری حماقت کہو گی۔ اس لئے کہ تمھارے نزدیک دسمبر کی سرد رات والی بارش میں اپنا گرم لحاف چھوڑ کر یونہی بے مقصد کوئی احمق ہی گھر سے باہر نکلے گا۔ لیکن تمھارے اس خیال کی پوری تائید کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ ہماری بعض حماقتیں تم لوگوں کی دانش مندیوں سے کہیں زیادہ وزنی اور قیمتی ہوتی ہیں۔ تم ایسا نتیجہ اخذ کرنے پر اس لئے مجبور ہو کہ تمھارے ماحول اور تمھاری تربیت نے تمھیں یہی سکھایا ہے۔ دسمبر کی بارش والی ٹھٹھرتی رات میں تمھارے گھر سے جب بھی کوئی اپنا گرم لحاف چھوڑ کر باہر نکلا ہے تو یا تو وہ روتے ہوئے بچے کا دودھ لینے سر پر بوریا یا چھتری لے کر کانپتا، بچتا، ٹھٹھرتا نکلا ہے اور یا پریشان حال سردی، بارش اور تیز ہواؤں کے نوکیلے تھپیڑوں سے بے نیاز کسی ڈاکٹر کی تلاش میں نکلا ہے اور یا پھر اپنی پھٹیچر سائیکل کے آگے روٹی کا ڈبا لٹکا کر کمبل میں منہ سر لپیٹے لوکو ورکشاپ میں رات کی ڈیوٹی دینے نکلا ہے۔ سرما کی بارش میں گھر سے باہر نکلنے کی تمھارے ہاں صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ کام یا مجبوری --- پہلی حالت میں تمھیں سرد ہوا اور بارش کا حیوانی احساس ہے اور تم اُس سے بچتی ہو۔ پوری طرح اپنے آپ کو محفوظ اور دور رکھتی ہو۔ دوسری حالت میں تمھیں نہ سردی کا احساس ہے اور نہ بارش کی پروا ہے۔ تم پریشان ہو، متفکر ہو اور تمھارے قدم تیزی سے ڈاکٹر کے مکان کی طرف اُٹھ رہے ہیں۔ اب اگر تمھیں کوئی یہ کہے کہ ایک تیسری حالت بھی ہے جس میں نہ کوئی کام ہوتا ہے اور نہ کوئی مجبوری۔ بلکہ ایک دھیمی دھیمی لگن سی ہوتی ہے کسی نامعلوم خواہش کی۔ ایک لپک سی ہوتی ہے موسم کو ہاتھ لگا کر چھونے کی، سردی کے نیلے ہونٹوں پر اپنے گرم ہونٹ رکھنے کی، روتی ہوئی سرد بارش کے گلے لگ کر اُس کا دکھ درد بانٹنے کی، دیوان خانوں کی بند کھڑکیوں کے ساتھ لگ کر گرم کمروں سے اُٹھتی ہوئی چوڑیوں کی دبی دبی طلائی جھنکار اور ابلتے سماوار کی لمبی تھرتھراتی سسکار سننے اور چائے کی گرم پاکیزہ خوشبو سونگھنے کی خواہش --- تو تم اس پر ہنس دو گی۔ تم کہو گی یہ تو پاگل پن ہے۔ یہ تو حماقت ہے۔ یہ تو وقت کو ضائع کرنے کے مشغلے ہیں۔ اس طرح زکام اور نمونیے کا احتمال ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ رضیہ! دانائی اور عقلمندی چند ایک بنیادی علوم کو چھوڑ کر محض اعتباری ہے۔ آج تک محققین یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ دنیا کے چند ایک مانے ہوئے داناؤں میں حماقت کتنے فی صد تھی اور بڑے بڑے احمقوں میں دانائی کس حد تک کار فرما تھی --- تمھاری دانائی بسکٹ کا وہ ٹکڑا ہے جسے تم نے بنسی کی ڈور کے سرے پر کانٹے میں پھنسا کر تالاب میں مچھلی پکڑنے کے لئے ڈال رکھا ہے۔ مچھلی پھنس گئی تو تم بڑی دانا ہو۔ پھنسی ہوئی مچھلی پھر پانی میں ڈبکی لگا گئی تو تم بے وقوف ہو۔ تمھاری دانائی بیش قیمت سرخ شنیل کا ایک ٹکڑا ہے جسے تم سنگر مشین کے پاس بیٹھی تخت پوش پر بچھا کر انچ ٹیپ سے ناپتی ہو۔ گنیئے سے اسے نشان لگاتی ہو۔ قینچی سے کاٹتی ہو۔ جو کپڑا تمھارے سوٹ کے کام کا آ جاتا ہے وہ عقلمند ہے جو ٹکڑے اور کترنیں بچ رہیں وہ بے وقوف ہیں، احمق ہیں۔ تمھاری دانائی اور عقلمندی، حماقت کی دیوار پر لگا ہوا اشتہار ہے۔ محض پرچہ ترکیب استعمال ہے، اصل دوائی نہیں ہے۔ مگر خیر یہ ایک الگ موضوع ہے۔

بات سردیوں کی بارش کی ہو رہی تھی اور میں تمھیں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میری حماقتوں کو اپنی دانائی کی انچ ٹیپ سے ماپنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ اس کانٹے کے ساتھ اپنی عقلمندی کے بسکٹ کا ٹکڑا چپکانا۔ کیونکہ اس طرح جو سوٹ تیار ہو گا وہ تمھارے جسم پر پورا نہ اترے گا

ور جو مچھلی پھنسے گی وہ شڑاپ سے پھر تالاب میں ڈبکی لگا جائے گی۔ تم اپنے منطقی ذہن او
مصلحت کیش طبیعت کا گرم ریشمی کمبل اوڑھے آگ کے پاس دبکی بیٹھی رہو اور مجھے دسمبر
کی بارش والی رات میں اپنی گلی والے ویران درخت کے ساتھ لگ کر سرمائی بارش کی گیلی
چھاتیوں سے سرمئی بادلوں کا دودھ پی لینے دو۔ یہ پانی کا دودھ ہے مگر اس دودھ میں پانی ک
ایک چھینٹا بھی شامل نہیں۔ یہ گہرے، بیکراں، عظیم، تاریک سمندوں سے بلند ہو کر
نورانی خلاؤں میں روشنی بن کر چمکتا ہوا بارش کے دھلے ہوئے پاکیزہ سینے میں اترا ہے۔ موتیۓ
کے سفید پھول اس دودھ کا مکھن ہیں اور اُڑتی ہوئی میٹھی خوشبو اس کی بھاپ ہے۔ یہ صرف
میرا حصہ ہے اور ان لوگوں کا جو قدرت کی کچھ نشانیاں سمجھتے ہیں۔ جن کی آنکھیں بند ہیں
مگر دل کے دوار کھلے ہیں۔ جن کے کانوں میں ہر آواز گیت بن کر داخل ہوتی ہے اور لبوں
سے ہر بول پھول بن کر جھڑتا ہے۔ جو زمین پر ننگے اور بے داغ پاؤں لے کر چلتے ہیں اور جن
کے سینوں میں دل کی بجائے تاریک گرم راتوں کے روشن چاند دھڑک رہے ہوتے ہیں۔
جن کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر جاڑے کی یخ بستہ چاندنی راتیں خوشبودار بھاپ اڑاتی
چائے پیتی ہیں، جن کے گھروں کی دہلیز پر موسم بہار کے حنائی پاؤں کے نشان ملتے ہیں۔
جن کے دروازوں پر پچھلے پہر کی ہوا اپنے ریشمی پروں سے دستک دیتی ہے، جو کلی کے چٹکنے
کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور سورج سے پہلے طلوع ہوتے ہیں، جن کے طالع سے سرد، نیلی، برفاب
اور سنسان راتوں کے ستارے روشنی مستعار لیتے ہیں، جو اپنی آنکھیں شبنم کے موتیوں
سے دھوتے ہیں اور اپنا صبح کا پہلا سگریٹ سورج کے ہونٹوں سے لگا کر سلگاتے ہیں۔ جاڑے
کی بارش کا سرد، کچا، تازہ، کنوارا، ان چھوا دودھ صرف ایسے لوگ ہی ہضم کر سکتے ہیں۔
تمہارے معدے اس کے لئے ناپختہ اور کمزور ہیں۔ رضیہ! تمہیں زکام اور نمونیے کا احتمال
ہے سردیوں کا موسم تمہارے لئے زکام، بخار، نمونیا، اور کھانسی لے کر آتا ہے۔ تم اُس کی
آہٹ پر ہی چونک اُٹھتی ہو اور دوائی کی شیشی اور گرم کوٹ لے کر آگ کے پاس بیٹھ جاتی
ہو۔ تمہاری ناک بہنا شروع ہو جاتی ہے اور چھاتی میں بلغم جم جاتی ہے۔ ہفتے میں ایک بار محلے
کے ڈاکٹر کے پاس تمہارا اگلا بندھا پھیرا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کا کاروبار بھی تم لوگوں کے دم قدم
سے خوب چمک اُٹھتا ہے۔ تم گرم بنیان کے اوپر سویٹر، اوپر قمیض، اوپر پھر سویٹر اور پھر
گرم کوٹ پہنتی ہو۔ مگر سردی پھر بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ تم جہاں جاتی ہو سردی گیلا

پلے کی طرح اپنا سر جھٹکتی تمہارے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ تم ہر محفل، ہر مجلس میں سردی کو
کوستی ہو۔ اُسے برا بھلا کہتی ہو۔ اُس کے عیب گنواتی ہو۔ اُس کا دل دکھاتی ہو۔ تمہارے گھر
میں جاڑے کی رُت ایک ایسی بیمار کھوسٹ بڑھیا کے روپ میں داخل ہوتی ہے، جس نے
اپنا کانپتا ہوا ناتواں جسم میلی کچیلی رضائی میں ڈھانپ رکھا ہے، جس کا سفید سر ہل رہا ہے،
جو دق کے مریض کی مانند کھانس رہی ہے اور جس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی ہے اور دوسرے
میں دوائی کی شیشی---

رضیہ! جاڑے کی رُت ہر سال میرے ہاں بھی آتی ہے مگر یہ کھوسٹ بڑھیا کبھی
نہیں آئی۔ اسے میری مجلس میں بیٹھ کر کبھی کھانسی یا نمونیے کی شکایت نہیں ہوئی۔ میں
آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتا ہوں۔ وہ اپنے سرخ صحت مند گال لئے پوہ ماگھ کی پُروا کے
ساتھ اندر آتی ہے۔ اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے میرے ہاتھ ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔ مگر کیا
ہوا--- جوانی کا خون انہیں پھر گرم کر دیتا ہے۔ وہ میرے گلے میں مفلر ڈال کر کمرے کی
ساری کھڑکیاں کھول دیتی ہے اور آتش دان میں آگ تیز کر دیتی ہے اور سماوار کے ابلتے
ہوئے پانی میں چائے کی پتیاں ڈال دیتی اور پھر جب ہلکی ہلکی بارش کی پھوار گرنے لگتی ہے
تو وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ باہر کھیتوں اور پھل دار باغوں میں لے جاتی
ہے جہاں سرسوں کا بسنتی رنگ، نیم واکلیوں کی چقوں میں سے جھانک رہا ہوتا ہے اور
ناشپاتی کی ننگی بے برگ و بار سیاہ ٹہنیوں پر سے شبنم کے موتی نیچے گھاس پر ٹپک رہے
ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ٹہنیوں پر خزاں نصیب گہرے سرخ رنگ کے پتے بارش کی پھوار
میں نہا رہے ہوتے ہیں انھیں پوہ ماگھ کی ٹھٹھرتی بارش میں ویران باغ میں دیکھ کر میرا بھی
رنگ گہرا سرخ ہو جاتا ہے، منہ گرم ہو جاتا ہے اور سارا جسم ایک حیرت انگیز آسمانی
مسرت سے دمک اٹھتا ہے اور میں بڑی محبت سے ان بے برگ و بار سیاہ، ٹھنڈی بارش میں
بھیگتی ٹہنیوں کو چومتا ہوا آگے بڑھتا ہوں اور جہاں جہاں میرے ہونٹوں کے نشان ہوتے
ہیں وہاں وہاں بہار کے موسم میں ناشپاتیوں کے سفید شگوفے کھلتے ہیں اور ان میں میٹھا رس
ٹپکتا ہے اور بھونروں کی ٹولیاں اپنی میٹھی "گنجار" کے ساتھ منڈلاتی پھرتی ہیں۔

نمونیا اور غریبی--- یہ دونوں غیر قدرتی بیماریاں ہیں۔ غریبی اس وقت لاحق ہوتی
ہے جب ایک آدمی دوسرے کا کوٹ اتار کر خود پہن لیتا ہے اور نمونیا اس وقت حملہ کرتا

ہے جب وہی آدمی کوٹ کے اوپر اوور کوٹ پہن کر سردی سے بچتا پھر رہا ہوتا ہے۔ مجھے غریبی اس لئے تنگ نہیں کرتی کہ میں دوسروں کے کپڑے نہیں اتارتا، بلکہ اپنے معمولی سے گرم کوٹ پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ نمونیا اس لئے حملہ نہیں کرتا کہ مفلر گلے میں ڈال کر خود اس کی تلاش میں گھر سے باہر کھیتوں اور باغوں میں نکل جاتا ہوں۔ میں رات کا ٹھنڈا باسی پانی پی کر سردی کا مذاق اڑاتا ہوں اور منہ اندھیرے کھیتوں پر جمی ہوئی اوس سے منہ دھو کر اس کا منہ چڑاتا ہوں۔ میں اس دشمن کو (اگر تم اسے دشمن سمجھتی ہو) انہی حربوں سے شکست دیتا ہوں جن حربوں سے وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے اور یوں پیر روم کے اس گہرے نکتے کی داد دیتا ہوں کہ

برز جاجِ دوست سنگِ دوست زن

رضیہ! جب تک میرا خون گرم ہے اور خدا نے مجھے ایک گرم کوٹ اور مفلر عطا کر رکھا ہے میں اس نیلے ہونٹوں اور بارانی پلکوں والی سرمائی محبوبہ کے سرد ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دُھند میں ڈوبے ہوئے کھیتوں اور ٹپکتے ہوئے درختوں کے نیچے سے ہو کر گزرنے والی گیلی پگڈنڈیوں کی آوارہ گردی ضرور کروں گا۔ کانپتا، ٹھٹھرتا سردیوں کا گہرا سرخ سورج طلوع ہوتے ہوئے مجھے ہمیشہ کہر میں لپٹے ہوئے آخری کھیت کے کنارے پر بازو کھولے اپنا منتظر پائے گا اور دسمبر کی ہر بارش کا پہلا قطرہ میرے ہونٹوں پر گرے گا۔ اس لئے کہ یہی میری غذا ہے۔ میری زندگی کے دستر خوان پر ہر موسم اپنی اپنی رکابی میں میرا انتظار کیا کرتا ہے۔ میں صرف موسمی پھل ہی نہیں کھاتا، پھلوں کے ساتھ ساتھ موسم کو بھی اپنا تر نوالہ بناتا ہوں۔ میں نے جس دن سورج سے پہلے اٹھ کر کھیتوں میں جا کر معطر شبنم سے اپنا منہ نہ دھویا میرا منہ کالا ہو جائے گا۔ جس روز میں نے اوس میں ڈوبا ہوا گلاب کا سرخ پھول آنکھوں سے نہ لگایا میری بینائی جاتی رہے گی اور جس روز میں بارش کی پھوار میں گھر سے باہر نہ نکلا میرا بدن مرجھا کر سوکھ جائے گا اور میں کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑوں گا۔ میرے اندر پوتر دھرتی کے سارے اجزا ہیں۔ مٹی ہے جو بارش مانگتی ہے۔ زرد پتے ہیں جو جھڑنے کے لئے جنوری کی سرد ہوا کے طالب ہیں۔ منہ بند کلیاں ہیں جو کھلنے کے لئے رات بھر کی شبنم اور علی الصباح سنہرے آفتاب کی گرم کرنیں چاہتی ہیں۔ بے رنگ پھول اور آدھ پکے پھل ہیں جو رس، خوشبو اور رنگ کے لئے جاڑے کی نیلگوں چاندنی کے خواہش

مند ہیں۔ اور اگر وہ گھڑی آ گئی جب میرے گرم خون کی حرارت زائل ہونا شروع ہو جائے گی۔ جب محض کوٹ اور مفلر پہن کر میں خانہ بدوشوں کی طرح کھلی اور آزاد ہواؤں میں نہ نکل سکوں گا۔ جب میں رات بھر کی ٹھٹھری ہوئی شبنم کو اپنی آنکھوں سے نہ لگا سکوں گا تو میں اپنے آپ کو پہاڑ کے دامن میں کسی جھونپڑی میں بند کر لوں گا۔ کمبل اوڑھ کر کھلی کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر کانپتے ہوئے ہونٹوں اور روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دور پہاڑوں پر برف کو گرتے ہوئے دیکھا کروں گا جب سنسان پہاڑی راتوں میں یخ زدہ تیز نوکیلی ہواؤں کے جھکڑ چلا کریں گے تو میں ہمہ تن گوش ہو کر سنگلاخ چٹانوں کے خوف میں چکر کھاتی، سر پٹختی، روتی ہواؤں کے نوحے سنا کروں گا اور جب موسلا دھار مینہ برسے گا اور اسکی بوندیں کھڑکی کی سل سے ٹکرا کر میرے بوڑھے جھریوں والے چہرے پر گریں گی تو میں اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر پھیلا دوں گا اور کہوں گا:

بارش! بارش!!
میری بیٹی! میری بچی!!
اپنے بوڑھے باپ کا منہ دھلاتی جا---!!

اور پھر رات جبکہ سردی میں پہاڑی کے سارے چشمے جم رہے ہوں گے اور وادی میں چاجوں پانی برس رہا ہو گا میں اپنی جھونپڑی میں اٹھ کر ننھا سا دیا جلاؤں گا۔ آتش دان میں آگ روشن کر کے چائے بناؤں گا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دوں گا اور موسموں، ہواؤں، پہاڑوں، درختوں، پھولوں، چشموں، سمندروں اور گندے نالے اور دھاڑتے شیروں اور زخمی ہرنوں اور پریشان حال انسانوں کے دکھوں، دردوں اور خوشیوں کی داستان لکھنے بیٹھ جاؤں گا اس وقت سب رشتے ناطے ختم ہو چکے ہوں گے۔ سب کچے دھاگے ٹوٹ چکے ہوں گے اور جب صبح کو پہاڑ کی اوٹ میں سے سورج کی پہلی کرنیں میری کھڑکی سے اندر داخل ہوں گی تو میرا سر میز پر جھکا ہوا اور سرد ہاتھ کرسی کے بازو سے نیچے لٹک رہا ہو گا اور داستان کے ورق تیز ہوا میں وادی کی تاریک گھاٹیوں میں اڑے جا رہے ہوں گے۔ کسی اگلے جنم میں پھر سے مرتب ہونے کے لئے کسی دوسرے دور میں پھر سے قلمبند ہونے کے لئے!

رضیہ! مجھے بے اختیار وہ لڑکی یاد آ رہی ہے جو بارش کے بعد تمہاری گلی کے ایک

مکان کی چھت پر نکل آئی تھی۔ ہوا میں اس کے کالے بال اڑ رہے تھے اور سرخ چادر کا پلو پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُس نے منڈیر پر رکھے ہوئے گملوں میں سے گلاب کا ایک سرخ پھول توڑا تھا اور جلدی سے نیچے بھاگ گئی تھی --- اور اس کے جاتے ہی پھر بارش شروع ہو گئی تھی اور کل رات بارش میں تمھاری گلی میں درخت کے نیچے کھڑے کھڑے میں کتنی دیر اس منڈیر کو تکتا رہا جس کے گملوں میں اب کوئی گلاب کا سرخ پھول نہیں تھا۔ کیا وہ لڑکی سرخ پھول اپنے سیاہ بالوں میں لگا کر سو رہی ہے یا اس نے کسی کو دینے کے لئے اسے عطر بھرے لفافے میں بند کر لیا ہے۔

بارش! بارش!!

منڈیر کے گملوں میں نئے پھول کھلا دے!!

اندھیری رات کی ہوا

کل صبا نے مجھے ایک ریشمی رومال دیا۔

چھوٹا سا بڑا خوبصورت رومال تھا۔ اس میں سے حنا کے عطر کی بڑی تیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ ہمارے ہاں اس قسم کے خوشبودار سرخ رومال عام طور پر شادی کی رات دلہنوں کی بند مٹھیوں میں سمٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل محبت میں سرخ رومال اور حنا کے عطر کا تصور قریب قریب عنقا ہے۔ اس ایٹمی دور میں محبت کے تحفے پتلون کی پیٹیاں، میکس فیکٹر اور ناجائز بچے ہیں۔ یہ محبت کالج گیٹ کے بس سٹاپ سے سوار ہوتی ہے اور سینما ہال کے بکس میں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اگلے وقتوں کی محبوبہ پھولوں بھری وادی میں چنار کے درختوں تلے چشمے پر بیٹھ کر اپنے پریمی کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ لیکن آج کی شکنتلا کڑکتی دوپہر میں میکلوڈ روڈ کے کسی سینما گھر کے باہر دھوپ میں کھڑی رومال سے بار بار پسینہ پونچھ رہی ہوتی ہے اور اس کا کلرک یا طالب علم عاشق دو آدمیوں کا پاس ایک جیب میں ڈالے اور ادھار مانگے ہوئے دس روپے دوسری جیب میں رکھے دفتر یا کالج سے بھاگ کر تانگے پر سوار پریشانی اور اضطراب کے عالم میں بھاگا چلا آ رہا ہوتا ہے۔ سینما کے باہر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوتے ہیں لڑکا آگے آگے چل پڑتا ہے اور لڑکی اس کے پیچھے پیچھے۔ دونوں بکس میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دونوں پسینے میں نہائے ہوئے ہیں۔ چھت کا پنکھا نہیں چل رہا۔ لڑکا بار بار گیٹ کیپر کو پنکھا چلانے کے لئے کہتا ہے۔ گیٹ کیپر ان باتوں کا عادی ہے وہ یونہی نیچے کسی کو آواز دیتا ہے اور چپکا ہو رہتا ہے۔ شکنتلا اور راجہ دھشنت رومال ہلا کر چہروں کو ہوا کر رہے ہیں۔ شکنتلا کو پیاس محسوس ہوتی ہے راجہ دھشنت فوراً دو ملک شیک منگواتا ہے۔ اور دل ہی دل میں پیسوں کا حساب کرنے لگتا ہے۔ سینما ہال کی بتیاں گل ہو جاتی ہیں۔ فلم شروع ہو جاتی ہے عاشق راجہ اپنی شکنتلا کی گردن میں آہستہ سے اپنا بایاں بازو حمائل کر دیتا ہے شکنتلا فوراً سمٹ جاتی ہے۔

اُوئی۔ بڑی گرمی ہے۔"

اسرار سیاہ آنکھوں والی صبا بڑی خاموشی سے چائے پی رہی ہے۔ نومبر کا ابر آلود آسمان درختوں کے اُوپر نظر نہ آنے والی سرد راکھ سی اڑا رہا ہے اور میں ایک پل کے لئے تمہارے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ میں نے تمہیں آج تک نہیں دیکھا اور شاید کبھی تمہارے دیکھنے کا اتفاق بھی نہ ہو۔ صبا کی زبانی مجھے صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ تم یہاں کسی کالج میں پڑھتی ہو اور ایک روز کالج کے گیٹ پر بس کا انتظار کرتے ہوئے تمہارے ہاتھ سے میری ایک کتاب چھوٹ کر زمین پر گر پڑی تھی اور تم نے اُسے چوم لیا تھا۔

اجنبی لڑکی! تیرے ان چھوٹے پاکیزہ ہونٹوں کا جو نشان پھول بن کر اس کتاب پر کھل اٹھا تھا وہ کانٹا بن کر میرے دل میں اتر گیا ہے۔ ایسا پھر کبھی نہیں کرنا۔ دنیا میں سوائے ایک بہت بڑی، بڑی عظیم کتاب کے اور کوئی کتاب اس قابل نہیں کہ اس کی خشک اور بے جان جلد کو تیرے معصوم ہونٹوں کا پوتر لمس نصیب ہو۔ دیکھ جب بارش ہوتی ہے تو اس کی بوندیں مکانوں کی ممٹیوں، گندے نالوں کی دلدلوں اور لمبی نرم گھاس میں چھپے ہوئے پھولوں پر یکساں گرتی ہیں لیکن جس بوند کو۔ جس قطرے کو سیپ کے ادھ کھلے منہ میں ٹپک کر موتی بننا ہوتا ہے وہ سمندر کے صرف ایک خاص حصے میں ہی گرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ہونٹ ایک ایک ستارے کو الگ الگ چومنے کی بجائے ایک ہی بار اولین اور آخری، ازلی اور ابدی سورج کے دہکتے کھولتے ابلتے ہوئے آتشیں ہونٹوں سے پیوست ہو جائیں۔ بے رنگ و بو درخت کے کھردرے تنے کی چھال سے لپٹنے والی! تیری نگاہ اس درخت کی سب سے بلند شاخ پر کھلے ہوئے سرخ پھول پر کیوں نہ گئی۔

صبا میری طرف دیکھ رہی ہے اور تھوڑی تھوڑی مسکرا رہی ہے۔ اس نے اپنی خوبصورت انگلی کے اشارے سے مجھے میری پیالی کی طرف متوجہ کیا ہے جس میں چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے لیکن چائے پینے سے پہلے میں صبا سے تمہارا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ یہ دبلے بدن کی لمبی سی لڑکی ہے جس کی آنکھیں سیاہ ہیں اور بالوں کا رنگ براؤن ہے ماتھے پر یہ لڑکی کسی شے کا سرخ ٹیکا لگاتی ہے اور براؤن بالوں کے جوڑے میں ہمیشہ کسی نہ کسی پیڑ کے پیلے پیلے سوکھے پتے سجائے رکھتی ہے۔ اس کے ہونٹ پکے ہوئے تازہ آلوچے کی طرح بھرے بھرے ہیں اور دھوپ میں چمکنے لگتے ہیں۔ اُس کا اپنا رنگ بھی آلوچے کی طرح ہے۔ گہرا --- کافی گہرا سانولا، تازہ، رسیلا اور خوشبو دار۔ یہ سنگلدیپ کے جنگلوں میں دھواں

راجہ دھشنت فوراً بازو اُٹھا لیتا ہے۔ اس کے بعد دو ملاقاتیں کسی غیر مشہور ہوٹل کے کیبن میں ہوتی ہیں۔ میکس فیکٹر کا پورا سیٹ پیش کیا جاتا ہے۔ لڑکے کا قرض بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خود آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیسری ملاقات ایک بار پھر سینما ہال کے بکس میں ہوتی ہے۔ اب دونوں ایک دوسرے کی طرف تھوڑا تھوڑا بڑھتے ہیں۔ چوتھی ملاقات پر قرض بیباق ہو جاتا ہے۔ پانچویں ملاقات پر دونوں کسی خفیہ جعلی لیڈی ڈاکٹر کے ہاں دیکھے جاتے ہیں۔ اور چھٹی ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔

لیکن جو سُرخ ریشمی رومال مجھے صبا نے لا کر دیا اس میں سے اگلے وقتوں کی گہری گہری اور درد بھری محبت کی مہک اُٹھ رہی تھی۔ رومال میری ہتھیلی میں تھا اور میں آنکھیں بند کئے چپ چاپ سگریٹ پی رہا تھا۔ میری آنکھیں اندر ہی اندر جل رہی تھیں۔ شاید سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے یا حنا کی اس تیز خوشبو کی وجہ سے جس میں وہ رومال ڈوبا ہوا تھا۔ میں اور صبا شہر سے باہر ایک پرانی قلعہ نما چھوٹی سی حویلی کے عقبی باغ میں بانس کی کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ شروع سردیوں کی ویران سی شام تھی۔ گھاس پر یہاں وہاں جھڑے ہوئے زرد پتے بکھرے پڑے تھے۔ پرانی وضع کے ناتراشیدہ باغ کو آم کے اونچے لمبے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ ناشپاتی کا ایک پت جھڑا پیڑ اپنی کالی کالی ٹہنیاں اٹھائے ہماری بانس کی تپائی سے ذرا پرے خاموش کھڑا تھا۔ تپائی پر ایک چھوٹا سا کشمیری سماوار اور دو پیالیاں پڑی تھیں۔ آم کا ایک خشک پتا اپنی ڈال سے ٹوٹ کر فضا میں چکر کھاتا ہوا تپائی پر سماوار کے پاس آن گرا۔ یوں لگا جیسے کسی نے ہولے سے سسکی بھری ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ عطر بھرا ریشمی رومال میری مٹھی میں بند تھا اور حنا کی تیز مہک اُس بند نافے میں سے پھوٹ پھوٹ کر پت جھڑ کی اداس شام کو زیادہ سوگوار بنا رہی تھی۔

صبا نے میری پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بتایا کہ یہ ریشمی رومال تم نے اپنی ایک سہیلی کے ہاتھوں مجھے بھجوایا ہے۔ اس لئے نہیں کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ بلکہ اس لئے کہ تمہیں مجھ سے عقیدت ہے۔ تم میری کہانیوں اور ناولوں کو بڑے شوق سے اور بڑی محبت سے پڑھتی ہو۔ تم نے میری کتابوں کو اپنی میز پر سجا رکھا ہے۔ تم نے ان کتابوں کے اوراق میں گلاب کے پھولوں کی پتیاں دبائی ہوئی ہیں۔ تمہارا بھیجا ہوا سرخ رومال میری ہتھیلی میں ہے۔ آم کا خشک پتا سماوار کے ساتھ لگ کر سو گیا ہے۔ براؤن بالوں اور پر

دھار بارشوں کے بعد سال کے رس ٹپکاتے درختوں کا رنگ ہے - یہ گرم سمندروں کے کنارے تیز دھوپ میں ریت پر گرے ہوئے ناریل کا رنگ ہے جس کا رس دھوپ کی تپش میں اندر ہی اندر کھول کر پاگل بنا دینے والی مہک اڑا رہا ہو- یہ دل پر اپنا کانپتا ہوا گرم ہاتھ رکھ دینے والی شہنائی کی زخمی آواز کا رنگ ہے- صبا شہر سے باہر جس پرانی قلعہ نما حویلی میں بالکل اکیلی رہتی ہے میری اس سے پہلی ملاقات اسی اجڑی ہوئی حویلی کے باغ میں ہوئی یہ باغ ویران ہو چکا ہے- اس کے چاروں طرف کی پرانی دیوار جگہ جگہ سے ڈھے گئی ہے- کھلے پھاٹک کا دروازہ زمین میں دھنس چکا ہے- گیٹ کی شکستہ محراب کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ دیا ہے- حویلی کی چھت پر لمبی لمبی خشک گھاس اگ آئی ہے- پرانی کھڑکیاں عشق پیچاں کی بیلوں میں چھپ گئی ہیں اور ان میں بلبلوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں- اس حویلی کا علاقہ شہر کے جنوب مشرق میں واقع ہے- یہاں راوی دریا قریب سے ہو کر گزرتا ہے اور مرغابیاں نیچی اڑان کے بعد دریا کنارے والے دھان کے کھیتوں میں اتر آتی ہیں- حویلی کا اجڑا ہوا باغ دریا تک چلا گیا ہے میری بچپن ہی سے یہ عادت ہے کہ صبح کو سیر کو ضرور جاتا ہوں- پو پھٹے شبنمی کھیتوں میں بڑا مزہ آتا ہے- خیر ان باتوں کو چھوڑو- صبح کی سیر کا تعلق خالص میری ذات سے ہے- میں اس معاملے میں کسی کی بھی دلچسپی گوارا نہیں کرتا- تو ایک دن کیا ہوا کہ میں حسب عادت منہ اندھیرے اٹھ کر باہر کھیتوں اور ناشپاتی کے باغوں میں آ گیا- ہوا انتہائی سرد تھی اور شبنم سے لدی ہوئی ہر سانس پر احساس ہوتا تھا کہ لطیف بادلوں کا لمس پی رہا ہوں- آسمان پر جھلملاتے ستاروں کا جال بچھا تھا جس میں جکڑی ہوئی رات بیدار ہو کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی- میں پھرتا پھراتا پرانی حویلی والے ویران باغ میں آ گیا اور ایک جگہ آم کے درختوں تلے ورزش کرنے لگا- اچانک مجھے فضا میں بڑی گہری اور تیز خوشبو محسوس ہوئی- اس کے ساتھ ہی کسی عورت کے گانے کی باریک اور دھیمی دھیمی آواز سنائی دی- یہ آواز اور خوشبو پرانی حویلی کی طرف سے آ رہی تھی- دل اپنے آپ حویلی کی جانب کھنچنے لگا- چنبیلی اور انار کی جھاڑیوں کے عقب میں حویلی کی ایک نیچی سی کھڑکی کا گرد آلود پٹ ذرا سا کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر آتش دان میں آگ روشن ہے- اگر بتیاں سلگ رہی ہیں اور گہرے سرخ رنگ کے پرانے قالین پر ایک لڑکی سفید ساری پہنے بال بکھرائے بیٹھی ہے- اس کے سامنے چاندی کی تھالی میں رتن جوت کے سفید اور پیازی

پھول پڑے ہیں- اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے ہیں- آنکھیں بند ہیں اور دھیرے دھیرے بڑی پُر درد اور تھکی تھکی آواز میں گا رہی ہے-

نینن بھرے تری اور
کیوں لیو مکھ موڑ سجنوا
کیوں لیو مکھ موڑ

آتش دان میں آگ روشن تھی جس کی چمک میں اس کے سکون میں ڈوبے ہوئے چہرے کے ملائم نقوش دمک رہے تھے- میں کھڑکی میں سے کمرے میں داخل ہو گیا اور چپکے سے اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اُس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا- اس کی سیاہ آنکھوں میں بھگتی رس کا جادو اور بے پناہ کشش تھی- اُس نے چاندی کی تھالی میں سے کچھ پھول اٹھا کر مجھے دیئے- میں نے انہیں چوم کر جیب میں ڈال لیا- میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس اجڑی ہوئی غیر آباد آسیبی حویلی میں اکیلی کیسے رہتی ہے اُس نے بتایا کہ اس کا نام صبا ہے- جب وہ مدراس میں پیدا ہوئی تھی تو اس کا نام انا پورنا تھا- پھر اس نے بنگال میں جنم لیا تو اس کا نام سُجاتا تھا- اب پنجاب میں پیدا ہوئی ہے اور اس کا نام صبا ہے- مدراس میں وہ رامیشورم کے پرانے مندروں میں دیوداسی تھی- بنگال میں اس نے شانتی نکتین میں رہ کر ستار بجانا سیکھا- کئی سو سال پہلے میں لکشمی کے روپ میں گنگا کی وادی میں سنسار اور بیر دو ندیوں کے شمال میں پیدا ہوئی اور میں نے بھگوان بدھ کو پھلگو دریا کے کنارے گیا اور بارابار کی جنگلوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں انسانی مصائب کے متعلق گہری سوچ میں گم دیکھا- میں نے چاول، چنبیلی کے ہار اور صندل کا تیل ان کے قدموں میں ارپن لیا اور اپنے بچھڑے ہوئے پریتم سے ملنے کی منت مانی- میں نے بھگوان بدھ کے مقدس ہاتھوں پر چاندی کی صراحی میں سے گلاب کے سچے پھولوں کا عطر چھڑکا- میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ آپ مقدس دیوتا ہیں- آپ نے اس داسی کو اپنے پاکیزہ درشنوں سے نہال کیا ہے- میرا دل محبت میں ٹوٹ چکا ہے کیا میرا جیون ساتھی مجھے پھر کبھی نہیں ملے گا؟ آپ بھگوان ہیں- آپ سب کچھ کر سکتے ہیں-"

اُس عظیم انسان نے اپنا محبت بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور فرمایا:

"تمہاری خوشیاں طویل ہوں بہن میں بھگوان نہیں ہوں بلکہ تمہارا بھائی ہوں جو کبھی

شہزادہ تھا لیکن اب جہاں گرد ہے اور محبت کی اذیتوں کی وجہ تلاش کرنے محل سے نکل کر جنگلوں کی خاک چھان رہا ہے۔"

بن باسی شہزادے کے چہرے پر سکون تھا جیسے سوسن کا پھول سو رہا ہو--- میں نے ہر جنم میں بھجن گائے ہیں آسم کے خوشبو اڑاتے درختوں تلے ہوا میں بانہیں پھیلا کر چیت کے مہینے کا استقبال کیا ہے۔ میں پت جھڑ میں ڈالیوں سے جھڑے ہوئے پتوں کو جنگل جنگل اڑائے لئے پھرتی رہی ہوں۔ میں تازہ شگوفوں کی مہک ہوں۔ میں صبح کی پاکیزہ ہوا ہوں۔ میں رات کی پراسرار خاموشی ہوں۔ میں دہشت ناک آندھیوں کی چیخ ہوں اور نوحہ گر بلبل کا گیت ہوں۔"

اتنا کہہ کر صبا نے ذرا سی آنکھیں سکیڑیں اور مجھے مسکرا کر دیکھا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ وہ صبح شام مجھے اسی حویلی میں ملتی۔ شام کو ہم ویران باغ میں بانس کی پرانی کرسیوں پر بیٹھ کر گہری خموشی میں چائے پیتے۔ کبھی باتیں کرتے کبھی ہنستے اور کبھی خاموش بیٹھے درختوں سے پتے گرتے دیکھا کرتے۔ ہم مال روڈ کے باغوں کی سیر کو اکٹھے جاتے میں صبا سے محبت کرتا ہوں۔ صبا مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن ہماری محبت آزاد اور تمام دنیاوی پابندیوں سے بے نیاز ہے۔ اسے میرے پاس آنے کے لئے گھر سے چوری چوری نہیں نکلنا پڑتا۔ میں اسے جب چاہوں، جس وقت چاہوں اپنے پاس بلا لیتا ہوں یا خود اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتی ہے تو سوائے میرے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ سوائے میرے اس سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ و[illegible] میری طرف دیکھ دیکھ کر سدا مسکرایا کرتی ہے۔ سورج مکھی پھول کی طرح میرا چہرہ ہمیشہ صب[illegible] کی جانب رہتا ہے اور اس کی آزاد اور بیکراں محبت کی روشنی سے میری پیشانی ہمیشہ دمک[illegible] رہتی ہے۔ ہم دونوں غیر شادی شدہ ہیں لیکن ہماری شادی پہلے ہی دن ہو گئی تھی اور اس م[illegible] سوائے ویران باغ کے درختوں، تیز ہواؤں، گرتے پتوں اور بارش کی آواز کے کوئی شریک نہیں ہوا۔ کسی نے ہماری شادی کا ولیمہ کھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ڈکار نہیں لیا۔ کوئی ناکا[illegible] جہیز پر بڑبڑاتا، ڈولی کے ساتھ ساتھ نہیں گیا اور کسی نے پلاؤ میں گھی خراب ہونے کی شکای[illegible] نہیں کی۔ ہمارے کسی بچے نے پیدا ہو کر دنیا کی زبوں حالی۔ مفلسی۔ بیماری اور بیکاری م[illegible] اضافہ نہیں کیا۔ ہماری کسی اولاد نے ہمیں اتنا خود غرض نہیں بنایا کہ ہم اپنے بچوں کو

سقراط سمجھیں اور دوسرے بچوں کو وہ جلاد۔ جس نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا تھا اپنی محبت کو ایک کم ظرف کنجوس کی طرح ایک ہی مرکز پر جمع کرنے کے بجائے ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اسے چاروں طرف لٹا دیا ہے۔ اب ہر ایک ہمارا ہے اور کوئی ہمارا نہیں۔

صبا نے جب تمہارا ریشمی رومال لا کر دیا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے بھی حسد محسوس نہیں کیا۔ کیونکہ حسد وہاں ہوتا ہے جہاں محبت کی اجارہ داری ہوتی ہے اور یہاں تو ہر ذرے، ہر پتے، ہر شگوفے پر محبت کا نام لکھا ہے اور ہر گلی میں ان گنت عطر بھرے ریشمی رومال لہرا رہے ہیں۔

پیاری اجنبی لڑکی! ہم بیراگیوں کی محبت تمہیں راس نہ آئے گی۔ ہم وہ بیراگی ہیں جنھوں نے جنگل چھوڑ کر شہروں میں آن بسیرا کیا ہے۔ ہم دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے جھنجھٹ میں پھنس کر بھی اس سے آزاد ہیں۔ رشتہ داریوں، عدالتوں، دفتروں اور پارٹی بازیوں کے ہنگاموں کے عین وسط میں بیٹھ کر بھی ہم آلودگیوں سے اپنے دامن کو پاک رکھتے ہیں۔ یہ وہ حکومت اور تاجداری ہے جو تھوڑی سی اطاعت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ پیامِ امن ہے جو عین لڑائی میں ہی دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے شیرانِ غاب کی غضب ناک جنگ بڑی ضروری ہے آج کل گوتم بدھ کو بڑ کے درخت تلے نہیں بلکہ شہر کی سب سے اونچی عمارت کے سائے میں ہی گیان ملے گا۔ ریشمی رومال والی لڑکی! میں لکھتے لکھتے اپنے قلم سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔ میں تمہیں صرف اتنا کہنا چاہتا تھا کہ میں تمہارے خوشبو دار رومال کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے جب تمہارا رومال ملا تو خوشی سے میرا منہ لال ہو گیا۔ اسلئے کہ یہ ایک انتہائی رومانٹک بات تھی۔ اس زمانے میں تو محبت ٹھنڈے اور بے حس سفید کپڑوں والی نرس ہے جو محبت کرنے والوں کے بستر پر جا کر مشینی حرکت کے ساتھ تھرمامیٹر ان کے منہ میں ڈال کر ٹمپریچر لے کر انہیں روتا دھوتا چھوڑ وہاں سے رفو چکر ہو جاتی ہے۔ اس کے کپڑوں سے یا پسینے کی بو آتی ہے اور یا آیوڈین کی عطر کی خوشبو کا نام سن کر ہی اُسے زکام ہو جاتا ہے۔ یہ میکانکی محبت خوشبودار رنگین پھولوں والے پریم بھرے خط لکھنے کی بجائے کاپی پر حساب زیادہ لکھتی ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کبھی وہ محبت بھرا خط لکھ بھی دے تو اسے پڑھ کر آپ یوں محسوس کریں گے۔ جیسے آپ کی چچی نے آپ کو خط لکھا ہو۔ اس قسم کے ہسپتالی دور میں جب مجھے تمہارا حنا میں ڈوبا ہوا سرخ رومال ملا تو مجھے بے اختیار وہ

پرانے گلی کوچے یاد آ گئے جہاں چوری چھپے محبتوں کے جشن منائے جاتے ہیں۔ جہاں لب خاموش ہوتے ہیں لیکن دلوں میں سات سمندروں کے طوفان برپا ہوتے ہیں جہاں چلمنیں سرکتی ہیں۔ اور رنگین آنچل پل بھر کے لئے لہرا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ گہری، اُداس چپ چاپ آنکھیں چق کے پیچھے سے ٹکٹکی لگا کر آپ کو دیکھتی ہیں نازک انگلیوں کی مدد سے چق اندر کو سمٹتی ہے اور آنکھیں غائب ہو جاتی ہیں ایک چھوٹا سا بچہ آپ کو ریشمی رومال دے جاتا ہے جو تیز عطر میں بسا ہوتا ہے۔ پھر ایک دن ایک ننھا سا تڑا مڑا رقعہ آتا ہے۔ جس میں الفاظ کم اور عطر کے دھبے زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ ہر سانس پر اپنے آپ کو خوشبو کی لہروں کے ساتھ ہوا میں اڑتا محسوس کرتے ہیں۔ پہلی ملاقات سیڑھیوں میں ہوتی ہے۔ تیز تیز سانس حنا کی مہک ، سہما ہوا گرم جسم ، خشک ہونٹ ، سلگتی ہوئی ہر آہٹ پر چونکتی آنکھیں، تھوڑی سی کھینچا تانی اور بس --- دوسری ملاقات شادی بیاہ کے ہنگاموں میں ہوتی ہے۔ گوٹہ لگے ریشمی کپڑے، گیندے کے بسنتی پھولوں کے ہار، چمکیلے چہرے، نکھری ہوئی سرمہ لگی آنکھیں، افشاں بھری مانگ، بار بار ڈھلکتے کرن لگے سفید اور گلابی دوپٹے، گرم سماوار ، سبز چائے کی خوشبو میں ملتی ہوئی بادیان خطائی کی مہک ، گورے گورے پسینے میں دمکتے چہرے اور گرم گرم بھاپ اڑاتے بریانی کے طشت اور اچانک گیندے کا ایک بڑا سا بسنتی پھول ٹپ سے آپ کے قدموں میں آن گرتا ہے اور پھر پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ آنسوؤں کی بارش ہوتی ہے اور ایک بن چاند کی تاریک رات کے غمگین پچھلے پہر میں کوئی روتا، سسکیاں بھرتا، چہرے کی سنہری افشاں کو گالوں پر بہاتا ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہو جاتا ہے اور آپ ریشمی رومال اور گیندے کا بسنتی پھول ہاتھ میں لئے گلی کے موڑ پر کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ محبت بڑی اندوہ ناک ہے۔ اس میں جدائی ہی سب سے بڑا ملاپ ہے۔ اس میں سوائے حسرت ناک یادوں کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس میں آنگن سونے رہ جاتے ہیں۔ اُداس مکانوں کی منڈیریں گرم دوپہروں میں خاک اڑاتی ہیں اور اندھیری گلیوں میں آدھی رات کو گزرتے ہوئے بچھڑی ہوئی محبتوں کی عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ محبت ایک ایسی لڑکی ہے۔ جس کی پرورش صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ اسے ایک روز اپنے ہاتھوں دلہن بنا کر ڈولی میں سوار کرنا ہے اور اُسے رخصت کر کے خود کسی کونے میں لگ کر رونا اور صرف رونا ہے۔

اوم! لاایتہ!

زندگی کا چکر کیسی کیسی شدنیوں میں سے گزرتا ہے۔ یہ ننھا سا قطرہ کیسے کیسے خون کے دریا عبور کرتا ہے لیکن اس محبت میں غم ہے، ملال نہیں۔ درد ہے اضطراب نہیں۔ دکھ ہے پچھتاوا نہیں۔ یہ کائنات کی تخلیق کا راز فاش کرتی ہے۔ یہ دل میں خدا کی پہچان کا شعور دیتی ہے۔ یہ وہ سنگدل خاوند ہے جو اپنے ساتھ محبت کرنے والے کو بھی چتا پر لے جاتا ہے۔ تاہم اس چتا کے شعلوں میں گلزار کی ایک کیفیت بھی ہے۔ یہ آگ روح کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی امر اور غیر فانی بنا دیتی ہے صبا کو میں نے تمہارے ریشمی رومال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا نہ ہی اُس نے مجھ سے اس بارے میں کچھ پوچھا ہے۔ اُسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ صبا کی محبت مجھے اسی لئے پسند ہے کہ اس نے ان باتوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اجنبی لڑکی! تمہارے ساتھ معاملہ بالکل الٹ ہے۔ تم نے رومال پرانے گلی کوچوں کی ایک چق کے پیچھے سے بھیجا ہے مگر اس محبت کا پھول گرد اڑاتے بس سٹاپ پر، فٹ پاتھ کے پتھروں میں کھلا ہے۔ کیا تم ان دو نیلے آفاق کے سرے ملا سکو گی؟ نہیں --- شاید کبھی نہیں، اس لئے اپنی محبت کے پریم پتر کو جیومیٹری بکس میں سے نکال کر اسے اپنے گھر میں اُس بڑے صندوق میں مقفل کر دو جہاں تمہارے جہیز کا سامان محفوظ ہے ۔ جس دن تمہارا بیاہ ہو تو دوسرے سامان کے ساتھ اس پریم پتر کو بھی اپنے نئے گھر میں لے جانا۔ اس پر سب سے زیادہ حق تمہارے ہونے والے شوہر کا ہے۔ جی لگا کر پڑھو۔ خوبصورت اور ہلکی چیزیں کھاؤ۔ کھلے میدانوں اور صاف ستھرے جنگلوں کے بارے میں سوچو۔ سہیلیوں میں بیٹھ کر جی بھر کر ہنسو گھر والوں کی خدمت کرو۔ خوشبودار صابن سے نہاؤ، بہترین عطر لگاؤ، فضول اور واہیات لطیفے سنانے والی سہیلیوں سے پرہیز کرو۔ رات کو سونے سے پہلے ہرے بھرے گنجان جنگلوں کی بارش اور گہری سبز جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھول کا تصور ذہن میں لاؤ اور سو جاؤ۔ صبح منہ اندھیرے جب تم اٹھو تو تمہارا دل سمندر کی طرح وسیع اور کھلا ہو اور اس کی سطح پر جنوب مشرق سے آنے والی عطر بیز ہوائیں چل رہی ہوں۔ اس کے باوجود اگر تمہارا دل تمہارے قابو میں نہیں اور تمہیں ضرور کسی نہ کسی سے محبت کرنی ہے تو پھر اپنے کمرے کی کھڑکی کے آگے ایک چق ضرور لگاؤ، چق کے پیچھے کمرے میں گلاب کی مہک والی اگربتیاں سلگاؤ، گیندے کے کیسری پھول کتابوں کے

پاس میز پر ڈھیر کر دو اور ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے اپنی کبھی ہاتھ نہ آنے والی محبت کی یاد میں ڈوب جاؤ میں تمہیں اگربتیوں کی خوشبو میں آنکھیں بند کئے پھولوں کے ڈھیر کے پاس روتا ہوا دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن اس بیمار شہر کے دھول اڑاتے ہوئے ہسپتال میں بستر عشق پر لیٹے ملال اور پشیمانی کے بے رنگ آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر تمہیں کالج گیٹ سے اس بس میں سوار ہونا ہی ہے تو پھر کوشش کرو کہ تمہارا آخری سٹاپ باغ جناح کے پھولوں بھرے اکیلے کنج ہوں یا کسی اندھیری گلی کا ویرانہ ہو لیکن کسی جعلی لیڈی ڈاکٹر کا ہسپتال نہ ہو۔

سورج آسم کے درختوں میں چھپ گیا ہے۔

ویران باغ میں سرد رات کا اولین اُداس اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ صبا میری پیالی میں تازہ چائے ڈال کر سبک قدم اٹھاتی پرانی حویلی کے آسیبی اندھیروں میں گم ہو گئی ہے۔ مجھے یاد ہے جب وہ میرے قریب سے گزری تھی تو اس کی ساری کا آنچل میری کہنی کو چھو گیا تھا تمہارا ریشمی رومال میرے ہاتھ میں ہے اور میں سگریٹ سلگائے آنکھیں بند کئے خاموش ہوں۔ رومال میں سے حنا کی مہک دھیرے دھیرے اڑتی جا رہی ہے۔۔ اندھیرا چپ چاپ آسم کے درخت، سردی، ریشمی رومال، حنا کی خوشبو، سبز چائے سے بھرا ہوا سماوار اور دل اس لڑکی کی یاد سے بھرپور، جو مجھے کبھی نہیں ملی اور جو کبھی نہیں ملے گی، جو ہر وقت میرے ساتھ ہے اور مجھ سے کبھی جدا نہیں ہو گی۔ ایک سوکھا پتا اندھیرے میں ٹوٹ کر میرے کندھے پر آن گرا ہے۔

صبا! کیا یہ تم ہو؟

کافور کے پھُول

موتیے کے سفید پھولوں سے ڈھکی ہوئی میّت جنازہ گاہ کے اندر محراب میں رکھی ہوئی ہے۔ اگلی صف والے انتہائی خاموشی کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ پچھلی صف والے بھی چپ ہیں کبھی کبھی کوئی آدمی آہ بھر کر سہمے لہجے میں اللہ کا نام بول کر پھر خاموش ہو کر سر جھکا لیتا ہے۔ تیسری قطار میں کچھ لوگ کسی لمبے یونہی کھسر پھسر کر لیتے ہیں چھت پر لگا تنہا پنکھا چل رہا ہے۔ مولوی صاحب سب سے آگے بیٹھے ہیں وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کا بھاری وجود دائیں بائیں ہل رہا ہے۔ وہ بے چین ہو کر کسی وقت باہر نظریں دوڑاتے ہیں، جہاں لوگ حوض کے ارد گرد بیٹھے وضو کر رہے ہیں۔ کوئی زور زور سے ناک صاف کر رہا ہے۔ کسی نے پورا ہاتھ حلق کے اندر ڈال رکھا ہے اور زور لگا کر کھانس رہا ہے۔ تالاب کی لال لال مچھلیاں بھاگ کر نیچے چلی گئیں ہیں۔

گرمی بہت تیز ہے۔ دھوپ اپنے زور پر آئی ہوئی ہر شے کو جھلسنے کی کوشش کر رہی ہے مگر جنازہ گاہ کے اندر قدرے سکون ہے پھر بھی پچھلی قطار والے بڑے پریشان ہو رہے ہیں۔ ایک آدمی آہستہ سے گھڑی دیکھتا ہے اور دوسرے کے کان میں کہتا ہے:

"بڑی دیر ہو گئی۔"

دوسرا آدمی کئی کام اُدھورے چھوڑ کر میّت کے ساتھ آیا ہے وہ چپکے سے اُٹھتا ہے اور دروازے کے وسط میں کھڑے ہو کر "جماعت --- جماعت" کی آوازیں بلند کرتا ہے حوض کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ جلدی جلدی وضو کر کے آستینوں، رومالوں، دھوتیوں اور قمیض کے دامنوں سے منہ ہاتھ پونچھتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نماز جنازہ گہری خاموشی میں پڑھی جاتی ہے اور مرنے والے کے غم زدہ لواحقین میّت کو اٹھا کر جنازہ گاہ سے باہر نکلتے ہیں۔ باہر ایک پتلی سی پکی سڑک ہے جو میانی صاحب کے قدیم اور وسیع قبرستان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی بہاول پور روڈ کی طرف چلی گئی ہے۔ یہاں سے دائیں بائیں قبروں کے درمیان کئی ایک کچے راستے پھٹتے ہیں جو بیشتر شکستہ، ٹوٹی پھوٹی اور معدوم شدہ قبروں کے اوپر سے ہو کر گزرتے ہیں۔ بعض قبریں بارشوں کی وجہ سے بیٹھ گئی ہیں۔

بعضوں میں گہرے شگاف پیدا ہو گئے ہیں اور مردوں کی ہڈیاں صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ نئی بنی ہوئی قبروں پر پھولوں کے ہار پڑے ہیں جو تیز دھوپ اور گرمی میں کملا گئے ہیں۔ یہ پھول بھی ان سوئے ہوئے جنت مکینوں کی طرح صرف دو دن ہی اپنی بہار دکھلا کر مرجھا جائیں گے۔ قبر تڑخ جائے گی۔ ڈھیری میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ گور کن کو پیسے بھی دیجئے۔ وہ دو ایک دن تک پانی کا چھڑکاؤ بھی کرائے گا۔ لیکن مٹی کی ڈھیری کب تک سلامت رہ سکتی ہے۔ پکی قبروں کا حال بھی یہاں بہتر نہیں۔ تعویذ جوں کے توں موجود ہیں مگر نیچے سے مٹی بہہ گئی ہے۔ چنانچہ قبر پوری کی پوری ایک طرف کو جھک گئی ہے اور نیچے کے شگاف میں جنگلی خاردار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔

میت ان شکستہ، نیم شکستہ، پختہ، جھکی ہوئی، بیٹھی ہوئی، ارنڈ کی بد شکل جھاڑیوں میں چھپی ہوئی، امیر غریب، چھوٹے بڑے، بیڈروم میں استراحت کرنے والوں، فٹ پاتھ پر سونے والوں، دن میں دو دو بار دانت صاف کرنے والوں، گھنٹہ بھر کی محنت سے بالوں میں چھلے ڈالنے والوں، چھوٹی سی تکلیف پر بے چین ہو جانے والوں، مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کی بے جان، سرد خاک اڑاتی مٹی کی ڈھیریوں میں سے ہوتی ہوئی ایک تکیئے کے پاس سے گزرتی ہے۔ آنگن میں سلگتے ہوئے اُپلوں کا ڈھیر، نیم کے پیڑ پر لگا ہوا سبز جھنڈا، دو تین اندھیری سی کوٹھڑیاں، چھپر پر چڑھی ہوئی عشق پیچاں کی بیل، لکڑی کے کھمبے کے نیچے پڑے ہوئے پانی کے گھڑے، سائے میں کھجور کی میلی چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے، سوئے ہوئے، بھنگ گھوٹتے ہوئے، چمٹے سے چلم میں آگ دھرتے ہوئے۔ جٹا دھاری، پھولی ہوئی توند، موٹی گردنوں، سرخ آنکھوں اور پتلی پتلی ٹانگوں والے ملنگ---!

"ہاؤ--- لگے دم---"

میت تکیئے کے سامنے سے گزرتی ہے۔ سلفے کے نشے میں گھٹ ملنگ لال لال نیم وا آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھیلی ہوئی ننگی ران پر آہستہ آہستہ ہاتھ مارنے لگتا ہے۔ دوسرے ملنگ اس طرف بالکل دھیان نہیں دیتے۔ جیسے ان کے سامنے سے کوئی سواریوں سے لدا ہوا تانگہ گزر گیا۔ بھنگ گھوٹنے والا سبز بھنگ میں انگلی ڈبو کر اُسے چاٹتا ہے اور چٹخارہ بھر کر نعرہ بلند کرتا ہے۔

"سبز پری--- سدا ہری۔"

لنگوٹ پوش گور کن پسینے میں شرابور ہے اور لحد کے اندر گھسا کُھرپے سے دیواروں کی مٹی کھود رہا ہے۔ اس کا جسم مٹی میں لت پت ہے اور کھلی قبر کے اندر سے اس کے ہونکنے کی دبی دبی آواز آ رہی ہے۔

یہ آواز مجھے میانی صاحب کی ویران دوپہر کے سناٹے میں ہر جگہ سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ اسی درد انگیز آواز کا قبرستان ہے۔ اس مشقتی، پسینہ بھری کھوکھلی عبرت انگیز آواز میں پیٹ کا جہنم منہ کھولے ہونک رہا تھا۔ جب میری ملاقات پینسٹھ سالہ حیدر آباد دکن کے محمد سالم سے ہوئی تو اُس نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بتایا۔

"مجھے دس سال سے پیٹ کی تکلیف ہے۔ میں سن چودہ سے قبریں کھود رہا ہوں۔ بڑی جان ماری کا کام ہے صاحب! گھٹنے پیٹ کے ساتھ جوڑ کر گھنٹوں مٹی کھودنی پڑتی ہے میری انتڑیوں میں گانٹھیں پڑ گئی ہیں۔ جب درد ہوتا ہے تو بڑا تڑپتا رہتا ہوں۔ پر کیا کروں جی، چھ بچے ہیں۔ اکیلا آدمی ہوں، کئی بار یہ کام چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ پھر چپکا ہو کر بیٹھ رہا۔ یہ قبر تو زندگی میں ہی مجھ سے چمٹ گئی ہے۔"

"آپ کو اجرت کیا ملتی ہے؟"

"ہماری اجرت چھوڑیئے صاحب--- اُجرت تو ہمارے مالک لیتے ہیں۔ ہم تو بس تین چار روپے روز پر گزارہ کر رہے ہیں۔ ریشمی دھوتیاں اور پمپ شو تو مالک ہی پہنتے ہیں۔ ہمارے سروں میں قبر کی مٹی ہر وقت دھنسی رہتی ہے لیکن اُن کے سروں میں چنبیلی کا تیل ہوتا ہے۔"

محمد سالم نے بتایا کہ وہ حیدر آباد (دکن) میں کسی دفتر میں چپڑاسی تھا۔ لاہور میں آ کر وہ نوکری کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ اپنے ایک دوست کی وساطت سے قبرستان میں نکل آیا اور یہاں قبریں کھودنے پر ملازم ہو گیا۔ یہ سن 14ء کی بات ہے جب سے لے کر آج تک وہ بدستور گور کنی کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ محمد سالم بھی ہملیٹ کے گور کن کی طرح زندگی پر بڑے ظریفانہ اور طنزیہ انداز میں گفتگو کرے گا، بڑا خوش باش ہو گا اور کھوپری ہاتھ میں اُچھال کر کہے گا:

"ہاہا--- زندگی--- آغاز--- انجام--- یہ مڑی ہوئی ناک والا آدمی بڑا کنجوس تھا۔ سونے کا بپاری --- اس کھوپڑی نے کئی لوگوں کی زندگیاں برباد کرنے کی سکیمیں سوچی

تھیں۔ اور یہ دوسری کھوپڑی --- یہ کبھی ایک جادو اثر شاعر کی گردن پر ہوتی تھی۔ اس میں بڑے بڑے حسین خیالات جنم لیا کرتے تھے اور اب۔"

اس کے بعد وہ کھوپڑی کو الٹاتا تو اندر سے مٹی گرنا شروع ہو جاتی مگر یا تو محمد سالم نے ہملیٹ کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور یا پھر ڈنمارک کے اُس فلسفی گورکن کی ملاقات کبھی میانی صاحب کے اس ہڈیوں کے ڈھیر گورکن سے نہیں ہوئی تھی کیونکہ محمد سالم نے میری تمام فلسفہ خیز باتوں کے جواب میں اپنے سوکھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا:

جب سے یہ دھندا شروع کیا ہے پیٹ میں مستقل درد رہنے لگا ہے۔ خوشیا کہتا ہے ناف پرانی ہو گئی ہے اپریشن کراؤ اپریشن --- پر کیا کریں جی --- میں ہسپتال جا کر پڑ رہوں تو گھر والوں کو کون کھلا؟"

اس سدا کے روگی گورکن نے مجھے بڑا نا امید کیا۔ کہنے لگا کہ سن 14ء سے لے کر آج تک اس قبرستان میں کوئی محیرّ العقول واقعہ نہیں گزرا۔"

"صرف ایک بار ایسا ہوا کہ میں رات کو قبر کھود رہا تھا کہ اچانک جو دیوار پر کھرپہ مارتا ہوں تو دیوار ڈھے جاتی ہے اور نیچے سے ایک قبر کی لحد نمودار ہوئی۔ وہاں ایک کفن پوش مردہ لیٹا ہوا تھا۔ حالانکہ اس جگہ ساٹھ ستر سال سے کبھی کوئی قبر نہیں بنائی گئی تھی۔ یہ قبر کم نہ زیادہ سو سال پرانی ہو گی۔ لیکن بابو جی کفن بالکل سفید اور بے داغ تھا۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی مردے کو لٹایا ہو۔ میں نے کفن کو ہاتھ لگایا تو وہ آٹا ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً قبر بند کر دی۔ اللہ سب کے گناہ معاف کرے جی۔ نیک آدمی کا جسم بالکل خراب نہیں ہوتا بابو جی۔ قیامت تک ویسے ہی پڑا رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "بابا تمھیں رات کو یہاں ڈر نہیں لگتا۔"

بوڑھا ہنسنے لگا۔

"بابو جی ڈر کیا؟ ڈر تو ہمیں شہر کی سڑکوں پر ہوتا ہے کہ کوئی گاڑی اوپر سے نہ گزر جائے۔ یہاں تو صرف خدا کا ڈر ہوتا ہے اور کسی کا نہیں۔"

"تمھیں کتنی مزدوری ملتی ہے؟"

"اجی کیا مزدوری ملتی ہے ہمیں صاحب --- بس یہی دو ڈھائی روپیہ روز --- عیش تو اس قبرستان کے مالک کر رہے ہیں۔ ہمارے پاؤں میں جوتا تک نہیں اور وہ ریشمی دھوتی

اور پمپ شو پہن کر پھرتے ہیں اور روز منڈوا (سینما) دیکھتے ہیں۔"

محمد سالم حقہ گڑگڑانے لگا۔ میں نے اپنا سگریٹ گورکن کی چلم سے سلگایا اور آگے چل پڑا۔ قبرستان میں سناٹا طاری تھا۔ لسوڑے کے بد صورت پیڑ پر بیٹھا ایک کوا کائیں کائیں کرتا ہوا اڑ گیا۔ اس کی چونچ سے روٹی کا باسی ٹکڑا چھوٹ کر نیچے جس قبر کے تعویذ پر گرا وہاں لکھا تھا۔

مرقد جناب------

ایس ڈی او (ادیب فاضل و منشی فاضل)

خدا اس شخص کی روح پر انوار رحمت کی بارش کرے!

بہاول پور روڈ پر سڑک کنارے خشک سرکنڈوں کے درمیان اونچے سے شکستہ چبوترے پر ایک قبر پر لکھا تھا۔

اک شاعر نوجوان کی تربت

اختر شیرانی

تاریخ وفات 5 ستمبر 1948ء

گل پوش وادیوں کے مشکبار کنجوں میں اپنی محبوبہ سے ملنے والے شاعر کی تربت پر گلاب کا کوئی کاغذی پھول بھی نظر نہ آیا۔

اسی تربت کی بغلی سڑک پر گھوم جائیے تو بائیں ہاتھ کو ذرا آگے جا کر ایک جگہ ذرا نشیب میں جا کر ایک پمپ لگا ہے۔ پاس ہی منہ بند پرانے ویران کنوئیں کی کھنڈر نما منڈیر کے عقب میں ایک کوٹھڑی ہے، جس کے باہر چارپائی پر ایک ہٹی کٹی، موٹی کالی جوان عورت اپنے نیم عریاں پیٹ پر تھن مٹھنا کالا بھجنگ بچہ لٹائے دودھ پلا رہی ہے۔ دوسری بوڑھی عورت چولھے میں اوپلے سلگا رہی ہے اوپر شہتوت اور نیم کے درختوں کی گنجان ٹہنیاں پھیلی ہوئی ہیں درخت کے پاس ہی ایک بکری بندھی ہے۔ ایک سیاہ رنگ، زرد چشم، بھوت نما سوکھا سوکھا گورکن پٹھے کاٹ رہا ہے۔

"کیوں بابا! یہاں آغا حشر کا مزار کہاں ہے؟"

بوڑھے نے اپنی دہشت ناک پیلی پیلی جلادوں ایسی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہ سامنے ہے۔"

زرد چشم گورکن پٹھے کاٹنے لگا۔ کٹک --- کٹک --- کٹاک ---

روم کے گلی کوچوں میں آگ لگا دینے والے، غدار یہودی کو شعلہ فشاں زبان عطا کرنے والے، رستم کو سہراب سے لڑانے والے اور کلکتہ و بمبئی کی تماشہ گاہوں پر راج کرنے والے جادو بیان حکمران کی قبر پر سوائے عبرت کے اور کچھ نہ تھا۔ سیمنٹ کے پرانے چبوترے پر چاروں طرف لوہے کی بینگی ٹیڑھی سلاخیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ میں نے گورکن سے پوچھا کہ یہ کب سے ایسی پڑی ہے؟"

زرد چشم خوفناک گورکن نے کہا:

"جب سے بنی ہے۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور قبرستان کی پتلی سی سڑک پر آ گیا۔ میں بہت جلد اس مرگ زار، زندگی سے نفرت کرنے والی بے روح، بے حس، پتھر دل، سرزمین سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ یہاں نیک اور انتہائی بیش قیمت ہستیوں کے جسم دفن تھے مگر اُن کے مزاروں کی ویرانی اور بے کسی کو دیکھ کر زندگی سے نفرت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ دل میں یہی ایک خواہش بار بار پیدا ہوتی تھی کہ یہاں سے دفتر جانے کے بجائے سیدھے حجام کی دکان پر چلئے--- سر منڈائیے، لنگوٹ باندئیے، انگ بھبوت رمائیے اور چھانگے مانگے کے جنگل میں نکل جائیے۔

لیکن میں چھانگے مانگے کے جنگل کی بجائے کافی ہاؤس جا کر خوشبودار خوش ذائقہ کافی پیتے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ کابلی والا کی انسانی درد سے لبریز کہانی ماؤنٹنی کلفٹ کی اداکاری، منٹگمری کے میٹھے خوشبو دار خربوزوں اور لو بو بریجیڈا اور صوفیہ لورین کے زندگی کی گرم پرخوں آرزوؤں سے بھرپور خوب صورت جسمانی خطوط پر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ مجھے زندگی سے محبت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ زندگی میں کبھی موت سے مٹھ بھیڑ ہو۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا بھی تو میں اس دنیا میں موجود نہ ہوں گا۔

اس کے باوجود دل نے کہا ذرا گوروں کے قبرستان کی سیر بھی ہو جائے۔ سنا ہے وہاں کے سایہ دار درخت سورج مکھی کے پھول اور پرسکون روشیں عبرت کی بجائے زندگی

سے والہانہ محبت کا سبق دیتی ہیں۔ چنانچہ میں شہر کی ایک جدید اور ماڈرن آبادی کے پہلو میں سوئے ہوئے انتہائی چپ چاپ عیسائی قبرستان میں آن داخل ہوا۔ لکڑی کی کاٹج نما عمارت کے دروازے میں سے گزر کر سامنے سرو اور آسلے کے اونچے گھنے درختوں کے درمیان سے ہو کر جانے والی ایک خوب صورت سی پرسکون روش تھی۔ جس کے دونوں جانب سنگ مرمر کے سفید مجسموں کے سایوں میں بڑی ترتیب اور نظم کے ساتھ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ قبروں کے سرہانے بڑے نادر اور خوبصورت گلدان رکھے تھے جن میں لالہ اور سورج مکھی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ بوڑھے مالی نے بتایا کہ پھولوں والی قبروں کی دیکھ بھال اور رکھ رکھاؤ کے لئے لواحقین کو بیس روپے سال ادا کرنے پڑتے ہیں۔

"جی ہاں ---- یہاں عام طور پر ایک اچھی قبر کے لئے دو سو روپے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جو غریب ہوں ان کا کفن تو کارپوریشن ادا کرتی ہے۔ اور قبرستان، زمین اور قبر کی کھدائی کا خرچ خود ادا کرتا ہے۔ اگر قبر پر پھول لگانا چاہیں تو یا بیس روپے ماہانہ ادا کریں اور یا یک مشت قیامت تک کے لئے پانچ سو روپے ادا کر دیں۔ قبر پر روز حشر تک کے لئے پھول کھلتے رہیں گے۔ اور ہاں ---- گاڑی کا پچیس روپے کرایہ الگ ہے۔ ---- اس کے علاوہ کچی قبر کے پچپن روپے چارج کرتے ہیں اور اگر پکی قبر بنانی ہو تو ایک سو تیس روپے چارج ہوتے ہیں۔"

اب میں اس پلاٹ میں تھا جہاں بچوں کی قبریں تھیں۔ تقریباً ہر چھوٹی پختہ قبر کے اوپر سفید براق پروں والے معصوم صورت فرشتے کا مجسمہ قبر پر جھکا ہوا تھا۔ چاروں طرف گلاب اور لالہ کے سرخ پھولوں کے جھرمٹ خوشبوئیں اڑا رہے تھے۔ محمد علی گورکن، جس کی تنخواہ پچپن روپے ماہوار تھی اور جو اس سے پہلے کتابوں کا دھندہ کیا کرتا تھا میرے ساتھ تھا۔ کہنے لگا:

"جناب! یہ بڑی ہستی والوں کے بچوں کی قبریں ہیں۔"

"اور ---- اور چھوٹی ہستی والے بچوں کی قبریں کہاں ہیں محمد علی؟"

"ادھر آئیے۔"

اب ہم ایک ایسے پلاٹ میں داخل ہوئے جہاں زمین کلری تھی اور گھاس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ جگہ جگہ اینٹوں کے چوکھٹے میں چھوٹی چھوٹی کچی ڈھیریاں دھوپ میں ویران پڑی

تھیں۔ ہر ڈھیری پر سیمنٹ کی ایک ٹوٹی پھوٹی شکستہ صلیب اوندھے منہ دھری تھی۔ یہ غریبوں کے بچے تھے، سڑکیں صاف کرنے والوں، گرجوں کی رکھوالی کرنے والوں، ولائتی فرموں کے چپراسیوں، سگار منہ میں دبا کر بیئر پینے والے، لال لال منہ والے، گوروں کے خانساموں اور ریلوے کے عیسائی خاک روبوں اور بھوت نما انجنوں کی دہکتی بھٹیوں میں کوئلہ جھونکنے والے عیسائی فائرمینوں کے بچے تھے جن کی شکستہ خاک اڑاتی، صلیب کے بوجھ تلے دبی ہوئی قبروں پر کسی پر فشاں معصوم فرشتے کا مجسمہ نہ تھا۔ کسی گلاب کی جھاڑی پر پھول نہ کھل رہا تھا۔ خاک تھی اور دھوپ تھی۔

یہاں طبقاتی تمیز نے موت کی آخری سرحد تک بھی پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ غریب کی غریبی کا چیتھڑا عدم آباد کے ویرانوں میں بھی اس کے ساتھ ساتھ لٹکتا جا رہا تھا۔ اس پر فضا اور پھولوں سے لدی ہوئی اونچ نیچ اور نشیب و فراز سے تومیانی صاحب کا مساواتی ویرانہ ہزار درجے بہتر ہے

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

محمد علی گورکن نے سب سے آخر میں مجھے جو پلاٹ دکھلایا وہاں دو تین قبروں کے منہ کھلے تھے اندر دیواروں پر سیمنٹ کا پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اور پختہ اینٹیں چنی ہوئی تھیں۔ محمد علی نے بتایا:

"ہمیں تین چار قبریں ہر وقت تیار رکھنی پڑتی ہیں۔ کیا خبر کوئی مردہ کس وقت آ جائے اور آپ جانتے ہیں کہ سیمنٹ والی پختہ قبر عین وقت پر تیار نہیں ہو سکتی۔"

میں ایک خالی کھلی قبر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے پختہ فرش پر ایک ہرا ٹڈا ٹانگ اٹھائے رینگ رہا تھا۔ میں نے سوچا اس قبر کا مردہ خدا جانے کہاں ہو گا۔ شاید کسی خوبصورت ڈائننگ روم میں کھانوں اور شرابوں سے لدی ہوئی میز پر دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھا وحشیوں کی طرح کھاتے ہوئے قہقہے لگا رہا ہو۔ شاید کسی دفتر میں بیٹھا اپنے امریکہ کے دفتری دورے کا پروگرام بنا رہا ہو۔ شاید کسی کلب گھر کے کونے میں اپنی ہونے والی بیوی کو گلے سے لگائے اس کے ریشمی رخساروں پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہا ہو اور یا کسی کیفے کے ٹیلی فون پر جھکا اپنی محبوبہ سے کہہ رہا ہو:

"ہنی! آج شام گرفن کے بار روم میں انتظار کروں گا۔ ضرور آنا ---- ٹاٹا ---- !"

شریف آدمی

تکمیشن آرٹ پروڈکشنز کی پہلی فلم "اپنا جوتا اپنا سر" کی کاغذی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں۔ ہمارے ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور رائٹر خواجہ تسلی بخش کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ آپ نے شبانہ روز کی محنت سے فلم کی کہانی اور سکرین پلے تیار کر لیا تھا۔ اور اب میرے پاس بیٹھ کر میرے سر پر سوار ہو کر مجھ سے مکالمے لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے کچھ تراکیب اور کچھ الفاظ اپنی کاپی میں نوٹ کر رکھے تھے۔ یہ نوٹ بک وہ میرے سامنے کھول کر میز پر رکھ دیا کرتے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہر مکالمے میں اس نوٹ بک سے ضرور استفادہ کیا جائے۔ نوٹ بک کی چند ایک تراکیب اور الفاظ ملاحظہ ہوں:

قربانی، خدمتِ اسلام، سماج کے منہ پر تھپڑ، جوشِ ایمان، جوانی کا نشہ، غرورِ حسن، ظالم سماج، سرمایہ داروں کے ہتھکنڈے، رقیبِ روسیاہ، مزدور کا خون پسینہ، تیغِ ستم، سرکار، حضور، سبحان اللہ، چاندنی رات کی اٹھکیلیاں، بہار کی انگڑائیاں، خزاں کی جمائیاں، جاڑے کی رضائیاں، ایک نیام میں دو تلواریں، دانت کھٹے کر دوں گا، دانت اڑا دوں گا۔ اسلامی درّے، بکواس بند کرو، وغیرہ وغیرہ۔ میں چمٹی لے کر بیٹھ جاتا اور اور نوٹ بک میں سے ان لفظوں، جملوں اور ترکیبوں کو اٹھا اٹھا کر مکالمے والے رجسٹر میں درج کرتا جاتا۔ کئی الفاظ چمٹی کی آواز سن کر نوٹ بک میں سے کیڑے مکوڑوں کی طرح اٹھ دوڑتے خاص طور پر قربانی خدمتِ اسلام اور ظالم سماج تو ہمیشہ بھاگ جایا کرتے تھے اور مجھے ہر بار انھیں کسی نہ کسی کونے سے ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھا کر لانا پڑتا۔

خواجہ تسلی بخش کا جوتے بنانے کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا۔ پچھلی ربع صدی سے وہ قوم کے چال چلن کو بنانے یا بگاڑنے میں بڑا اہم رول ادا کر رہے تھے۔ فلم بنانے سے ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ قوم کے نونہالوں کو زندگی کی نئی اور ترقی پذیر قدروں سے روشناس کرایا جائے۔ خواجہ صاحب نے اپنی اجتہاد پسند طبیعت کی وجہ سے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی فلم میں ہیروئن کا چانس کسی نئی لڑکی کو دیں گے۔ چنانچہ اخباروں میں اعلان کے ساتھ ہی ہیروئن بننے کی خواہش مند لڑکیوں نے اپنی تصویریں بھجوانا شروع کر دیں۔ بعضوں نے فلم

کے دفتر کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ خواجہ صاحب کے ایک رشتہ دار جو عرصہ سات سال سے کویت میں بمشاہرہ ایک ہزار روپیہ ماہوار ملازم تھے چھٹیاں گزارنے لاہور آئے ہوئے تھے۔ ان صاحب کا نام دلگیر بخش تھا۔ ویسے آپ نوجوان تھے۔ خوبصورت تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خوش لباس تھے شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ طبیعت کے مذہبی اور پرانی وضع داری کے پیروکار تھے۔ فلم کمپنی کے دھندے کو غیر شرعی اور خرافات سمجھتے تھے اور تسلی بخش صاحب سے اکثر کہا کرتے کہ "میاں اس بیوپار میں کمائی ہونے سے رہی اسی روپے سے اگر تم اپنے کارخانے میں چمڑا صاف کرنے کا ایک پلانٹ اور لگوا لیتے تو ہزار روپیہ مہینہ نٹ آمدنی تو وہ پڑی تھی۔"

اس کے باوجود فلم کمپنی کے دفتر میں روزانہ آیا کرتے اور چپ چاپ بیٹھے یا تو فلمی رسائل کی ورق گردانی میں مشغول رہتے اور یا مجھے نوٹ بک میں سے الفاظ کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر رجسٹر پر ٹکاتے دیکھا کرتے۔

ایک روز کیا ہوا کہ دلگیر صاحب، تسلی بخش صاحب اور میں --- ہم تینوں دفتر کے کمرے میں بیٹھے تھے کہ ایک گھنگھریالے بالوں اور چوڑے ماتھے والا ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آیا اور خواجہ تسلی بخش کا پوچھنے لگا۔ خواجہ صاحب نے اس کے لئے کرسی منگوائی اور تشریف لانے کی وجہ پوچھی۔ نووارد نے ذرا آگے کو جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا:

"جی، آپ نے لڑکیوں کے لئے اشتہار دیا تھا؟"

"جی ہاں، جی ہاں، ضرور دیا تھا۔"

"بات یہ ہے جی کہ میں ---- میرا مطلب ہے میری لڑکی فلم میں کام کرنے کی خواہشمند ہے۔ میں اسے ساتھ تو نہیں لایا۔ لیکن اگر آپ کی مرضی ہو تو میں کل اسے لے آؤں۔"

خواجہ تسلی بخش نے اپنی داڑھی کھجائی۔ دلگیر صاحب نے نووارد کو گھور کر بڑے غصے میں دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ خواجہ صاحب نے خالص فلم والوں کے انداز میں پوچھا:

"آپ کی لڑکی کا نام کیا ہے؟"

"نیلم!"

"عمر کیا ہو گی؟"

"کوئی بیس ایک برس۔"

"قد۔"

باپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

"میرے یہاں آتی ہے۔"

"جسم کیسا ہے؟"

باپ کو شرم محسوس ہوئی، اس نے سر جھکا لیا اور ہاتھ ملتے ہوئے کہنے لگا:

"میں باپ ہوں ---- اور باپ کبھی اپنی بیٹی کو نظر بھر کر نہیں دیکھا کرتا۔"

دلگیر صاحب رسالہ ایک طرف پھینک کر بولے:

"لیکن جناب آپ نے یہ کیونکر گوارا کر لیا کہ کوئی دوسرا آپ کی بیٹی کو نظر بھر کر دیکھے؟"

نیلم کے باپ کا منہ زرد سا پڑ گیا۔ کھسیانا سا ہو کر بولا:

"دنیا میں کچھ حالات کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔"

دلگیر صاحب بولے:

"میں ایک بوڑھے کوچوان کو جانتا ہوں جس کی سات لڑکیاں ہیں۔ وہ صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہے اور اسے تو حالات نے کبھی مجبور نہیں کیا۔ آپ یہ کہئے کہ کچھ اپنی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔"

خواجہ تسلی بخش نے بیچ میں پڑ کر موضوع کا رخ بدل دیا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے روز جب وہ شخص اپنی بیٹی نیلم کو لے کر دفتر آیا تو ہمارے علاوہ کویت والے دلگیر صاحب بھی وہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ نیلم واقعی خوبصورت لڑکی تھی۔ بوٹا سا قد، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، رخساروں پر حیا کی چمک، موتیوں ایسے دانت، متناسب جسم، پتلی کمر، بھرے بھرے کولھے، فلم کے لئے انتہائی موزوں بدن تھا۔

خواجہ تسلی بخش کی تو باچھیں کھل گئیں۔ انھوں نے فوراً نیلم سے اپنی نئی فلم کا معاہدہ کر لیا۔ اب نیلم اپنے باپ کے ساتھ ہر روز ریہرسل کے لئے دفتر آنے لگی۔ میرا کام اسے مکالمے یاد کروانا اور میوزک ڈائریکٹر کا کام اسے رقص کے توڑے سکھلانا تھا۔ پہلے پہل تو وہ سب کے سامنے ناچتے ہوئے بڑی گھبرائی اور شرم سے دُہری ہو گئی۔ لیکن جب حالات

کی نزاکت کو بھانپ کر نیلم کا باپ محفل سے اٹھ کر خود ہی باہر چلا گیا تو ذرا سی کھلی۔ پھر نیلم کو ایکٹریس بننے کا شوق بھی بے حد تھا۔ معلوم ہوتا کہ کسی نے اسے پہلے ہی سے سمجھا رکھا ہے کہ اگر کامیاب ایکٹریس بننا چاہتی ہو تو محفل میں ناچتے ہوئے شرم کبھی محسوس نہ کرنا۔ چنانچہ اپنے باپ کے باہر چلے جانے پر نیلم نے ساڑھی کا پلو کس کر کمر سے باندھا اور کمر لچکا لچکا کر ریڈیو گرام پر بجنے والے ریکارڈ کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ ناچنے کے انداز میں کچا پن تھا، مگر نخروں میں بڑی پختگی تھی۔ دلگیر صاحب سگریٹ سلگائے نیلم کو ناچتے، کولھے مٹکاتے اور آنکھوں سے بڑے فحش اشارے کرتے دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں نیلم کے باپ کو صلواتیں سناتے رہے۔ جو محض دولت اور شہرت کی خاطر اپنی شریف بیٹی کو بھری محفل میں نچوا رہا تھا۔ انہوں نے خواجہ تسلی بخش کو بعد میں صاف صاف سنا دیا کہ اس لڑکی کو برے راستے پر ڈالنے میں اب آپ کا ہاتھ بھی شریک ہو گیا ہے۔ حشر کے روز خدا آپ سے بھی ضرور پوچھے گا۔ خواجہ صاحب نے داڑھی کھجا کر کہا:

"بھائی! یہ تو ہمارا دھندہ ہے اور پھر یہ فن کی خدمت ہے۔ خدانخواستہ ہماری نیت پر تم شک نہیں کر سکتے۔ جبکہ نیلم کا شریف باپ اسے خود یہاں لاتا ہے اور خود ہی ساتھ واپس لے جاتا ہے۔"

"کوئی شریف باپ اپنی بیٹی کو اس طرح نہیں نچوا سکتا خواجہ صاحب ----- شرافت ہر حال میں اپنی آب و تاب برقرار رکھتی ہے۔ شیر بھوکا مر جائے گا لیکن گھاس کبھی نہیں کھائے گا۔ جو شریف زادہ اپنی بیٹی کے نخروں کا سودا کرتا ہے۔ اس کی شرافت کو کہیں نہ کہیں ضرور پیوند لگا ہے۔ اس کی شرافت ایسی ہی ہے جیسے رنڈی کبھی کبھی نماز پڑھ لے۔ جب کوئی شریف باپ فن اور آرٹ کے چور دروازے سے بے غیرتی کے شیش محل میں داخل ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس کے خون میں کہیں بہت پیچھے بے حیائی کی آمیزش ضرور ہوئی ہے۔ جس طرح امرود کے پیڑ پر لوکاٹ کا پیوند لگا ہے۔ مصیبت یہ ہے ہم لوکاٹ کا پیوند تو اسی وقت دیکھ سکتے ہیں لیکن انسان کی جڑیں اپنی نسل کی پاتال میں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ ہمیں اس بے غیرتی کے پیوند کو تلاش کرنے کے لئے بہت دور تک جانا پڑتا ہے۔"

لیکن خواجہ صاحب، نیلم۔ اور نیلم کے باپ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ نیلم ایکٹریس بننے کے شوق میں دیوانی ہو رہی تھی۔ خواجہ صاحب فلم جلد سے جلد مارکیٹ میں

پھینکنا چاہتے تھے۔ اور نیلم کا باپ اس سنہری دور کا خواب دیکھ رہا تھا جب وہ اپنی مشہور و معروف ہیروئن بیٹی کے ساتھ لمبی گاڑی میں بیٹھا اپنی کوٹھی سے نکل کر سٹوڈیو جا رہا ہوگا۔ نیلم نے ناچ سیکھنے اور مکالموں کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈرامائی ادائیگی کے فن پر عبور حاصل کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اچھا خاصا ناچنے لگی۔ خواجہ صاحب نے بڑے زوروں سے نیلم کی پبلسٹی شروع کر دی۔ شوٹنگ شروع ہوئی تو دوسری فلم کمپنیوں والے کسی نہ کسی بہانے "اپنا جوتا اپنا سر" کے سیٹ پر آ کر نیلم کے درشن کرنے لگے۔ نیلم خوبصورت تو پہلے ہی تھی۔ اب جو میک اپ کر کے بیش قیمت بھڑکیلے لباس میں روشنیوں کے سامنے آئی تو لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی طرح اپنی فلمی اہمیت جتا کر نیلم سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیلم کا باپ جان بوجھ کر اپنی بیٹی کو موقع بہم پہنچاتا کہ وہ فلمی شخصیتوں سے بے تکلف ہو سکے۔ وہ اسے لیکچر پلاتا کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے پیش آنا چاہئے۔ یہی چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں جن پر قدم رکھ کر اسے شہرت اور دولت کے سنہری گنبد تک پہنچنا ہے۔ شروع شروع میں جی کڑا کر کے بڑی بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں مگر بیٹی ایک وقت ضرور آئے گا جب ہم دونوں ان قربانیوں کی پوری پوری قیمت وصول کریں گے۔

مگر نیلم فطرتاً شرمیلی لڑکی تھی۔ وہ سٹوڈیو میں یا فلم کے دفتر میں ہر ایک سے کھل کر بات کرتی، ہر مذاق میں شریک ہوتی مردوں کے ساتھ منہ پھاڑ کر ہنستی، بڑی بے نیازی سے کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں میز پر اٹھا لیتی۔ ڈانس ماسٹر کبھی یوں چٹکی بھر لیتا تو یوں مسکراتی گویا وہ ان باتوں کی عادی ہو گئی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے یہ باتیں زہر لگتی تھیں۔ اس کی شخصیت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک وہ نیلم تھی جو ہمیشہ دہرا دوپٹہ لے کر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی، جھاڑو دیتی، باپ کا بستر بچھاتی، اس کے لئے چائے بناتی، اور رات کو نماز پڑھ کر سو جاتی۔ دوسری نیلم کا سر ہمیشہ ننگا ہوتا۔ سینہ ہر وقت باہر کو نکلا ہوتا۔ وہ گندے سے گندے مذاق پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی اور ذرا نہ شرماتی۔ ذرا سے اشارے پر ساڑھی کا پلو کمر کے گرد لپیٹ بانہیں کھول دیتی اور رنڈیوں کی طرح کولھے مٹکا مٹکا کر ناچنا شروع کر دیتی۔ یہ نیلم کا بناوٹی روپ تھا۔ یہ اس کے فلمی شوق کا ناجائز "حمل" تھا۔ حقیقی نیلم چپ چاپ ایک طرف کھڑی سہمی ہوئی نظروں سے اس دوسری نیلم کو سینہ تانے نیم عریاں لباس

میں سٹوڈیو کی روشوں پر گھومتے دیکھا کرتی۔ خود وہ بھی گھریلو شرافت اور بازار کی بے حیائی کے درمیانی خلاء کو پُر نہ کر سکی تھی۔ اگر وہ اس خندق کو مردہ ضمیری کے ملبے سے پُر کر لیتی تو شائد اسے اپنی ذہنی کش مکش کی اذیت سے نجات مل جاتی۔ مگر ابھی تک وہ ایسا نہ کر سکی تھی۔ وہ گھر میں سٹوڈیو والی نیلم سے اور سٹوڈیو میں گھر والی نیلم سے بچتی پھرا کرتی۔ اس کی حالت تو اس بیوی کی سی تھی جو خاوند کے گھر میں اپنے ناجائز بچے کی پرورش کر رہی ہو۔

کویت والے دلگیر صاحب نے نیلم کے چہرے سے اس کی دلی کیفیات کا اندازہ کر لیا تھا۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ نیلم محض اپنے شوق کی خاطر ایسا کر رہی ہے اور اس کے دل میں ابھی تک اس بات پر جنگ ہو رہی ہے کہ وہ کونسی زندگی اختیار کرے۔ دلگیر صاحب دل کے بہت نیک اور خدا ترس تھے۔ خدمت خلق کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ نیلم کو راہ راست پر لا کر ہی دم لیں گے اور اس طرح ایک عورت کو، ایک ماں کو، ایک پوری نسل کو تباہی کے غار میں گرنے سے بچا لیں گے۔

انھوں نے خدا کا نام لیا اور اپنی تبلیغی مہم پر روانہ ہو گئے۔ انھوں نے پہلے تو یہ کیا کہ نیلم سے بے تکلفی شروع کر دی۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ اگر وہ ناصح مشفق کے روائتی لباس میں نیلم کے پاس گئے تو وہ انہیں منہ نہ لگائے گی چنانچہ دلگیر صاحب نے محبت کا بناوٹی جال پھیلا دیا۔ انھوں نے نیلم پر اپنی گفتگو اور حرکات سے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگے ہیں۔ دلگیر صاحب چوری چھپے نیلم کو تحفے تحائف دینے لگے۔ وہ چھ ماہ کی باتنخواہ چھٹی پر تھے۔ انھوں نے کویت سے آئی ہوئی اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ اس کارِ خیر پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ کبھی نیلم کے لئے ساڑھی لے آتے، کبھی کانوں کے بندے، کبھی کنگنوں کی جوڑی، اور کبھی عطر کی شیشی پیش خدمت کر دیتے، لیکن یہ سب کچھ دوسروں کی نگاہوں سے چوری چھپے کرتے، کیونکہ وہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دینا چاہتے تھے۔ ویسے بھی انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ وہ جھوٹ موٹ میں بدنام ہو جائیں۔ ادھر نیلم اسے سچ سمجھ بیٹھی۔ نقلی جذبات کے فلمی کاؤنٹر پر اسے کھوٹے سکوں کی منجمد آوازوں میں اصلی سکے کی جھنکار سنائی دی۔ تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح کاغذی پھولوں کے بیل بوٹے بنانے والے کے ہاتھ میں اتفاق سے اصلی پھول آ جائے۔ پہلے پہل

تو نیلم نے بھی دلگیر صاحب کے اظہارِ محبت کو روائتی سمجھا اور کوئی اہمیت نہ دی مگر جب اس نے دیکھا کہ دلگیر صاحب اسے ہر دوسرے تیسرے ایک آدھ تحفہ لا دیتے ہیں اور ان کے بدلے میں اس سے کسی شے کے بھی طالب نہیں ہوتے تو وہ ٹھٹھک سی گئی۔ نیلم جانتی تھی کہ دلگیر صاحب وہاں سب سے الگ اور خاموش شخصیت کے مالک ہیں اور اپنی زندگی میں بالکل غیر فلمی ہیں۔ ویسے بھی وہ خوش شکل تھے نوجوان تھے اور آنکھوں میں روشن ضمیری کی چمک رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ دلگیر صاحب کو جب کبھی موقع ملتا اسے فلمی زندگی کی برائیوں اور پُر سکون گھریلو زندگی کی اچھائیوں سے آگاہ کرتے رہتے۔ نیلم پہلے تو دلگیر کی شرافت پر مری پھر ان پر بھی مرنے لگی۔ دلگیر صاحب نے جب دیکھا کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا ہے تو انھوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ دوسری جانب نیلم کی فلمی سرگرمیاں بھی تیز تر ہو گئیں تھیں۔ صورت شکل کی اچھی ہونے کے علاوہ وہ ایکٹ بھی بہت اچھا کرتی تھی۔ "اپنا جوتا اپنا سر،" کے سیٹ پر جو کوئی نیلم کے کام کو دیکھتا داد دیئے بغیر نہ رہتا۔ انڈسٹری والے پہلے ہی بڑی بڑی ہیروئنوں کے نخروں اور ان کے بڑھتے ہوئے نرخوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ نیلم کی مانگ بڑھنے لگی۔ ابھی وہ پہلی فلم کے سیٹ پر ہی تھی کہ اسے دو تین اور فلموں کے کنٹریکٹ مل گئے۔ نیلم کا باپ پھولا نہ سما رہا تھا۔ دلگیر صاحب کی تشویش میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ نیلم جب بھی موقع نکال کر ان کے پاس آتی وہ اسے ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد سمجھانا شروع کر دیتے۔ نیلم پر ان کی نقلی محبت کا تو بھرپور اثر ہو رہا تھا لیکن ان کی تبلیغ بیکار ثابت ہو رہی تھی۔ کیونکہ نیلم نے گھر میں بیٹھ کر ایک عرصہ تک فلمی شوق کی پرورش کی تھی۔ اس شوق کو ایک پرجوش اور ہم خیال باپ نے ہوا دی تھی۔ دونوں نے مل بیٹھ کر ٹھنڈے دل اور گہری قوتِ ارادی کے ساتھ مستقبل کے فلمی منصوبے تیار کئے تھے اور ایک مدت تک فلمی دفتروں کی دربدری کے بعد اب نیلم کو زندگی کے افق پر کامیابی کے طلوع ہوتے سورج کی زرّیں جھلکیاں دکھائی دی تھیں۔ وہ پر خطر راستے عبور کر کے یہاں تک آئی تھی۔ اب تو منزل بالکل سامنے نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ بھلا کیسے پلٹتی؟

دلگیر صاحب اس کے کانوں میں ڈالتے جاتے کہ:

"جس کو تم منزل کہتی ہو وہ تباہی کا پہلا غار ہے۔ یہاں سے تمہاری زندگی کا ہولناک

سفر شروع ہو گا۔ اس ڈگر پر چلتے ہوئے جب تم اپنی منزل پر پہنچو گی تو تم سے اپنی شکل تک نہ پہچانی جائے گی۔ تمہاری حالت تو کانٹوں پر پھیلی ہوئی اس ریشمی قمیض کی سی ہے جسے ہر آدمی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تمہاری اصلی جگہ ایک گھر ہے جس کی رسوئی میں تم کھانا پکاؤ۔ نشست گاہ میں اپنے بچے کو دودھ پلاؤ اور آنگن میں اپنے خاوند کے دھوئے ہوئے کپڑے الگنی پر پھیلاؤ۔ تمہیں شاید اس حقیقت کی خبر نہیں کہ بڑی سے بڑی ایکٹریس کی عمر بھی پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اتنی مدت تک ہی وہ لوگوں کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ کھا کھا کر موٹی ہوتی ہے۔ اپنی آنکھوں پر اور اپنے ماں باپ کے دماغوں پر چربی چڑھاتی ہے۔ چھ یا زیادہ سے زیادہ سات سال کے بعد دن رات کا کام، شب بیداریاں، بے وقت کھانے، ہر وقت کی بے اعتدالیاں اور بے حیائیاں رنگ لے آتی ہیں۔ چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ جاتے ہیں جسم ڈھل جاتا ہے۔ لوگ بور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ مانگ کم ہو جاتی ہے۔ وقت گزر جاتا ہے۔ بے رخی اور بے تعلقی کا المناک دور شروع ہوتا ہے۔ اس وقت وہ شادی کی کوشش کرتی ہے جبکہ اس کے پاس خاوند کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ اتنی بڑی زندگی میں چھ سال کی لمحاتی شہرت کی خاطر اپنی عزت، عصمت، سکون قلب اور حیا کے زیور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تباہ کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اگر چھ سال بعد تمہیں سب کچھ لٹوا کر پھر اسی گھر کی دہلیز پر قدم رکھنا ہے تو پھر ابھی سے اس گھر کے دروازے سے باہر قدم نہ لے جاؤ۔ اپنی صحت، شرم، محبت کے جوہر اور عصمت کی خوشبو کو سٹوڈیوز کی گندی نالیوں میں ضائع کرنے کی بجائے اسے اپنے بچوں کے حوالے کرو۔ یہ ان کی امانت ہے۔------ تمہارا باپ صرف تمہاری ہی نہیں اپنی بھی قبر کھود رہا ہے۔"

"محبت کی باتیں کرو دلگیر! میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم ہو کہ یہ بے معنی باتیں لے بیٹھتے ہو۔ میں ملک کی سب سے بڑی ہیروئن بنوں گی اور اپنے فن سے ملک اور قوم کی خدمت کروں گی۔ مجھے اس راہ پر چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ میری زندگی کا مقصد ہے اور میں اس مقصد کو حاصل کر کے رہوں گی۔"

"خواہ اس کے لئے تمہاری عزت بھی چلی جائے؟"

"عزت کا دامن میرے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹے گا۔"

"دولت اور شہرت کا مالِ غنیمت ہر ایکٹریس کو عزت کے دامن ہی میں سمیٹنا

پڑتا ہے۔"

دلگیر صاحب نے نیلم کو سٹوڈیوز کی مذموم فضاؤں سے نکال کر اسے گھر کے باورچی خانے میں بند کرنے کی بہتیری کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وقت گزرتا گیا اور آخر ان کے کویت واپس اپنی نوکری پر جانے کی تاریخ آ گئی۔ اس روز نیلم بڑی اداس تھی۔ اسے تو واقعی دلگیر صاحب سے محبت ہو گئی تھی۔ اگرچہ نیلم کے گھنگھریالے بالوں والے باپ کو ان دونوں کے ملاپ کا بے حد کھٹکا تھا لیکن نیلم شوٹنگ چھوڑ کر دلگیر صاحب کو رخصت کرنے ریلوے سٹیشن جا پہنچی۔ دلگیر صاحب تو خیر کیا دلگیر ہوتے البتہ گاڑی روانہ ہوئی تو نیلم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نیلم کے آنسوؤں سے دلگیر صاحب بڑے متاثر ہوئے۔ وہ لاہور سے کراچی اور وہاں سے کویت تک اسی کے متعلق سوچتے چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر اگلے ہی روز انہوں نے نیلم کو ایک لمبا چوڑا خط لکھ ڈالا۔ جتنے روز تک نیلم کا خط نہ آیا دلگیر صاحب بے چین رہے۔ ایک روز تو اپنے دفتر کی میز پر کہنیاں ٹکا کر انہوں نے پوری سنجیدگی سے سوچا کہ کہیں وہ نیلم کی محبت میں مبتلا تو نہیں ہو گئے؟

نیلم کا خط آیا تو انہوں نے اسے بے اختیار چوم لیا۔ فوراً ایک لمبا سا خط لکھ ڈالا۔ جس میں پند و نصائح کے ساتھ ہی ساتھ محبت کی ہلکی ہلکی چاشنی بھی تھی۔ یہ خط و کتابت اب باقاعدہ شروع ہو گئی اور وقت کے ساتھ ساتھ دلگیر صاحب کی نصیحتوں کی جگہ محبت بھرے جملوں، جدائی کی اذیتوں اور گلے شکوؤں نے لے لی۔ یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ نیلم کی فلمی مصروفیتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ ملک کے عوام نے اسے ایک بہترین ہیروئن تسلیم کر لیا۔ اس کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ پہلے وہ صرف دو ہزار پر کام کرتی تھی اب اس کا گھنگھریالے بالوں والا باپ پندرہ بیس ہزار سے کم پر کسی طرح راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی گاڑی بھی خرید لی تھی۔ اپنا ایک چھوٹا سا بنگلہ بھی بنوا لیا تھا لیکن نیلم ابھی تک وہ خلیج پُر نہ کر سکی تھی جو گھریلو نیلم اور فلمی نیلم کے درمیان واقع تھا۔ اس کے ذہن میں دونوں زندگیوں کے تضاد کی کش مکش پوری طرح جاری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دلگیر صاحب کی محبت میں روز بروز جکڑی جا رہی تھی۔ کیونکہ ایسی متضاد شخصیتوں والی لڑکیاں عام طور پر دور پردیس گئے ہوئے عاشقوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔ اس محبت میں انہیں ایک رومانوی لذت ملتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ نیلم جس دنیا میں رہتی تھی وہاں سوائے جھوٹ کی محبت اور بناوٹی عاشقوں کی نقلی

باتوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نیلم تو دلگیر کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ اس کی محبت کی بنیاد خالص عشقیہ جذبات کی بجائے اس حقیقت پر زیادہ قائم تھی کہ دلگیر صاحب فلمی دنیا سے متعلق نہیں تھے۔

دو سال بعد جب دلگیر صاحب کویت سے چھٹی پر لاہور واپس آئے تو دونوں ایک دوسرے سے روائتی عاشقوں کی طرح ملے۔ نیلم تو دلگیر صاحب سے لپٹ گئی اور خوشی سے رونے لگی۔ دلگیر صاحب نے کویت کے ریشمی رومال سے جو فرانسیسی سینٹ کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا نیلم کے آنسو خشک کئے اور دونوں عاشق بیٹھ کر جدائی کے صدموں کی روئداد بیان کرنے لگے۔ نیلم چونکہ اب بہت مشہور ایکٹریس تھی اور بیک وقت سات فلموں میں ہیروئن کا اہم کردار ادا کر رہی تھی اس لئے فلمی اخبار والوں کو ایک سکینڈل ہاتھ آ گیا۔ اخباروں میں اس رومان کے چرچے شروع ہو گئے۔ نیلم اور دلگیر بڑے سٹ پٹائے، نیلم کے باپ نے نیلم کی طرف سے جھٹ تردید چھپوا دی۔ لیکن فلمی حلقوں میں اس نئے رومان کے متعلق چہ میگوئیاں برابر جاری رہیں۔ نیلم کے باپ کو اپنی بیٹی کی محبت کا باقاعدہ علم تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی چیک بک ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک روز اس نے نیلم کو سمجھایا کہ وہ دلگیر سے ملنا چھوڑ دے۔ اس طرح ان کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ نیلم نے کہا۔

"اگر سٹوڈیو میں ناچنے سے بدنامی نہیں ہوتی تو سچی محبت کرنے سے بدنامی کیوں ہونے لگی؟"

باپ کو طیش آ گیا۔ اس نے رات کو شراب پی کر نیلم کو خوب پیٹا۔ اگلے روز نیلم صبح ہی صبح گھر سے نکلی اور سیدھی دلگیر کے پاس آ گئی۔ اس نے انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ دلگیر صاحب سوچ میں پڑ گئے انھیں نیلم سے محبت ضرور تھی مگر انھیں اپنی خاندانی شرافت کا بھی بڑا خیال تھا۔ انھوں نے کہا:

"لیکن ایک شرط ہے۔"

"کونسی شرط؟" نیلم نے کہا۔

"شادی کے بعد تمھیں فلمی زندگی بالکل ترک کر دینی ہو گی۔"

اب نیلم سوچ میں پڑ گئی۔ کیونکہ اس پر تمام فلموں کی ذمہ داری تھی جن میں وہ کام کر

رہی تھی۔ اور جن کا وہ کافی ایڈوانس بھی لے چکی تھی۔ اس نے جب اپنے ہونے والے خاوند سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا تو اس نے کچھ پس و پیش کے بعد نیلم کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی زیرِ تکمیل فلموں میں کام کر سکتی ہے۔

"لیکن ان فلموں کی تکمیل کے فوراً بعد تمھیں فلمی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری بیوی کو پردے پر دوسروں سے عشق کرتے دیکھیں۔"

"مجھے کب گوارا ہے۔ میں تو خود اس مصنوعی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں اور اپنا ایک پر سکون اور خاموش گھر بسانا چاہتی ہوں۔ جہاں میری زندگی صرف میرے بچوں اور میرے خاوند کے لئے وقف ہو۔"

اور پھر یوں ہوا کہ نیلم سٹوڈیو سے نکل کر سیدھی ایک ایسی کوٹھی میں پہنچی جہاں دلگیر صاحب اپنے چند ایک دوستوں اور ایک مولوی صاحب کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی دن دونوں کی شادی ہو گئی اور نیلم اپنے باپ کے گھر جانے کی بجائے اپنے خاوند کے بنگلے میں رہ گئی جو دلگیر صاحب نے 300 روپے ماہوار کرایہ پر لے لیا تھا۔ فلمی دنیا میں اس شادی کی دھوم مچ گئی۔ فلمی اخباروں نے جلی سرخیوں میں شادی کا اعلان کیا اور دعوئے کیا کہ جیسا انھوں نے قیاس کیا تھا ویسے ہی ہوا۔ نیلم کے باپ پر تو گویا بجلی گر پڑی۔ اس کے ہاتھ سے چیک بک اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ نیلم نے دلگیر صاحب سے اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور اب وہ اس کی منکوحہ تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنی بربادی کے نقشے اس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔ نیلم اسے ہر ماہ تین سو روپیہ بھیج دیا کرتی۔ اب سٹوڈیو میں زیرِ تکمیل فلموں کی شوٹنگ کے لئے دلگیر صاحب نیلم کے ساتھ جاتے۔ وہ نیلم کو تنہا وہاں نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ مجبوراً انھیں اس کے ساتھ جانا پڑتا۔

وہاں وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھے رہتے اور کسی سے بات نہ کرتے۔ وہ بڑی بیتابی سے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب ان کی بیوی اپنے فلمی معاہدوں سے سبکدوش ہو جائے گی اور اسے پھر اسٹوڈیو نہیں آنا پڑے گا۔ مگر چھ سات فلموں کو مکمل ہونے کیلئے کافی عرصہ درکار تھا۔ دلگیر صاحب نے کویت والوں کو لکھ کر چھٹی بڑھالی۔ کیونکہ نہ تو ان کے پاس اتنا روپیہ تھا کہ وہ فلم والوں کو ان کا ایڈوانس روپیہ دے کر اپنی بیوی کو معاہدے کی

بندش سے آزاد کروالیتے۔ اور نہ ہی وہ نیلم کو اکیلا چھوڑ کر واپس جاسکتے تھے۔

اس طرح سال بھر کی مدت گزر گئی۔ اب دلگیر صاحب کی سٹوڈیو اور فلم والوں سے کافی شناسائی ہو گئی تھی اور بعض ڈائریکٹروں کے ساتھ تو بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ سیٹ پر بیٹھ کر وہ خوب چائے اور سگریٹ اڑاتے اور ڈائریکٹروں اور دوسری فلم ایکٹریسوں سے خوش گپیاں بھی کرتے۔ نیلم کے مزید معاہدے نہ ہونے سے انہیں ایڈوانس رقم ملنا بند ہو گئی تھی۔ زیر تکمیل فلموں کے جو تھوڑی بہت رقم باقی تھی وہی انہیں قسطوں میں وصول ہو رہی تھی۔ جس پر ان دونوں کا گزارہ ہو رہا تھا۔ کویت سے چھ ماہ تک تو پوری تنخواہ آتی رہی اس کے بعد انہیں نصف تنخواہ آنا شروع ہو گئی۔ ایک سال گزرا تو چھٹی بلا تنخواہ پر منظور ہوئی بنگلے کا کرایہ تین سو روپیہ تھا۔ نوکروں کی تنخواہیں گھر کا کھلا خرچ---- دلگیر صاحب کا ہاتھ تنگ ہونے لگا لیکن انھوں نے نیلم سے اس کا کوئی ذکر نہ کیا اور چپ چاپ حالات کا جائزہ لیتے گئے۔ نیلم نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ ہم نوکروں کو جواب دے دیں گے اور کم کرائے کا مکان لے کر وہاں جا رہیں گے۔"

لیکن دلگیر صاحب کے لئے یہ ایک بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ انھوں نے ہمیشہ کھلا خرچ کیا تھا اور نیلم کے پاس چلے آنے سے تو ان کا ہاتھ مزید کھل گیا تھا۔ موقع کی نزاکت کو بھانپ کر چند ایک ہدایت کاروں نے نئی فلموں کے معاہدے پیش کر دیئے۔ مگر نیلم نے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ اب اس بناوٹی اور گھناؤنی زندگی سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو جانا چاہتی تھی۔ ادھر دلگیر صاحب کو بھی بیوی کا ایکٹریس رہنا گوارا نہ تھا۔ انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ زیر تکمیل فلموں کا کام لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اور دوسری جانب دلگیر صاحب کا ہاتھ بھی تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انھوں نے دو نوکروں کو جواب دے دیا اور بنگلہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سی کوٹھی میں آ گئے۔ نیلم اب گھر میں خود ہی کھانا پکاتی کپڑے دھوتی پرانے کپڑوں کی مرمت بھی خود ہی کرتی۔ وہ اس گھریلو کام کاج میں بڑی خوش تھی مگر دلگیر صاحب خوش نہیں تھے۔ ایک خلش سی ان کے دل میں کھٹکنے لگی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے ضمیر سے جنگ کر رہے تھے۔ گھر میں وہ اداس اداس رہتے۔ ان کا اگر کہیں جی لگتا تو فلم کمپنی کے دفتروں یا سٹوڈیوز میں، جہاں وہ خوش فکرے پروڈیوسروں، باتونی ہدایت کاروں، عاشق مزاج ایکسٹرا لڑکیوں اور زہد شکن ایکٹرسوں سے جی بھر کر باتیں کر سکتے تھے۔ کویت میں وہ کبھی کبھار برانڈی پی لیا کرتے

تھے۔ ڈیڑھ سال فلمی ماحول میں بسر کرنے کے بعد انھوں نے شراب بھی شروع کر دی تھی۔ کویت والی نوکری انہیں عبور دریائے شور دکھائی دے رہی تھی۔ تپتے صحرا، ریت کے جھکڑ، تیل کی بو، مشینوں کی گڑگڑاہٹ---- کتنی غیر رومانی جگہ ہے کویت! جس دن نیلم نے اپنی آخری فلم میں کام ختم کیا اور گھر کی چار دیواری میں آ کر سکھ کا سانس لیا تو دلگیر صاحب کے دل پر جیسے کسی نے غم کی بھاری سل رکھ دی۔ اسی رات انھوں نے اپنے ڈائریکٹر دوست کے ساتھ خوب شراب پی اور گھر آ کر نیلم سے یونہی کسی بہانے سے لڑنا شروع کر دیا۔ اگلے روز وہی ڈائریکٹر نیلم کے پاس اپنی نئی فلم کا کنٹریکٹ لے کر آ گیا۔ اس نے معاہدہ اور ایڈوانس کا پانچ ہزار روپیہ میز پر رکھ دیا۔ نیلم نے صاف انکار کر دیا۔ ڈائریکٹر نے دلگیر صاحب کی طرف دیکھا۔ نیلم دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ دلگیر صاحب نے دوسرے کمرے میں جا کر نیلم کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا:

"آخر کنٹریکٹ کر لینے میں حرج ہی کیا ہے؟ یہ تمہارا فن ہے۔ فن کی خدمت ہے اور پھر ہمیں روپے کی ضرورت بھی تو ہے۔ بھلا ایسے کس طرح گزارا ہوگا۔"

نیلم نے عجیب نگاہوں سے اپنے خاوند کو دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دلگیر صاحب پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ ان کا حلق یوں کڑوا ہو گیا تھا جیسے انھوں نے زہر پی لیا ہو۔

مٹی کی مونالیزا!

مونالیزا کی مسکراہٹ میں کیا بھید ہے؟

اُس کے ہونٹوں پر یہ شفق کا سونا، سورج کا جشنِ طلوع ہے یا غروب ہوتے آفتاب کا گہرا ملال؟ ان نیم وا متبسم ہونٹوں کے درمیان یہ باریک سی کالی لکیر کیا ہے؟ یہ طلوع و غروب کے عین بیچ میں اندھیرے کی آبشار کہاں سے گر رہی ہے؟ ہرے ہرے طوطوں کی ایک ٹولی شور مچاتی امرود کے گھنے باغوں کے اوپر سے گزرتی ہے۔ ویران باغ کی جنگلی گھاس میں گلاب کا ایک زرد شگوفہ پھوٹتا ہے۔ آم کے درختوں میں بہنے والی نہر کی پلیا پر سے ایک ننگ دھڑنگ کالا لڑکا ریتلے ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگاتا ہے اور پکے ہوئے گہرے بسنتی آموں کا میٹھا رس مٹی پر گرنے لگتا ہے۔

سینما ہال کے بک سٹال پر کھڑے میں اس میٹھے رس کی گرم خوشبو سونگھتا ہوں اور ایک آنکھ سے انگریزی رسالے کو دیکھتے ہوئے دوسری آنکھ سے ان عورتوں کو دیکھتا ہوں جنھیں میں نے فلم شروع ہونے سے پہلے سب سے اونچے درجے کی ٹکٹوں والی کھڑکی پر دیکھا تھا۔ اس سے پہلے انھیں سبز رنگ کی لمبی کار میں سے نکلتے دیکھا تھا اور اس سے پہلے بھی شائد انھیں کسی خواب کے ویرانے میں دیکھا تھا۔ ایک عورت موٹی بھدی، جسم کا ہر خم گوشت میں ڈوبا ہوا، آنکھوں میں کاجل کی موٹی تہہ، ہونٹوں پر لپ سٹک کا لیپ، کانوں میں سونے کی بالیاں، انگلیوں پر نیل پالش، کلائیوں میں سونے کے کنگن، گلے میں سونے کا ہار، سینے میں سونے کا دل، ڈھلتی ہوئی جوانی، ڈھلا ہوا جسم، چال میں زیادہ خوشحالی، اور زیادہ خوش وقتی کی بیزاری، آنکھوں میں پُرخوری کا خمار اور پیٹ کے ساتھ لگایا ہوا بھاری زرتار پرس ---- دوسری لڑکی ---- الٹرا ماڈرن، الٹرا سمارٹ، سادگی بطور زیور اپنائے ہوئے، دبلی پتلی، سبز رنگ کی چست قمیض، کٹے ہوئے سنہرے بال، کانوں میں چمکتے ہوئے سبز نگینے، کلائی میں سونے کی زنجیر والی گھڑی اور دوپٹے کی رسی گلے میں، گہرے شیڈ کی پنسل کے ابرو، آنکھوں میں پرکار سحرکاری، گردن کھلے گریبان میں سے اوپر اٹھی ہوئی، دائیں جانب کو اس کا ہلکا سا مغرور خم، ڈورس ڈے کٹ کے بال، بالوں میں یورپی عطر کی مہک، دماغ گزری ہوئی کل کے ل سے ناآشنا، دل آنے والی کل کے وسوسوں سے بے نیاز، زندگی کی بھرپور خوشبوؤں اور سرتوں سے لبریز جسم، کچھ رکا رکا سا متحرک سا، کچھ بڑبڑاتا ہوا---- اس دودھ کی طرح جسے ال آنے ہی والا ہو۔ سر اینگلو پاکستانی، لباس پنجابی، زبان انگریزی اور دل نہ تیرا نہ میرا۔

بک سٹال والا انھیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کٹھ پتلی کی طرح ان کے گے پیچھے چکر کھانے لگا۔ اس نے پنکھا تیز کر دیا۔ کیونکہ لڑکی بار بار اپنے ننھے ریشمی رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ موٹی عورت نے مسکرا کر پوچھا:

"آپ نے "لک" اور وہ، ٹرو سٹوری، نہیں بھجوائے"

سٹال والا احمقوں کی طرح مسکرانے لگا۔

"وہ جی اب کے ہمارا مال راستے میں رک گیا ہے۔ بس اس ہفتے کے اندر اندر سرٹنلی ھجوا دوں گا۔"

موٹی عورت نے کہا:

"پلیز ضرور بھجوا دیں۔"

لڑکی نے فوٹوگرافی کا رسالہ اٹھا کر کہا:

"پلیز اسے پیک کر کے گاڑی میں رکھوا دیں۔"

بک سٹال والا بولا:

"کیا آپ انٹرول میں ہی جا رہی ہیں۔"

موٹی عورت بولی:

"یس---- پکچر بڑی بور ہے۔"

انھوں نے ساڑھے تین تین روپے کے ٹکٹ لئے تھے۔ پکچر پسند نہیں آئی۔ لمبی کار ا دروازہ کھول دیا گیا۔ اور کار دریا کی پُرسکون لہر کی طرح سات روپوں کے اوپر سے گزر گئی۔ ہ سات روپے جن کے اوپر سے لوہاری دروازے کے ایک کنبے کے پورے سات دن زرتے ہیں۔

ور لوہاری دروازے کے باہر ایک گندہ نالہ بھی ہے۔ اگر آپ کو اس کنبے سے ملنا ہو تو اس ندے نالے کے ساتھ ساتھ چلے جائیں۔ ایک گلی دائیں ہاتھ کو ملے گی۔ اس گلی میں سورج بھی نہیں آیا۔ لیکن بدبو بہت آتی ہے۔ یہ بدبو بہت حیرت انگیز ہے۔ اگر آپ یہاں رہ

جائیں تو یہ غائب ہو جائے گی۔ یہاں صغرا بی بی رہتی ہے۔ ایک بوسیدہ مکان کی کوٹھڑی مل گئی ہے۔ دروازے پر میلا چکٹ بوریا لٹک رہا ہے، پردہ کرنے کے لئے --- جس طرح نئے ماڈل کی شیور لیٹ کاروں میں سبز پردے لگے ہوتے ہیں۔ صحن کچا اور نم دار ہے۔ ایک چارپائی پڑی ہے۔ ایک طرف چولھا ہے۔ اپلوں کا ڈھیر ہے۔ دیوار کے ساتھ پکانے والی ہنڈیا مٹی کا لیپ پھیرنے والی ہنڈیا اور دست پناہ لگے پڑے ہیں۔ ایک سیڑھی چڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ ہے۔ کوٹھڑی کا کچا فرش سیلا ہے۔ درودیوار سے نم دار اندھیرا رس رہا ہے۔ سامنے دو صندوق ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہیں۔ صندوق کے اوپر صغرا بی بی نے پرانا کھیس ڈال رکھا ہے۔ کونے میں ایک ٹوکرا الٹا رکھا ہے جس کے اندر دو مرغیاں بند ہیں۔ دیوار میں دو سلاخیں ٹھونک کر اوپر لکڑی کا تختہ رکھ دیا ہے۔ اس تختے پر صغرا بی بی نے اپنے ہاتھ سے اخبار کے کاغذ کاٹ کر سجائے ہیں اور تین گلاس اور چار تھالیاں ٹکا دی ہیں۔ اندر بھی ایک چار پائی بچھی ہے۔ اس چارپائی پر صغرا بی بی کے دو بچے سو رہے ہیں۔ دو بچے اسکول پڑھنے گئے ہیں۔ صغرا بی بی بڑی گھریلو عورت ہے بالکل آئیڈیل قسم کی مشرقی عورت۔ خاوند مہینے کی آخری تاریخوں میں پٹائی کرتا ہے تو رات کو اُس کو مٹھیاں بھرتی ہے۔ وہ لات مارتا ہے تو صغرا بی بی اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے کہیں خاوند کے پاؤں کو چوٹ نہ آ جائے۔ کتنی آئیڈیل عورت ہے یہ صغرا بی بی --- یقیناً ایسی ہی عورتوں کے سر کے اوپر دوزخ اور پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ خاوند ڈاکیہ ہے۔ ساٹھ روپے کی کثیر رقم ہر مہینے کی پہلی کو لاتا ہے۔ پانچ روپے کوٹھڑی کا کرایہ، پانچ روپے دونوں بچوں کے اسکول کی فیس، بیس روپے دودھ والے کے اور تیس روپے مہینے بھر کے راشن پانی کے --- باقی جو پیسے بچتے ہیں ان میں یہ لوگ بڑے مزے سے گزر بسر کرتے ہیں۔ کبھی کبھی صغرا بی بی ساڑھے تین روپے والی کلاس میں بیٹھ کر فلم بھی دیکھ آتی ہے اور اگر پکچر بور ہو تو انٹرول میں ہی اُٹھ کر لمبی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر آ جاتی ہے۔ بک سٹال والا ہر مہینے انگریزی رسالہ "لک" اور "لائف" اُسے گھر پر ہی پہنچا دیتا ہے۔ وہ کھانے کے بعد میٹھی چیز ضرور کھاتی ہے۔ دودھ کی کریم میں ملے ہوئے انناس کے قتلے صغرا بی بی کو اور اُس کے ڈاکیے خاوند کو بہت پسند ہیں۔ کریم کو محفوظ رکھنے کے لئے انھوں نے اپنی کوٹھڑی کے اندر ایک ریفریجریٹر بھی لا کر رکھا ہوا ہے۔ صغرا بی بی کا خیال ہے کہ وہ اگلی تنخواہ پر کوٹھڑی کو ائر کنڈیشنڈ کروا لے کیونکہ گرمی

حبس اور گندے نالے کی بدبو کی وجہ سے اُس کے سارے بچوں کے جسموں پر دانے نکل آتے ہیں اور وہ رات بھر انھیں اٹھ اٹھ کر پنکھا جھلتی رہتی ہے۔ صغرا بی بی نے ایک ریڈیو گرام کا آڈر بھی دے رکھا ہے۔

مائی گاڈ ووٹ اے لولی ہوم از دس
ہوم! سویٹ ہوم!

صغرا بی بی کا رنگ ہلدی کی طرح ہے اور ہلدی ٹی بی کے مرض میں بے حد مفید ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں ہیں۔ مہینے کے آخر میں جب اس کا خاوند اُسے پیٹتا ہے تو ان میں سے اکثر ٹوٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ اب وہ اس ہر ماہ کے مستقل خرچ سے بچنے کے لئے سونے کے موٹے کنگن بنوا رہی ہے۔ کم از کم وہ ٹوٹ تو نہیں سکیں گے۔ صغرا بی بی کے چاروں بچوں کا رنگ بھی زرد ہے اور ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے انھیں کیلشیم کے ٹیکے لگاؤ۔ ہر روز صبح مکھن، پھل، انڈے، گوشت اور سبزیاں دو۔ شام کو اگر یخنی کا ایک ایک پیالہ مل جائے تو بہت اچھا ہے اور ہاں انھیں جس قدر ممکن ہو گندے کمروں، بدبودار محلوں اور اندھیری کوٹھڑیوں سے دور رکھو۔ صغرا بی بی کا خیال ہے کہ وہ اگلی سے اگلی تنخواہ پر گلبرگ یا کینال پارک میں کسی جگہ ان بچوں کے لئے زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر وہاں ایک چھوٹا سا تین چار کمروں والا مکان بنوا لے گی۔ دو چھوٹے بچے ابھی سکول نہیں جاتے لیکن انشاء اللہ تعالےٰ وہ بھی ایک دن سکول جانا شروع کر دیں گے اور جو دو بچے مزید پیدا ہوں گے وہ بھی سکول ضرور جائیں گے۔ اب کی دفعہ وہ انھیں کانونٹ میں داخل کروانے کا ارادہ رکھتی ہے جہاں وہ ہر صبح خدا کے بیٹے کی دعا پڑھیں۔ صغرا بی بی کو ممی کہیں، فرفر انگریزی بولیں اور اردو فارسی پڑھ کر تیل بیچنے کی بجائے مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور اونچا مرتبہ اور لمبی کار اور چوڑے لان والی کوٹھی پائیں۔

کیلشیم کے ٹیکوں کا پورا سیٹ بیس روپے میں آتا ہے۔ یہ تو معمولی بات ہے۔ اب کی وہ اپنے خاوند سے کہے گی کہ ڈاک خانے سے پہلی تاریخ کو گھر آتے ہوئے دو سیٹ لیتے آئے۔ اپنی کوٹھڑی والا ریفریجریٹر اُس نے لال لال سیبوں، سرخ اناروں، موٹے انگوروں، مکھن کی ٹکیوں، تازہ انڈوں اور گوشت کے قتلوں سے بھر دیا ہے۔ بچے سارا مہینہ ڈٹ کے کھائیں گے اور موج اڑائیں گے۔ لیکن خدا کی دی ہوئی ہر نعمت کے ہوتے ہوئے

بھی صغرا بی بی کے رخسار کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ کمر میں مستقل درد رہتا ہے، چہرہ کمزور ہو کر پیلا پڑ گیا ہے، آنکھیں پھٹی پھٹی سی، ویران ویران سی رہتی ہیں۔ ان آنکھوں نے کیا دیکھ لیا ہے؟ اس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں۔ مگر اس کا جسم ڈھل گیا ہے اندر ہی اندر گھل گیا ہے۔ ہاتھ کی نسیں اُبھر آئی ہیں۔ کنگھی کرتے ہوئے ڈھیروں بال جھڑتے ہیں۔ ہاتھ پیر ہر وقت ٹھنڈے رہتے ہیں جس طرح ریفریجریٹر میں کریم پھل اور گوشت ٹھنڈا رہتا ہے۔

صغرا بی بی کی شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں اور خاوند نے اُسے صرف چار بچے عطا کئے ہیں۔ خدا اُسے سلامت رکھے ابھی اور بچے پیدا ہوں گے۔ ہر پہلی تاریخ کو اُس کے خاوند کو صغرا بی بی سے محبت ہو جاتی ہے۔ جب بیس روپے دودھ والا لے جاتا ہے تو محبت کے اس تاج محل کا ایک برج گرتا ہے۔ پانچ روپے کرایہ جاتا ہے تو دوسرا برج گرتا ہے۔ پھر بچوں کی فیس، کاپیاں، پنسلیں، کتابیں، راشن، دال، آٹا، نمک، مرچ، ہلدی اوپلے، کپڑا، پریشانی، تفکرات، وسوسے، ملال، اور ناامیدیاں اور یہ تاج محل گنبد سمیت زمین کے ساتھ آن لگتا ہے اور خاوند اپنی محبت کی پٹاری میں سے ڈنڈا نکال کر اپنی پہلی تاریخ کی محبوبہ کی پٹائی شروع کر دیتا ہے۔

ونڈر فل ہوم!

"ڈیڈی! آج آپ کاک نہیں لائے؟"

"او ممی! یہ جیلی گندی ہے اسے پھینک دیں۔"

"کم آن ڈارلنگ صغرا بی بی! آج الحمراء میں کلچرل شو دیکھیں۔ ڈانس، میوزک، اووٹ اے تھرل! ہنی! بس یہ وائیٹ ساڑھی خوب میچ کرے گی اور اس کے ساتھ بالوں میں سفید موتیئے کے پھولوں کا گجرا۔۔۔ مائی مائی! یو آر سویٹ مائی ڈارلنگ صغرا بی بی!

ندی کنارے یہ کاٹج کس قدر خوبصورت ہے۔ سرسبز لان، ترشی ہوئی گھاس، قطار میں لگے ہوئے پھولوں کے پودے۔۔۔ ایک ملازم غسل خانے میں لکس صابن سے کتے کو نہلا رہا ہے۔ اس کے بعد تولیے سے اُس کا جسم خشک کیا جائے گا۔ کنگھی پھیری جائے گی، گلے میں ایپرن باندھا جائے گا، اور اُسے دو آدمیوں کا کھانا کھلایا جائے گا اور پھر فورڈ کار میں بیٹھ کر مال روڈ کی سیر کروائی جائے گی۔ آج اگر گوتم بدھ زندہ ہوتا تو وہ جانوروں کے

ساتھ انسانوں کی اتنی شدید محبت کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتا۔ آج اُسے انسانی دکھوں اور مصیبتوں کو دیکھ کر محل چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ بلکہ وہ محل ہی میں اپنی بیوی بچے اور لونڈیوں کے ساتھ رہتا۔ کتوں کی ایک پوری فوج رکھتا، شام کو کلب میں جا کر دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا، سینما دیکھتا اور بچوں کو ساتھ لے کر انہیں کار میں سیر کرواتا۔ اُس کے بچے رنگ دار قمیص اور جینز پہن کر گردن اکڑا کر، چھوٹی سی چھاتی پھلا کر، پتلی سی کمر مٹکا کر، کالج والے بس سٹاپوں، اعلیٰ ہوٹلوں اور ناچ گھروں کے چکر لگاتے۔ وہ رات کو ایک بجے سوتے اور صبح منہ اندھیرے گیارہ بجے اُٹھتے اور دانت صاف کئے بغیر چائے پیتے، اخبار میں فلموں کا پروگرام دیکھتے۔ گرمیاں کبھی مری اور کبھی سوئٹزرلینڈ میں بسر کرتے اور اپنے باپ کا نام روشن کرتے اور اُسے کبھی بال منڈوا کر شاہی لبادہ پھینک کر ننگے پاؤں نروان حاصل کرنے کے لئے جنگل کا رخ نہ کرنے دیتے۔

اُف! مائی گڈنس! لوہاری دروازے کی اس گندی گلی میں کس قدر حبس ہے۔ یہ لوگ کیسے چارپائی گندی نالیوں پر ڈال کر سو رہے ہیں۔ وٹ اے پٹی! مجھے ان لوگوں سے بڑی گہری ہمدردی ہے۔ میں ان کے تمام مسائل سے واقف ہوں۔ میں ہر ہفتے ان کی پھیکی اور بے رس زندگی پر ایک افسانہ لکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں ان لوگوں کی زندگی پر ایک پرمغز تحقیقی مقالہ لکھ کر سب مٹ کروا دوں۔ بڑا ونڈر فل سبجیکٹ ہے۔ ڈاکٹریٹ تو وہ پڑی ہے۔ جس طرح وہ کھری چارپائی پڑی ہے، جس پر تین پھنسیوں زدہ بچے اور ایک بچہ زدہ ماں سو رہی ہے۔ میں ناک پر رومال رکھے، پرنالوں سے اپنے اُجلے کپڑے بچاتا، ان لوگوں کا گہرا مطالعہ کرتا بدبودار گلی میں سے باہر نکل آتا ہوں۔

لاہور میں قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ لیکن اس ہوٹل کی فضا کس قدر خنک ہے ایئر کنڈیشننگ بھی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ آج ہوٹل میں بڑی رونق ہے۔ سایہ دار دھیمے قمقموں کی ملائم روشنی میں لوگوں کے چہرے کتنے خواب آور دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کہیں خواب ہی تو نہیں۔ میرا خواب۔۔۔ صغرا بی بی کا خواب، اُس کے ڈاکیے خاوند کا خواب! ہری اوم! وہ پونی ٹیل والی لڑکی کتنی پیاری ہے اور وہ بلیک ٹیشو کی چُست قمیص والی دوشیزہ جس کے بالوں میں ریل کے گجرے ہیں، کانوں میں زہریلے رنگ کے نگینے ہیں اور جس کا چہرہ باقاعدہ اور قوت بخش غذاؤں کے اثر سے کھانا کھانے والے چاندی کے چمچ کی

طرح چمک رہا ہے۔ اور وہ مرغن چہرے والی موٹی عورت جس کی آدھی آستینوں والی قمیض بازوؤں پر گوشت کے اندر دھنس گئی ہے اس عورت کا چہرہ موم کے بت کی طرح ہے، بے حس اور ٹھنڈا۔ اس کی گاڑی چودہ گز لمبی ہے اور غسل خانے کا فرش بارہ مربع گز ہے اس نے ریڈیو گرام جرمنی سے منگوایا ہے۔ قالین ایران سے، عطر فرانس سے، کیمرہ امریکہ سے خاوند پاکستان سے حاصل کیا ہے۔ جتنے پیسوں کا صغرا بی بی کے ہفتے بھر کا راشن آتا ہے اتنے پیسے یہ بیرے کو ٹپ کر دیتی ہے۔ اس کے بنگلے میں چار کتے اور سات بیرے رہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ چاندی کے کافی سیٹ میں کافی پیتی ہے۔ چاندی کے برتنوں میں بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ایک تو انھیں زنگ نہیں لگتا دوسرے وہ نان پوائزنس ہوتے ہیں۔ ایک سیٹ اپنے گھریلو استعمال کے لئے لوہاری دروازے کی گلی والے ڈاکیے کو بھی خرید لینا چاہیئے۔

یہ ہوٹل تو بالکل جنت ہے۔ ایک جوڑا سب سے الگ بیٹھا ہے۔ لڑکی دبلی پتلی سی ہے۔ چست کپڑوں نے اُسے اور دبلا بنا دیا ہے۔ بال ماتھے پر ہیں۔ ناخنوں پر ریڈ انڈین گلابی رنگ کا پالش چمک رہا ہے۔ اسی شیڈ کی لپ سٹک کی ہلکی سی تہہ پتلے پتلے ہونٹوں پر ہے۔ چہرے پر نسوانی نزاکت کے ساتھ ساتھ جذبات کا دھیما دھیما ہیجان سا ہے۔ کان اپنے ساتھی کی باتوں پر ہیں اور بے چین آنکھیں موقع ملنے پر ایک ایک میز کا جائزہ لے رہی ہیں۔ لڑکے کی گردن کالی بو اور ہارڈ کالر میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے ان کے سامنے کولڈ کافی کے گلاس ہیں۔

"روشی ڈارلنگ! میں پرومیس کرتا ہوں کل سے صنوشی کے ساتھ کوئی کنسرن نہیں رکھوں گا۔"

"شٹ اپ یو بگ لائر--- تم مجھ سے فلرٹ کر رہے ہو۔"

"فار گاڈ سیک ڈونٹ تھنک لائیک دیٹ--- آئی لو یو ڈارلنگ!"

"لائی--- جھوٹ، بالکل جھوٹ۔"

"میں یو کے سے واپس آتے ہی تم سے شادی کر لوں گا۔"

"تم وہاں شادی کر کے آؤ گے۔"

"نو--- نیور--- تم خود دیکھ لوگی۔ پھر ہم دونوں یو کے چلے جائیں گے۔ اور وہیں جا کر سیٹل ہو جائیں گے۔ میں اس گندے شہر سے بور ہو گیا ہوں--- بیرا!"

"یس سر۔"

"ایک کریم پف---"

"یس سر۔"

"وو ڈیو لائیک مور ڈارلنگ؟"

"نو تھینک یو---"

میں بھی سوچ رہا ہوں کہ یو کے جا کے سیٹل ہو جاؤں۔ میں بھی اپنی گندی گلیوں سے بور ہو گیا ہوں۔ شاید میں صغرا بی بی اور اس کی گلی میں کھڑی چارپائی پر ماں کے ساتھ سونے والے پھنسی زدہ بچوں کو بھی لیتا جاؤں۔

"بیرا--- تھری سکویش مور۔"

اوپر گیلری کو جانے والی سیڑھیوں کے پاس والی میز پر تین میڈیکل سٹوڈنٹ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ گفتگو برجی باردو کے کولہوں، اگاتھا کرسٹی کے ناولوں اور پکاڈلی کی پر اسرار گلیوں سے ہو کر میڈیکل پیشے پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔

"یار! میں تو فائینل سے نکل کر سیدھا لندن چلا جاؤں گا۔ یہاں کوئی فیوچر نہیں ہے۔"

"بالکل--- میں بھی وہیں جا کر پریکٹس کروں گا۔ برادر وہاں پیسہ بھی ہے اور مریض بھی بڑے پالشڈ ہوتے ہیں۔"

"یار میں تو یو کے جا کر کینسر ٹریٹ منٹ سپیشلائیز کروں گا۔ یہاں کینسر سپیشلسٹ کے بڑے چانسز ہیں۔ بیس روپے فیس رکھوں گا اور ایک سال بعد اپنا کریم کلر کی ففٹی ایٹ ماڈل شو ہو گی اور گلبرگ میں ایک کوٹھی---"

"بھئی یار تم نے ہل مین بیچ کیوں دی؟"

"چھکڑا ہو گئی تھی۔ آئل بڑا کھانے لگی تھی۔"

"شی!--- مس قریشی آ رہی ہے۔"

"صدیقی! تم نے اس کی بڑی بہن مسز ارشاد کو پرسوں گرفن میں دیکھا تھا؟ ارے بھئی: تم ساتھ ہی تو تھے۔ کیا کلاس ون عورت ہے۔"

"نو ڈاوٹ--- بالکل لولو بریجیڈا---"

سب لوگ پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ کوئی برجی باردو کے پاس، کوئی لولو بریجیڈا کے پاس، کسی کو بیوی لئے جا رہی ہے کوئی بیوی کو لئے جا رہا ہے۔ کسی کو پیسہ کھینچ رہا ہے اور کسی کو پالشڈ قسم کے مریض۔ ہم لوگ کہاں جائیں گے؟ میرا بھائی ڈاکیہ کہاں جائے گا؟ صغرا بی بی کہاں جائے گی؟ اس کے بیمار بچوں کا علاج کون کرے گا؟ مثانے کی بیماری میں نیم حکیم سے گردے کے درد کی دوا کھا جانے والے دیہاتی مریض کہاں جائیں گے۔؟ ان لوگوں کا علاج پاکستان میں کون کرے گا۔؟

کونے والی میز پر ایک پاکستانی آدمی امریکیوں کی طرح کندھے اُچکا کر اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے:

"بڑی پرابلم بن گئی ہے۔"

"کیسی پرابلم؟"

"بے بی نے تین سال لوئر کے جی میں لگائے ہیں۔ کراچی سے یہاں تبدیل ہو کر آ گیا ہوں۔ یہاں کسی انگریزی سکول میں داخلہ نہیں مل رہا۔ کارپوریشن کے سکول والے بے بی کو پھر سے دوسری جماعت میں لے رہے ہیں۔ کہتے ہیں بچے کو اردو نہیں آتی۔ بھئی وہ تو سوائے انگریزی کے اور کچھ بولتا ہی نہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں؟"

"اردو کو گولی مارو--- اب اُسے فرانسیسی پڑھاؤ گھر پر۔"

ہوٹل میں بڑی رونق ہو گئی ہے۔ یہ بڑی رومانٹک جگہ ہے اور گیلری تو بڑی پر سکون جگہ ہے۔ میں انشاء اللہ پرسوں اس گیلری میں بیٹھ کر لوہاری دروازے کی بوسیدہ گلی والی بیمار صغرا بی بی پر ایک کہانی ضرور لکھوں گا۔ پارکر کا قلم، کروکسلے کا پیڈ، کولڈ کافی کا گلاس، تھری کاسل کا سگریٹ، کاؤنٹر کے گلدان میں لگی یوکلپٹس کی پتیوں اور ہوٹل میں بیٹھی خوبصورت نازک عورتوں کے کپڑوں کی یورپی مہک اور صغرا بی بی کا ونڈر فل سبجیکٹ! ایسا افسانہ تو بس اسی جگہ بیٹھ کر لکھا جا سکتا ہے۔

میں گیلری میں بیٹھا جھانک کر نیچے دیکھتا ہوں۔ تین ہم شکل، ہم لباس لڑکیاں گردنیں اٹھائے سینہ تانے، آنکھوں میں مغرور چمک لئے ہوئے داخل ہو رہی ہیں۔ گردنیں موڑے بغیر آنکھیں اُٹھائے بغیر ہر شخص ان کا جائزہ لینے لگا ہے یہ دورِ شجاعت کے انگریزی ناولوں کی ہیروئنیں معلوم ہو رہی ہیں، جو کبھی پھولدار بیلوں سے نصف ڈھکی ہوئی بالکونیوں

میں کھڑے ہو کر چاندنی راتوں میں اپنے محبوب کا انتظار کیا کرتی تھیں اور نوکیلی رنگین چونچوں والے پرندوں کے پروں میں انتہائی جذبات، محبت نامے باندھ کر انہیں چوم کر فضا میں چھوڑ دیا کرتی تھیں۔ جو اپنے محبوب کی بے وفائی کا حال سن کر زہر کھا لیا کرتی تھیں۔ لیکن اس ایٹمی دور میں عشق، فورڈ کار کی چابی گھمانے سے سٹارٹ ہوتا ہے اور محبت نامے بنک کی چیک بک پر لکھے جاتے ہیں۔ اب یہ لڑکیاں محبوب کی بے وفائی کا سن کر زہر کھانے کی بجائے چکن سینڈوچز کھا کر رومال سے منہ پونچھتی ہیں اور دوسرے محبوب کی تلاش میں، دوسری کار کی تلاش میں، دوسرے کیرئیر کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ محبت کے جذبات آج کل اسپرو کی ایک ٹکیہ کھا کر غائب ہو جاتے ہیں اور عشق کا ہیجان فروٹ سالٹ کے ایک ہی چمچ سے بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ شادی زندگی کے کاؤنٹر پر مستقبل کا سودا ہے اور محبت شادی کی گاڑی کے پیچھے لٹکتا ہوا جوتا ہے۔

فضا میں ایئر کنڈیشنگ پلانٹ کی سونفی مہک کے ساتھ، باریک ریشمی کپڑوں کی لطیف سرسراہٹ، بجلی کی دھیمی روشنی میں روغنی چہروں کی جھلملاہٹ، چاندی کے سرپوش والی چٹنی مربہ کی شیشیوں کی چمک دمک اور مختلف قسم کے کھانوں کی خوشبوئیں گھل مل رہی ہیں۔ دھیمی دھیمی باتوں کی بھنبھناہٹ ہے۔ مسرت اندوزی کے منصوبے ہیں۔ خود اطمینانی کی ہلکی ہلکی ہنسی ہے، خود پرستی کی ادائیں ہیں۔ گہرے اسرار و رموز والی پُر اسرار نگاہیں ہیں اور خواب ہیں صحت مند دھلے دھلائے چہرے ہیں۔ رگڑ رگڑ کر داڑھی مونڈھے گال ہیں۔ گردن، کندھے اور نظروں کے غیر ملکی ٹکسال میں ڈھلے ڈھلائے اشارے ہیں۔ پھنسی پھنسائی گردنیں ہیں۔ گھٹی گھٹی باتیں ہیں۔ برجی باردو کے ہونٹ ہیں، لولو بریجیڈا کے بازو ہیں، ڈورس ڈے کے بال ہیں، امریکی ٹائیاں ہیں۔ فرانسیسی عطر ہیں۔ انگریزی جوتے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ، جرمنی، سیلون اور سنگاپور کی باتیں ہیں۔ کہیں چک 92۔ ایف کی دوپہر میں ہل چلاتا کاشتکار نہیں۔ کہیں حلوائی کی دوکان کے پھٹے پر بیٹھ کر پیا جانے والا لسی کا گلاس نہیں، کہیں دور افتادہ گاؤں میں غوثیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے والا اسی سالہ ڈاکٹر فرید نہیں، کہیں تاریک افریقہ کے جنگلوں میں انسانوں کی بھلائی کے لئے زندگی وقف کر دینے والا البرٹ شوئیٹزر نہیں۔ کہیں صغرا بی بی کے زرد گالوں اور کمر کی مستقل درد کے لئے کیلشیم نہیں۔ کہیں مشرقی پاکستان کے دریاؤں کے سیلاب سے برسرپیکار رہنے

والے ماہی گیر نہیں۔ وہ اُداس آنکھیں نہیں، وہ ناریل کے تیل لگے گھرے سیاہ بال نہیں، کہیں وہ پہلی کی پہلی، بیوی سے محبت کرنے والا اور مہینے کے اخیر میں اس کی پٹائی کرنے والا مفلوک الحال ڈاکیہ نہیں، کوئی سیل زدہ دیوار نہیں جس پر صرف تانبے کے چار گلاس اور تین تھالیاں لگی ہوں۔ کھیتوں کی کڑکتی دھوپ میں اپنی ہیر کی راہ دیکھنے والا کوئی رانجھا نہیں۔ سب ڈرائینگ روم لوورز ہیں، ٹھنڈی نشست گاہوں میں اناناس کے قتلے اور کولڈ کافی کا گلاس سامنے رکھ کر محبت کی سرد آہیں بھرنے والے عاشق ہیں۔ یوکلپٹس کی پتیوں کو فرنچ عطر کانوں پر لگا کر کہانیاں لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ قوم، مذہب، ملت اور سیاست کے نام پر اپنی گاڑیوں میں پٹرول ڈلوانے والے اور اپنی کوٹھیوں میں نئے کمرے بنوانے والے دردمندانِ قوم ہیں۔ عشرت انگیزی ہے، تصنع آمیزی ہے، زرپرستی ہے، خود پسندی ہے، جعلی سکے ہیں کہ ایک کے بعد بنتے چلے جا رہے ہیں۔ روشنی کے داغ ہیں کہ ایک کے بعد ایک ابھرتے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں صغرا بی بی کے بچوں کی پھنسیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ انھیں اس کے ڈاکئے خاوند کے تاج محل کی بربادی کا کوئی علم نہیں۔ انہیں کھری چارپائی پر گندے نالے کے پاس رات بسر کرنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دھان زمین میں اُگتا ہے یا درختوں پر لگتا ہے انھیں کوئی خبر نہیں۔ یہ اپنے ملک میں اجنبی ہیں۔ یہ اپنے گھر میں مسافر ہیں۔ یہ اپنوں میں بیگانے ہیں۔ چیک بک، پاسپورٹ، کار کی چابی، کوٹھی اور لائسنس --- یہی ان کی منزل ہے، یہی ان کا محور ہے، یہی ان کا مرکز ہے، یہی ان کا مذہب ہے اور یہی ان کا پاکستان ہے۔ یہ وہ باسی کھانے ہیں جن کی تازگی ریفریجریٹر بھی برقرار نہ رکھ سکا۔ یہ دو سورجوں کے درمیان کا پردہ ہیں۔ یہ کھلے ہوئے متبسم لبوں کے درمیان کی تاریک لکیر ہیں یہ اُس غار کے منہ پر تنا ہوا جالا ہیں جہاں چاند طلوع ہو رہا ہے---

اب رات آسمان کی راکھ میں سے تاروں کے انگارے کریدنے لگی ہے۔ لوہاری دروازے کی تنگ و تاریک گلی میں حبس ہے بدبو ہے، گرمی ہے، مچھر ہیں، پسینہ ہے، ٹوٹی پھوٹی کھری چارپائیوں کی بینگی ٹیڑھی قطاریں ہیں، نالیوں میں جمی ہوئی گندگی ہے۔ چارپائیوں سے نیچے لٹکتی ہوئی گلی کے فرش پر لگی ہوئی ٹانگیں ہیں۔ کمزور باسی چہرے ہیں پھٹے پھٹے ہونٹ ہیں۔ صغرا بی بی اپنے چاروں بچوں کو پنکھا جھل رہی ہے۔ کوٹھڑی میں حبس

کے مارے دم گھٹتا جا رہا ہے۔ گندے نالے والی کھڑکی میں گرم ایشیائی رات کے سبز چاند کی جگہ اُوپلوں کا ڈھیر پڑا سلگ رہا ہے۔ اس کا ڈاکیہ خاوند پاس ہی پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ پنکھا جھلتے جھلتے اب صغرا بی بی بھی اونگھنے لگی ہے۔ اب، پنکھا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا ہے۔ اب کمرے میں اندھیرا ہے، خاموشی ہے۔ چار بچوں کے درمیان سوئی ہوئی مٹی کی مونالیزا کے ہونٹ نیم وا ہیں۔ چہرہ کھنچ کر بھیانک ہو گیا ہے۔ آنکھوں کے حلقے گہرے ہو گئے ہیں اور رخساروں پر موت کی زردی چھا گئی ہے۔ اس پر کسی ایسے بوسیدہ مقبرے کا گمان ہو رہا ہے، جس کے گنبد میں دراڑیں پڑ گئی ہوں، جس کے تعویذ پر کوئی اگربتی نہ سلگتی ہو اور جس کے صحن میں کوئی پھول نہ کھلتا ہو۔

اور پل ٹوٹ گیا

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور گوتما ابھی تک نہیں آئی تھی۔

ریستوران، جس کی بالکونی میں بیٹھا میں اس کا انتظار کر رہا تھا، شہر کے بڑے باغ کے پچواڑے واقع تھا اور کسی پرانی خانقاہ کے مانند چیڑ، یوکلپٹس اور مولسری کے دراز قد درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ان خوبصورت لمبے لمبے درختوں کی نرم اور گہری سبز شاخوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنیں سونا بکھیر رہی تھیں۔ موسم بہار کے دن تھے اور باغ کی سمت سے آنے والی مدھم ہوا کے خنک جھونکے اپنے ساتھ پھولوں کی خوشبو بھی لا رہے تھے۔

پال، میں اور گوتما اسی بالکونی میں بیٹھ کر شام کی چائے پیا کرتے تھے۔ پال پر یہاں نظمیں نازل ہوا کرتی تھیں۔ یوکلپٹس کی جھکی جھکی ٹہنیوں والے درختوں پر اپنی سیاہ چمکیلی آنکھیں گاڑے وہ ان درختوں سے بھی زیادہ لمبی اور الجھی ہوئی کوئی نظم کہہ ڈالتا اور پھر ہمیں سنانے لگتا۔ گوتما کو پال کی نظموں سے زیادہ یوکلپٹس کے درختوں سے دلچسپی تھی۔ پال اپنی بھدی انگلیوں میں دو ماریٹر کا سگریٹ گھماتے، آنکھوں کو کبھی نیم وا، کبھی بند اور کبھی پوری طرح کھولے، نظم سنا رہا ہوتا تھا اور گوتما اپنی گھنی پلکوں والی بے داغ آنکھیں اٹھائے یوکلپٹس کی چمکیلی شاخوں میں چہچہانے والے رنگ برنگ پرندوں کو تک رہی ہوتی تھی، جیسے پال اسے ان پرندوں کی بابت کوئی انوکھی بات بتا رہا ہو۔

ریسٹوران کی فضا پرسکون اور خاموش تھی۔

بالکونی کے نیچے پلاٹ میں رنگین پھولوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف سنگین بنچ کے اوپر ناشپاتی کے درخت پر جا بجا سپید پھول چٹک رہے تھے۔ ایک کمسن بچہ بڑی خاموشی اور انہماک سے گھاس پر گرے پڑے پھولوں کو اٹھا اٹھا کر بنچ پر جمع کر رہا تھا۔

پانچ سال پہلے جب میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ قاہرہ جا رہا تھا تو پال نے آخری رات اسی جگہ ڈنر دیا تھا۔ اس شام گوتما تتلی کے پروں ایسی رنگیں ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اس کے نرم سیاہ بال بڑی خوبصورتی سے دو لٹوں میں گندھے ہوئے تھے اور بائیں کان کے اوپر چنبیلی کی تین کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں اس کے صندلیں جسم میں چکا چوند سی پیدا کر رہی تھیں۔ وہ ایک ایسا سنہری خواب معلوم ہو رہی تھی جو شروع رات کی ادھ پکی نیند میں دیکھا گیا ہو۔ پال بڑی مشکل سے نیلی سرج کے سوٹ میں ٹھسا ہوا تھا اور کئی بار کرسی پر پہلو

بدل چکا تھا۔ وہ کولڈ بیف کے ساتھ گرین کمل کے ہلکے گھونٹ چڑھا رہا تھا اور سگریٹ کے ساتھ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ڈنر اس نے اپنے اعزاز میں دیا ہو۔

ہمارے سروں پر ناشپاتی کی نازک ٹہنیاں اسی طرح سپید پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔

اگلے روز میری روانگی تھی۔ پال اور گوتما مجھے رخصت کرنے آئے۔ گاڑی چلنے لگی۔ پال نے سگریٹ ایک طرف پھینک کر کہا:

"میرا مصری سگریٹ کیس مت بھولنا"

اور گوتما کی سوگوار آنکھوں نے کہا:

"مجھے مت بھولنا۔"

اور میں نے کہا: "میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا"۔ اور گاڑی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔

میں آج واپس آ گیا ہوں۔ پانچ سال قاہرہ، یروشلم اور تہران میں گزار کر، اور میں نے اپنی آمد کی کسی کو اطلاع نہیں دی اور اس دوران میں، میں نے گوتما کو ایک پل کے لیئے بھی نہیں بھلایا۔ اس کی یاد ایک سدابہار درخت بن کر میرے دل کے چشمے پر ہر لحظہ، ہر لمحہ اپنی پرسکوں چھاؤں کیئے رہی، اور اب بھی میں اسی پرسکوں چھاؤں میں چشمے کنارے بیٹھا گوتما کا منتظر ہوں اور وہ ابھی تک نہیں آئی۔

باغ کے اس حصے کی طرف سے، جہاں آم اور جامن کے درختوں کے گھنے ذخیرے تھے، مرطوب ہوا کے نرم جھونکے آ رہے تھے جو تلخ کافی کا ایک پیالہ پینے کے بعد گرم جسم کو محبت سے تھپتھپا رہے تھے۔ مجھے گوتما کو اپنی آمد کی ضرور خبر کر دینی چاہیئے تھی۔ پال سے تو خیر نپٹ لوں گا لیکن گوتما --- گوتما سے کیا کہوں گا۔ اس نے تو کہا تھا وہ مجھے لینے بندرگاہ پر آئے گی۔

مگر دو سال سے اس نے خط کیوں بند کر رکھے تھے؟ میں اس سے ناراض ہی رہوں گا۔

اس کے خطوط کس قدر مسحور کن ہوتے تھے! اس کے الفاظ شبنم کے بے داغ موتی تھے جو پچھلی رات، جب دنیا سو رہی ہوتی ہے، پھولوں بھری ڈالوں سے ڈھلک ڈھلک کر بے معلوم آواز میں سبزے پر گرتے رہتے ہیں۔

------ ڈاکٹر، تم مجھے یادوں کے گھنے جنگل میں چھوڑ گئے ہو، جہاں تمہاری ہر بات، ہر قہقہہ ایک مستقل گونج بن کر پھیل گیا ہو اور میں اس جنگل میں تنہا پھر رہی ہوں۔

----- تمہارے بغیر زندگی کے لحات پژمردہ پتیوں کی مانند درختوں سے رک رک کر گر رہے ہیں ---- جب بیتے دنوں کا خیال آتا ہے تو سوچتی ہوں، دن کیوں گزر جاتے ہیں؟ اور اگر ان کو گزر ہی جانا ہے تو تم قاہرہ کیوں چلے گئے؟ خدا کی قسم اگر تم میرے پاس ہو تو پھر ساری زندگی چاہے ایک دن میں گزر جائے، میں افسوس نہ کروں گی۔

اور میں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع تک نہیں دی ---- پانچ سال کی لمبی جدائی کے بعد جب وہ اچانک مجھے یہاں بیٹھے دیکھے گی تو اس کے جذبات کی کیا کیفیت ہو گی؟ شاید وہ مجھے بالکل نہ پہچان سکے اور محض ایک اجنبی خیال کرتے ہوئے میرے پاس سے گزر جائے----- مگر ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ مجھے خود اس کی سمت بڑھنا ہو گا---- ہاں میں خود اٹھوں گا اور اس کی نرم انگلیاں؟ اپنے گرم ہاتھوں میں تھام لوں گا---- میرے خدا----- گوتما پر شاید شادیء مرگ طاری ہو جائے اور اس کے منہ سے دبی ہوئی چیخ بھی نکل جائے گی اور اس کے پتلے لبوں پر مہر سی لگ جائے گی اور جب یہ حیرت اور شادی مرگ کے بادل چھٹ جائیں گے تو گوتما کا دل آویز چہرہ مسرت سے سرخ ہو جائے گا اور اس کے جذبات نیلے آسمان پر چمکیلی دھوپ میں پرواز کرنے والے سپید براق کبوتروں کی مانند مسرور اور ہلکے پھلکے ہو جائیں گے اور پال مجھے اپنے بھدے جسم سے لپٹا لے گا اور کہے گا:

"میرا مصری سگریٹ کیس"؟

میں نے مصری سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگا کر شام کے آخری ---- پرسکوں اور افسردگی میں شرابور لمحات میں ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

باغ میں اندھیرا بڑھ رہا تھا اور ہوا زیادہ مرطوب تھی اور زیادہ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ بالکونی کے نیچے پلاٹ میں ناشپاتی کے پھول اپنی ٹہنیوں پر سو گئے تھے۔ میرے اردگرد' تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچھ لوگ بڑی توجہ اور انہماک سے چائے' کافی اور ٹھنڈی چیزیں پی رہے تھے۔ نچلی منزل کے ہال میں لوگوں کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں بھنبھناہٹ سی پیدا کر رہی تھیں۔ میرے سامنے یوکلپٹس کی جھکی ہوئی ٹہنیوں اور چیڑ کے نوکیلے جھومروں کے عقب میں' نیلے آسمان پر رات کا اولین زرد ستارہ چمکنے لگا تھا اور پرندوں کی ٹولیاں شہر کی طرف سے آم اور جامن کے گھنے ذخیروں کی سمت لوٹ رہی تھیں۔

اس روز بھی رات کا اولین ستارہ چیڑ اور یوکلپٹس کے پیچھے نمودار ہوا ہی تھا اور میں اسی طرح سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا کہ گوتما پہلی بار اس ریستوان میں داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ اس کی چھوٹی بہن تھی جس نے یاسمین کے نازک پھولوں سے بھری ہوئی بید کی چھوٹی سی ٹوکری بازو میں لے رکھی تھی۔

خاموشی اور اطمینان سے بالکونی کے آخری حصے میں بیٹھ کر انہوں نے چائے پی اور اسی انداز میں ریستوران سے نکل کر باغ کی طرف چلی گئیں۔

تین دن بعد میں نے اسے پھر دیکھا۔ اس روز اس کے ہمراہ ایک بوڑھا سا آدمی بھی تھا جو بھورے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس چھڑی ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

مولسری کے درختوں والی پرانی سڑک پر سے ہوتے ہوئے یہ لوگ دوسری طرف گھوم گئے۔

دو روز بعد اتوار تھا اور اتوار کی شام کو گوتما پھر آئی ---- اب وہ ہر دوسرے تیسرے شام کو کبھی اکیلی اور کبھی اپنی چھوٹی بہن کے ہمراہ ریستوران آتی اور چائے وغیرہ پی کر واپس چلی جاتی۔

پال اور میں ریستوران میں قریب قریب ہر روز آتے تھے اور اب ہم باغوں کے چکر بھی کاٹنے لگے تھے۔ پال گوتما کے لئے زیادہ بے چین تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی' خوبصورت لڑکی چاہتا تھا جو ریستوران میں اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے وغیرہ پئے اور پھر اس کی یوکلپٹس کے درختوں جتنی لمبی اور ہر دوسرے تیسرے مصرعے پر پھیلتی اور سکڑتی نظمیں سن کر اسے داد بھی دیا کرے۔ وہ گوتما کو منتخب کر چکا تھا۔ اور ایک شام گوتما کو پال کے ساتھ اپنی میز کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔

"آپ سے ملئے"-----

پال نے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا اور ہم خاموشی سے بیٹھ گئے--- گوتما کے ہمارے پاس بیٹھتے ہی ہمیں ایک بڑی ہی خنک اور لطیف خوشبو نے گھیر لیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے گوتما ہر قسم کے پھولوں سے لدی ہوئی سیج پر سے اٹھ کر آ رہی ہے۔ اس کا لباس بھی تقریباً سپید اور نرم تھا اور وہ پھولوں کا ڈھیر سا معلوم ہو رہی تھی۔

پال کئی قسم کی میٹھی اور نمکین چیزوں کا آرڈر دے کر' سگریٹ سلگائے' آنکھیں جھپکا جھپکا کر گوتما سے نہ معلوم کس موضوع پر مصروف گفتگو تھا اور میں کبھی یوکلپٹس کی نرم اور شرمیلی ٹہنیوں کو دیکھ رہا تھا اور کبھی گوتما کی آنکھوں پر جھکی ہوئی جھالروں ایسی پلکوں کو۔

گوتما کی آواز تازہ اور مدھم تھی۔ بولتے ہوئے اس کا نچلا ہونٹ قدرے سکڑ سا جاتا تھا۔ آنکھوں پر پلکوں کی جھالریں کئی بار جھک جھک جاتی تھیں۔ گوتما کا لہجہ اس کی آواز سے زیادہ پراسرار اور مقدس تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہم سے گفتگو نہیں کر رہی بلکہ دبی زبان میں ہمیں کوئی آسمانی پیغام سنا رہی ہے جو اسے خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

اور جب وہ ہم سے رخصت ہو کر ریستوران سے باہر نکل گئی تو پال نے ایک کیک منہ میں ڈال کر ٹھنڈی چائے کا گھونٹ چڑھایا اور سگریٹ راکھدان میں مسل دیا۔ اس نے دونوں ٹانگیں دوسری کرسی پر پھیلا دیں اور اپنی ایک ہونے والی نظم کا آخری مصرعہ گنگنانے لگا

اور الف لیلیٰ کی شہزادی مجھ سے کیا کہتی ہے؟

پال سے جدا ہو کر' باغات میں سے گزرتے ہوئے میں گوتما کے متعلق سوچ رہا تھا اور مجھے کچھ اس قسم کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں کسی پرانے معبد کے زمین دوز سرد خانے میں کھڑا ہوں

اور میرے سامنے سنگین فرش پر سیاہ آنکھوں اور زعفران میں ڈبوئی ہوئی نرم انگلیوں والی نیم عریاں دیوداسیوں کے رقصاں جسم عودوعنبر کی خوشبوؤں کی لہروں پر شعلوں کی مانند تھرک رہے ہیں۔ میں آگے بڑھ رہا تھا اور ہر قدم پر مجھے دودھیا گنبدوں، سنگین بارہ دریوں اور شفاف ندیوں والے باغات کے سنہری دروازے یکے بعد دیگرے کھلتے معلوم ہو رہے تھے۔ اور میں نے چاہا، گوتما میرے پاس ہو اور میں اسے کہوں:

گوتما --- تم گوتما نہیں گوتم بدھ ہو، مونا لیزا ہو، دیوی سائیکی ہو، بہار کا اولین پھول ہو، شام کا پہلا ستارہ ہو اور پیرس کی ایک شام ہو ------

---- دوسری ملاقات پر گوتما نے ہم دونوں کو اپنے بوڑھے باپ سے ملایا اور پھر ایک روز اس نے ہمیں اپنے گھر چائے پر آنے کی دعوت دے دی۔ اس روز پال کے سوٹ کا رنگ ہلکا فاختئی تھا اور چاکلیٹ رنگ کی چھوٹے چھوٹے بسنتی پھولوں والی ٹائی اسے بڑی سج رہی تھی۔

گوتما کا گھر، باغ کے جنوبی حصے کی طرف تھا۔ پتھریلی سلیٹوں کی ڈھلوانی چھت والا یہ گھر لکڑی کے تین چار کمروں میں بٹا ہوا تھا جو بڑی خوش سلیقگی سے سجائے ہوئے تھے۔ مکان کے سامنے چھوٹا سا باغ تھا جس میں گیندا اور اصلی گلاب اور گل داؤدی کی کیاریاں تھیں۔ ایک طرف اناروں کے چند درخت تھے جن میں سرخ سرخ کلیاں پھوٹ رہی تھیں۔ مکان کے پچھواڑے باورچی خانے کے باہر لیموں کے جھاڑوں میں سپید پھول کھلے ہوئے تھے۔

گلاب اور گل داؤدی کی کیاریوں کے درمیان نرم گھاس پر سبز میز کے گرد تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔ میز بالکل سادہ تھی اور اس پر کوئی میز پوش نہیں تھا۔ عین وسط میں گلاب کے پیازی پھولوں سے بھرا ہوا گلدان پڑا تھا۔ ایک طرف گوتما ہلکے قرمزی رنگ کی ساڑھی پہنے کتاب پڑھ رہی تھی اور دوسری طرف اس کا بوڑھا باپ اخبار پڑھ رہا تھا۔

باورچی خانے کے دودکش میں سے آہستہ آہستہ نیلے رنگ کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

ہمیں مکان کے احاطے میں داخل ہوتے دیکھ کر گوتما اور اس کا باپ اٹھ کھڑے ہوئے۔

گوتما کا صندلیں رنگ اس شام بے حد نکھرا ہوا تھا اور نرم ہوا کے مرطوب جھونکے اس کے سیاہ بالوں سے کھیل رہے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا اور آخری دھوپ کا سنہری غبار ہمارے اردگرد پھیل رہا تھا جس کی ملائم چمک میں پھولوں کی کیاریاں، گہری سبز گھاس، درختوں چمکیلی پھنگیں اور گوتما کی نکھری ہوئی بے داغ آنکھیں اور نیلا آسمان اور پال کی بسنتی پھولوں والی ٹائی اپنے معمول سے بڑھ چڑھ کر دلکش اور مہربان محسوس ہو رہی تھیں۔

گوتما کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکے نرم اور خوشبودار تھے۔

چائے ہم نے پلاٹ میں ہی پی۔ چائے کے بعد پال حسب عادت پتلون کی جیب سے خاکی

رومال نکالنے کے لئے اٹھا۔ رومال نکالا اور بیٹھا---- اور منہ پونچھا اور گوتما کے باپ سے جرمن ادب پر پچھلی جنگ کے اثرات پر گفتگو کرنے لگا ---- بوڑھا جرمن ادب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر بھی وہ مجبوراً پال کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کر رہا تھا۔ گوتما کبھی ان دونوں کو دیکھتی اور کبھی میری طرف دیکھ کر زیرلب مسکرا دیتی۔ اس کے خیال میں اس کا باپ سیدھا سادہ اور شریف آدمی تھا جسے سوائے اخبار بینی اور اپنی بچیوں کی دنیا کے کسی اور شے سے دلچسپی نہیں تھی۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر پال نے اپنی یوکلپٹس کے درختوں ایسی کوئی نظم شروع کر دی تو کہیں بوڑھا اسے روک نہ دے۔ کیونکہ میں نے بوڑھے کو کسی وقت بھی یوکلپٹس کے درختوں کی طرف دلچسپی سے تکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ پال کی نظر یوکلپٹس پر نہیں گئی اور وہ دکی بام اور ایشرووڈ کے ادبی محرکات میں ہی بوڑھے کو گھماتا رہا۔

گوتما کی چھوٹی بہن اندر سے اپنی تصویروں والی کتاب لے آئی اور مجھے اور گوتما کو رنگ برنگی تتلیوں، چڑیوں، ریل گاڑیوں، جہازوں اور مچھلیوں کی تصویریں دکھانے لگی۔ باورچی خانے کی طرف سے لیموں کے پھولوں کی ترش خوشبو آ رہی تھی۔

گوتما نے ایک دو دفعہ بڑی افسردہ نگاہوں سے مجھے اور پھر پال کو دیکھا جو اس کے باپ سے جبڑے ہلا ہلا کر گفتگو کرنے میں مصروف تھا۔ میں گوتما کی ان نگاہوں کو بالکل نہ سمجھ سکا۔

جب ہم وہاں سے اٹھ کر باہر سڑک پر آ گئے تو پال زور سے چھینکا۔ اس نے سگریٹ ایک طرف پھینک دیا اور ایک جگہ دیوار کے ساتھ لگ کر پیشاب کرنے لگا۔

'جرمن ادب پر پچھلی جنگ کے اثرات'

....

رستوران میں ہم ایک دوسرے کے قریب بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ باغات کی سایہ دار پرسکون روشوں پر ہمارے بلند قہقہوں کی تیز آوازیں کئی راہگیروں کو چونکا دیتیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گوتما اور میرے درمیان سات رنگوں والی قوس قزح کا ایک آسمانی پل تیار ہو رہا ہے اور ہم اس پل کی رنگین شاہراہ پر خواب ایسی کیفیت میں ایک دوسرے کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ آگے ---- آگے ---- اور آگے۔

پال ہر بار کوئی نہ کوئی نظم پیش کر دیتا اور گوتما اسے دلچسپی کے ساتھ سنتی اور پھر پال سے اس کا مطلب سمجھتی اور پھر اپنی رائے کا اظہار کر دیتی۔ مگر کچھ عرصہ بعد گوتما نے چیڑ اور یوکلپٹس کے چھریرے درختوں کو تکنا شروع کر دیا۔ پال اپنی نظم سنا رہا ہے اور گوتما بے معنی انداز میں پراسرار ٹہنیوں اور نوکیلے جھومروں والے درختوں کو تک رہی ہے۔

چیڑ اور یوکلپٹس کے خاموش اور بے زبان درخت -----

اور گوتما ان درختوں کی مانند خاموش اور بے زبان ہوتی گئی اور پال اس کی خاموشی سے چڑنے لگا۔

وہ مسلسل بولے جاتا اور گوتما اپنے مخملیں رخسار ہتھیلی پر رکھے گہری سیاہ اور شفاف آنکھوں پر گھنی پلکوں کا سایہ کئے بت سی بنی درختوں کے اوپر' نیلے آسمان پر پرندوں کی اپنے رین بسیروں کی طرف لوٹتی ٹولیوں کو گھورتی رہتی۔ اس کی خاموشی ایک دھندلے رنگ کا افسردہ بادل بن کر ریستوران اور پھر باغ اور پھر کائنات پر چھا جاتی اور گوتما کی کتابی پیشانی پر کسی ان جانے غم کی بے معلوم تحریریں ڈوبنے ابھرنے لگتیں۔

چائے کی سبز پیالی پر جھکے جھکے' سگریٹ کا دھواں اپنے نتھنوں سے چھوڑتے' پال کئی بار اپنی ہونے والی نظم کا آخری مصرعہ گنگناتا۔

اور الف لیلیٰ کی شہزادی مجھ سے کیا کہتی ہے۔

لیکن الف لیلیٰ کی شہزادی کسی سے کچھ نہ کہتی ----- اور بت بنی بیٹھی رہتی اور اس کی یہ بے زبان خاموشی ایک پراسرار سوال بنکر لنگر کی مانند میری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی۔

میں خاموش کیوں ہوں گوتما؟

....

ہم بالکونی میں تنہا تھے۔ گوتما مسکرائی ---- اس کی مسکراہٹ غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری کرن کی مانند غمگین' افسردہ اور ملول تھی' صبح دم بجھتے دیئے کی الوداعی چمک تھی۔ جس نے پل بھر کے لئے گوتما کے چہرے پر پھیل کر اس کی خاموشیوں کے سایوں کو تاریک تر بنا دیا۔

اور پھر وہی سوال --- پھر وہی لنگر----

گوتما تم کیا سوچتی رہتی ہو؟

گوتما نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور پھر گردن جھکائی اور مغربی درختوں کے پیچھے سورج افق کے لالہ زاروں میں ڈوب گیا۔

گوتما' میں چاہتا ہوں ہم اسی طرح ایک دوسرے کے سائے میں زندگی گزار دیں۔

کیا تم بھی یہی چاہتی ہو؟---- یہی چاہتی ہو ناں گوتما؟ -- بولو گوتما!

تم خاموش کیوں ہو؟ تمہاری خاموشی ننگی تلوار بن کر میرے سر پر لٹک رہی ہے۔ یہ کسی وقت بھی گر سکتی ہے گوتما۔ جواب دو ----- بولو!

اور گوتما کی پلکوں پر آنسوؤں کے ستارے ٹوٹنے لگے۔

"گوتما"؟ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا پھول ایسا چہرہ اوپر اٹھا لیا اور گوتما پھوٹ پڑی

اور جب الف لیلیٰ کی شہزادی نے بتایا وہ خاموش کیوں تھی۔ جب مونا لیزا نے کانپتے ہونٹوں اور مدھم آواز میں اس راز کو بے نقاب کر دیا جو ایک عرصے سے اس کے سینے پر سانپ بنکر لوٹ رہا تھا تو شام کا اولین نوخیز ستارہ ٹوٹ کر بجھ گیا اور پیرس کی شام' مصر کے کھنڈروں کی بھیانک رات میں بدل گئی اور مجھے گہری اور سنگلاخ چٹانوں کے اوپر تنا ہوا قوس قزح کا آسمانی پل ڈولتا اور فضا میں تحلیل ہوتا محسوس ہوا اور پل جھولتا گیا' ڈولتا گیا اور اس کے بند اکھڑنے لگے اور تختے چرچرانے لگے جیسے اس پر بے انداز بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ جیسے پال اپنا بھاری بھرکم جسم لیے اس پر اچھل رہا ہو' کود رہا ہو۔ اور گوتما کے نقوش ڈوبنے لگے اور پال کا بھدا جسم ابھرتا گیا' پھیلتا گیا اور پھیلتا گیا---

نہیں' نہیں--- یہ غلط ہے گوتما' بالکل غلط ہے۔

ڈاکٹر---- خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تم دونوں کو چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے محبت کا آنچل تم دونوں پر ایک ساتھ ڈالا ہے۔ توام بچوں کی مانند تمہاری محبت نے اس دل میں ایک ہی وقت جنم لیا ہے----- پال اور تم ---- تم اور پال' یہ ایک ہی ٹہنی کے دو پھول ہیں۔ جن پر میری محبت شبنم بن کر ایک ساتھ گری ہے۔ میرے دل کے معبد میں تم دونوں کی مورتیاں ہیں۔ تم میری ندی کے کنارے ہو اور میری محبت کے سنہری تیز رفتار پر ہو اور میری کشتی کے بادبان ہو اور میری عظیم الشان مسجد کے مینار ہو اور میں ایک پل کی مانند تم دونوں کے سہارے زندہ ہوں----- اور اگر میں مجرم ہوں' اگر میں نے کسی دیوتا کی توہین کی ہے تو للہ میری کھال نچوانے سے پیشتر مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اس وسیع دنیا میں کوئی ایسی عورت تلاش کر سکوں جس کے سینے میں ایک ساتھ دو شعلے بھڑک رہے ہوں۔ میں اسے اپنے ساتھ لاؤں گی اور تمہارے پاس بٹھلا کر اس سے یہ پوچھوں گی کہ وہ کونسی گھڑی تھی جب اس نے بیک وقت دو انسانوں میں اپنا دل بانٹ دیا تھا اور وہ کونسا دن ہو گا جب وہ ایک سے دامن چھڑا کر ہمیشہ کے لئے دوسرے کی ہو جائے گی؟ ڈاکٹر! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو مجھے دکھ ہو گا اگر تم اور پال ایک دوسرے سے بچھڑ جاؤ گے۔ یہ پل جو تم دونوں کے سہارے قائم ہے ٹوٹ جائے گا----- میری محبت کی بیل تم دونوں سے اپنی غذا کا میٹھا رس مہیا کرتی ہے اور پھر اس بیل کی سرسبز پتیاں مرجھا کر سوکھ جائیں گی ڈاکٹر----

اس پل کو' اس ہری بھری بیل کو' اس عظیم الشان مسجد کو' اس کشتی کو تمہاری ضرورت ہے' پال کی ضرورت ہے----

گوتما بولتی گئی' بولتی گئی۔ اس کے الفاظ جگنوؤں کی مانند شام کی دھندلی فضا میں جلتے رہے' بجھتے رہے اور اس کی آواز مدھم ہوتے ہوتے سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئی اور اس نے ہارے

ہوئے جواری کی طرح اپنا تھکا ہوا سر میرے شانے سے لگا دیا----- اور ہمارے اوپر، درختوں کی پر پیچ ٹہنیوں میں شام کا سوگوار ستارہ کانپنے لگا۔

میرے اچھے ڈاکٹر-----

گوتما کی آواز میں اترے ہوئے دریا کا سکون تھا۔ اس کی آنسوؤں سے دھلی ہوئی آنکھیں نیم سرخ اور چمکیلی تھیں جیسے ان کے عقب میں موم بتیاں روشن ہو گئی ہوں۔

مشرقی درختوں کے کناروں پر ملائم روشنی کا غبار سا پھیل گیا اور دوسرے لمحے گول اور سرخ چاند کا اترا ہوا چہرا ہمیں افسردگی سے دیکھنے لگا۔ گوتما ہولے سے مسکرائی اور اس کا سفید آویزہ جھلملا اٹھا اور شام کا ستارہ تیزی سے کانپنے لگا۔

"میں تمہیں ہمیشہ مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں گوتما"

"ہم ہمیشہ مسکرائیں گے ڈاکٹر----- ہمیشہ -----"

اور گوتما مسکراتی گئی اور میں بھی مسکرانے لگا اور قوس قزح کا پل ساکت ہو گیا اور اس کے آسمانی رنگ زیادہ تر اور زیادہ شوخ دکھائی دینے لگے اور میں اور گوتما بازو ہوا میں اٹھائے، اس نورانی دھنک میں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے گئے----- بڑھتے گئے اور وقت گزرتا گیا۔

گزرتا گیا۔

میں نے گھبرا کر وقت دیکھا۔

وقت کافی گزر چکا تھا۔ مگر گوتما ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں نے پھر سگرٹ سلگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ اب رات چھا رہی تھی اور ریستوران کے اندر اور باہر جا بجا بجلی کے لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ باغ کی طرف سے رات کی رانی کی میٹھی خوشبو آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی تیز سیٹی یا قہقہے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔

مجھے پال سے سخت گلہ تھا۔ کم بخت نے اتنی مدت میں ایک بھی خط نہیں لکھا اور اگر گوتما کے خط میں کچھ لکھوایا بھی تو وہی مصری سگریٹ کیس -----

مجھے دفعتاً یہاں دیکھ کر حیران تو وہ بھی خوب ہو گا۔ پہلے تو حسب عادت اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں کئی بار جھپکائے گا اور پھر ایک دم مجھ پر ٹر پڑے گا۔

"ارے تم؟"

اور میں اس سے پوچھوں گا "گوتما کہاں ہے؟" اور وہ کہے گا

"یہیں ہے۔ تم کہو میرا مصری سگریٹ -----"

اور میں اسے کہوں گا:

"وہ پہلے سے تو زیادہ خوبصورت ہو گئی ہو گی۔ اس کے چمکیلے سیاہ بال زیادہ لمبے ہو گئے ہوں گے اور اس کی آنکھیں ---- مگر پال وہ کہاں ہے؟"

اور پال کہے گا:

"ذرا دم لو کم بخت، چائے تو پی لینے دو۔"

اور وہ چائے کی پیالی پر جھک کر مصری سگریٹ کا دھواں اپنے نتھنوں سے خارج کرتے ہوئے کہے گا:

"الف لیلیٰ کی شہزادی مجھ سے کیا کہتی ہے؟"

اول الف لیلیٰ کی شہزادی کہے گی:

"تم نے اتنی دیر کیوں کر دی ڈاکٹر۔ تمہارے بغیر زندگی کے دن خشک پتوں کی طرح اپنی ٹہنیوں سے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے-----"

اور میں کہوں گا:

گوتما! ---- میری گوتما!! ان پتوں کا غم نہ کرو جو مرجھا چکے ہیں اور اپنی شاخوں سے ٹوٹ گئے ہیں۔ ان کونپلوں کو دیکھو جو نئی نویلی دلہن کی مانند شرما شرما کر پھر سے پھوٹ رہی ہیں--- یہ نوخیز، نرم، کنواری کونپلیں۔

اور میں مصری سگریٹ کا تیسرا کش لگا رہا تھا کہ دروازے میں پال نمودار ہوا۔ بھورے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ایک خوبصورت نوعمر بچے کو پکڑائے وہ گوتما کے باپ ایسی سنجیدگی اور پختگی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ پال میری سمت بڑھ رہا تھا اور بالکونی مجھے پیچھے کی طرف کھسکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آگے آ رہا تھا اور بالکونی پیچھے جا رہی تھی۔ پال رک گیا اور بالکونی بھی رک گئی اور وہ مجھے تکنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں پتھر کی مانند میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنی چھڑی کی طرح بے جان بت بنا کھڑا تھا۔ میں خود بخود اٹھا اور اس کے قریب گیا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ "گوتما کہاں ہے؟"

اس قدر آہستہ کہ میں خود اپنی آواز بمشکل سن سکا۔ لیکن پال نے گوتما کا نام سن لیا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی بے رنگ نگاہیں میرے ماتھے پر سرد ہوا کے تیز جھونکوں کا کام کر رہی تھیں۔ میں نے قریباً چیخ کر پوچھا:

"پال مجھے یوں مت دیکھو---- تم چپ کیوں ہو؟ گوتما کہاں ہے؟"

اور پال نے اس خوبصورت بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر، گوتما نے مجھ سے ......"

اور اس کے بعد میں کچھ نہ سن سکا۔ یہاں سماعت کی حد ختم ہو جاتی تھی اور تاریک خلاؤں میں سنسناتی ہوئی خوفناک خاموشیوں کا آغاز ہوتا تھا اور میں ان تاریک خلاؤں میں اترتا گیا اور زمین دوز معبدوں کے سرد خانوں میں گوتم بدھ' مونا لیزا اور سائکی کے مجسمے ایک ساتھ زمین پر اوندھے منہ آن گرے اور شام کا ستارہ ٹوٹ گیا اور پیرس کی شام بجھ گئی اور آسمانی دھنک کا پل اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ ڈولنے لگا' جھومنے لگا' جیسے اس پر بے انداز بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ جیسے پال اپنا بوجھل جسم لئے اس پر اچھل رہا ہو اور پال زور زور سے اچھلنے لگا اور پل کے تختے چرچرائے' اکھڑے------ اور پل ٹوٹ گیا۔